شبلی

خودنوشتوں میں



ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

شبلی

خودنوشتوں میں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شبلی

خودنوشتوں میں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

- کتاب : شبلی خودنوشتوں میں
- مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : مصنف
- طبع اول : نومبر ۲۰۱۸ء
- مطبع : اصیلہ پرنٹرس دہلی
- صفحات : ۳۱۲
- قیمت : Rs. 400/-

SHIBLI KHUDNAWISHTON MEIN

By DR. MOHD. ILYAS AZMI

Mob. +919838573645

Email : azmi408@gamil.com

ISBN: 978-81-938821-0-8

ملنے کے پتے

- دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی / بمبئی
- ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔ موبائل +919838573645

(تصویر: علامہ شبلی نعمانی)

علم دوست

خواجہ زاہد ندیم

کے نام

ترتیب

پیش لفظ

• پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کسی ایک مصنف کی زندگی اور تحریروں کے مطالعے کے لئے اپنی عمر وقف کردی ہو اوران کے مطالعات کا ثمرہ قابل قدر تصنیفات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہو۔اس صورت حال کے پیدا ہونے کے لئے اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ جس شخص کو اپنا موضوع بنایا گیا ہو اس کی تحریروں میں اتنا تنوع اور اتنی قوت ہو کہ وہ تا زیست مطالعے اور گہرے مطالعے کی متحمل ہو سکیں۔ پھر یہ بھی ایک شرط ہے کہ جس شخص نے ایسے کام کا بیڑا اٹھایا ہو، وہ خود صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہو اور اس کے مزاج میں اتنی استقامت بھی ہو کہ نا سازگار حالات میں بھی اس کی لگن کم نہ ہو۔

حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی۔ان کا زمانۂ تصنیف و تالیف و تدریس بھی نسبتاً بہت مختصر تھا، لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ صرف تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعے کی وسعت، تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو مل سکتا ہے، لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔

شبلی پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن سوانح کے نقطۂ نظر سے اور علمی مباحث کے نقطۂ نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ

شبلی میں گذار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب شبلی اور الیاس الاعظمی لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ الیاس الاعظمی نے اب تک شبلی پر بارہ کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں، اور ہر ایک میں شبلی کی علمی یا سوانحی زندگی کو کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ ان میں 'شبلی شناسی کے سو سال'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'نوادرات شبلی' اور 'متعلقات شبلی' کو خاص دلچسپی سے دیکھا گیا ہے۔

اب الیاس الاعظمی نے ایک بالکل نیا موضوع دریافت کیا ہے: شبلی کا ذکر خودنوشتوں میں۔ یہ موضوع کچھ ایسا غیر متعین سا ہے کہ اس کا نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انجام۔ پھر بھی، الیاس الاعظمی نے کم وبیش چوبیس ایسی خودنوشتیں تلاش کی ہیں جن میں شبلی کا ذکر کسی اہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ تعداد کم نہیں، بلکہ بڑی حد تک استعجاب انگیز ہے۔ اتنے بہت سے اہم لوگوں نے شبلی کا ذکر اپنی خودنوشت میں کیا، یہ امر بجائے خود شبلی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔

محمد الیاس الاعظمی نے حسب معمول دقت نظر سے کام لیا ہے اور شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مزید ترقی دے۔ شبلی کو الیاس الاعظمی جیسا جاں نثار زیب بھی دیتا ہے۔ **الھم زد فزد۔**

۱۳/ستمبر ۲۰۱۸ء

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد

دیباچہ

خودنوشتوں کے مطالعہ سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔علم وادب، تاریخ وسیاست اور تعلیم وتدریس سے وابستہ نہ جانے کتنے اشخاص کی خودنوشتیں زیرِ مطالعہ آئیں۔ان کے مطالعہ کے دوران متعدد خودنوشتوں میں علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء]، ان کی تصنیفات اور ان کے متنوع کارناموں کا ذکر ملا، بلکہ ان کی زندگی کے بعض فراموش شدہ واقعات بھی سامنے آئے۔ چنانچہ خیال پیدا ہوا کہ ان کے تعارف وتجزیہ پر ایک مقالہ لکھا جائے اور دکھایا جائے کہ ان میں علامہ شبلی کے کون کون سے پہلو پوشیدہ ہیں،لیکن جب کام کا آغاز کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ کا نہیں بلکہ مستقل کتاب کا موضوع ہے۔خوشی ہے کہ اب یہ مطالعہ وتجزیہ کتابی صورت میں شائع ہورہا ہے۔

راقم کی اس پیش کش کو شبلی شناسی کی ایک نئی جہت قرار دیا جانا چاہئے۔اس لئے کہ اب تک اس حیثیت سے علامہ شبلی کا مطالعہ نہیں کیا گیا کہ اہل علم اور ارباب نظر نے اپنی خودنوشتوں اور آپ بیتیوں میں انہیں کس طرح یاد کیا ہے، کن کن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے، ان پر اعتراضات کیا کیا ہیں اور وہ ان سے کیونکر متاثر ہوئے اور ان کے نزدیک عظمت شبلی کا راز کیا ہے۔ان اوراق میں انہی پہلوؤں کا مطالعہ وتجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

جن خودنوشتوں کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے ان کے مصنفین بھی ہماری علمی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ میں ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل اشخاص ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم [۱۸۵۸ - ۱۹۳۰ء]، نواب سید علی حسن خاں [۱۸٦٦ - ۱۹۳٦ء]، شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں [۱۸۷۴ - ۱۹٦۵ء]، مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸ - ۱۹۳۱ء]، مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸ -

۱۹۵۸ء]، ملا واحدی[۱۸۸۸-۱۹۷۶ء]،مولانا عبدالباری ندوی[۱۸۸۹-۱۹۷۶ء]،مولانا عبدالماجد دریابادی[۱۸۹۲-۱۹۷۷ء]، رشید احمد صدیقی[۱۸۹۴-۱۹۷۷ء]،مولانا سعید احمد اکبرآبادی[۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[۱۹۱۳-۱۹۹۹ء] وغیرہ کی تاریخ ساز شخصیت اوران کے عظیم الشان کارناموں سے دنیائے علم وادب بخوبی واقف ہے۔

اس کتاب میں جن کتابوں کے مطالعات شامل ہیں،ان کے مصنفین میں علامہ شبلی کے احباب بھی شامل ہیں اور معاصرین بھی۔ تلامذہ بھی شامل ہیں اور منتسبین بھی اور بعد کے متعدد متاثرین بھی۔ چونکہ یہ نامور شخصیات علم و ادب، دین و مذہب اور تاریخ و سیاست کے متنوع موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں،اس لئے علامہ شبلی کے ذکر میں بھی بڑا تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف عہد، مختلف انداز، مختلف اسلوب اور مختلف نوعیت کی ان تحریروں سے ذکر وفکر شبلی کا ایک نیا منظرنامہ سامنے آتا ہے۔

ان خودنوشتوں کا مطالعہ اس طرح کیا گیا ہے کہ مختصر تمہید کے ساتھ علامہ شبلی سے متعلق ان کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، پھر ان کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر کوئی تسامح ہوا ہے تو اس کی نشاندہی اور مستند حوالوں سے اس کی تصحیح و توضیح بھی کردی گئی ہے۔ تنقید اور تنقیص کے پہلوؤں کا معروضی انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ اگر سوانح شبلی میں کسی واقعہ کا اضافہ ہے تو اس کی بھی وضاحت کردی گئی ہے۔

اس کتاب میں ۲۴ رخودنوشتوں / آپ بیتیوں کا مطالعہ شامل ہے۔ اس میں بعض مفصل ہیں اور بعض مختصر، بیشتر مکمل ہیں اور چند نامکمل، سرگذشت از مولانا عبدالباری ندوی اور غبار کارواں از مولانا سعید احمد اکبرآبادی دراصل مختصر مضامین ہیں جو خودنوشت ہی کے زمرہ میں آتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب مصنفین کے سنہ پیدائش کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا آغاز نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کی خودنوشت ''اختر اقبال'' کے مطالعہ سے ہوا ہے جنہوں نے سیرت نبویؐ کے تمام مصارف کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی اور جن کے لئے علامہ شبلی نے یہ قطعہ کہا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

اس کے بعد علامہ شبلی نعمانی کے معاصر اور ان کے دور علی گڑھ کے بڑے واقف کار میر ولایت حسین [۱۸۶۲-۱۹۴۹ء] کی آپ بیتی میں ذکر شبلی کا مطالعہ ہے، حالانکہ ان کا تعلق علامہ شبلی کے ابتدائی دور یعنی علی گڑھ سے ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تذکرہ اور آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کا مطالعہ بھی بعد میں شامل ہے۔ شبلی و آزاد کے درمیان ذہنی و فکری بڑا گہرا رشتہ تھا اور جو آخر تک قائم رہا، یہ ایک مستقل مطالعہ کا موضوع ہے، تاہم ان کی خودنوشتوں کے مطالعہ سے بھی اس کا ایک مرقع سامنے آجاتا ہے۔

نواب سید علی حسن خاں علامہ شبلی کے خاص دوستوں میں تھے اور انہیں حکیم الامت خیال کرتے تھے۔ ان کی خودنوشت ''تذکرہ طاہر'' سے محبت آمیز تعلقات کے ساتھ بھوپال اور لکھنؤ کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے۔ اس کے ذکر سے اردو خودنوشتوں کی فہرست میں بھی اضافہ ہوگا، شاید پہلی بار اس کا ذکر کیا جارہا ہے۔ اس لئے کہ اردو خودنوشتوں کی جو مفصل فہرستیں مجلّہ دستاویز دہلی اور الایام کراچی میں شائع ہوئی ہیں ان میں اس کتاب کا نام شامل نہیں ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کو علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ ان سے بے حد متاثر تھے، اس پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں علامہ شبلی سے ان کے گوناگوں تعلقات و اثرات کا اندازہ ہوگا۔

خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی جو ۱۹۱۹ء میں پہلی بار حلقہ مشائخ دہلی سے شائع ہوئی، کئی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ ایک مختصر سے اقتباس کی وجہ سے اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔ کم

لوگوں کومعلوم ہوگا کہ خواجہ حسن نظامی جیسے صوفی منش بزرگ علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے۔علامہ ایک بار دہلی میں ایک ماہ ان کے مہمان رہے۔ وہاں ہر ہفتہ تقریر کرتے، جامع مسجد میں بھی ایک تقریر کی۔ اسی سفر میں خواجہ صاحب نے علامہ شبلی سے تصوف کے موضوع پر تقریر کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ انہوں نے نواب بڈھن میاں کی محل سرا واقع چتلی قبر دہلی میں نہایت بصیرت افروز تقریر کی، اس کی تفصیل بھی اس کتاب میں آ گئی ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالرزاق کان پوری [۱۸۶۲-۱۹۴۸ء] اور شیخ عبداللہ پاپا میاں کی خودنوشتوں میں علامہ شبلی کا ذکر کثرت سے ہے۔ شیخ عبداللہ اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار علامہ شبلی کے تلامذہ و منتسبین میں ہوتا ہے اور اسی نوعیت سے ان ارباب کمال نے ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کی خودنوشتوں سے علامہ شبلی کے قیام علی گڑھ اور لکھنؤ کے بعض گم شدہ اوراق کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ علامہ شبلی کے قیام ندوہ، طلبہ کی تعلیم وتربیت، ان کی ذہن سازی وغیرہ کے متعدد اہم واقعات مولانا عبدالباری ندوی نے قلم بند کئے ہیں، ان کی خودنوشت سے خدمات ندوہ کا ایک اہم مرقع سامنے آ جاتا ہے۔ مگر مولوی عبدالرزاق کان پوری علامہ شبلی معاصر تھے اور ان سے بھرپور استفادہ کے باوجود انہوں نے معاصرت کا پورا حق ادا کیا ہے، اس لئے ان کی تحریروں کے تجزیہ میں تحقیق وتنقید کے پہلو نسبتاً زیادہ آ گئے ہیں۔ البتہ مولانا ضیاء الحسن علوی [۱۸۹۱-۱۹۴۵ء] کی خودنوشت ''یاد ایام'' میں ایک شاگرد خاص کے اخلاص وعقیدت کے جلوے نمایاں ہیں۔ انہوں نے خود سے زیادہ اپنے محبوب استاذ کا ذکر کیا ہے۔ اس میں حیات شبلی سے ہٹ کر متعدد نئی معلومات شامل ہیں۔ سید ہمایوں مرزا [۱۸۷۰-۱۹۳۸ء] سے علامہ شبلی کے بڑے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے یہاں علامہ شبلی کا ایک ماہ قیام رہا۔ ان کی خودنوشت سے ان کے قیام حیدرآباد اور سررشتہ علوم وفنون کی نظامت کے زمانہ [۱۹۰۱-۱۹۰۴ء] کے بعض احوال اور انجمن ترقی اردو کے لئے ان کی کوششوں کا ذکر سامنے آتا ہے۔ ظفر حسن ایبک [۱۸۹۵-۱۹۸۹ء] کی خودنوشت خاطرات سے ترکی میں تصانیف شبلی کے تراجم اور ان کی مقبولیت کا پتہ ملتا

ہے۔''غبار کارواں'' اور ''نقوش زندگی'' میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی [۱۹۰۸-۱۹۸۵ء] اور حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] کے تاثرات بھی کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں ایک دیوبند کا ممتاز فرزند ہے تو دوسرا ندوے کا، مگر عظمت شبلی کے اعتراف میں دونوں کے تاثرات تقریباً ایک سے ہیں۔ حافظ نذر احمد [۱۹۱۹-۲۰۱۱ء] کا تعلق پاکستان سے ہے، انہوں نے لاہور میں شبلی کالج قائم کیا، علامہ شبلی سے ان کی محبت اور ان کی شبلی شناسی ان کے ذوق ونظر کا آئینہ ہے۔ ان کی خودنوشت ''سرگذشت ایام'' میں بعض بڑی معلومات افزا باتیں شامل ہیں۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی [پ: ۱۹۲۴ء] کا علی گڑھ کالج کی تاریخ میں علامہ شبلی کو سب سے ممتاز استاد اور مولانا محمد علی جوہر کو سب سے نامور طالب علم قرار دینا کم معنویت نہیں رکھتا۔ ان کی خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' سے ان کی شبلی سے خاندانی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر خودنوشتوں میں بھی علامہ شبلی کے کوکبہ جلال و جمال کے متعدد جلوے پوشیدہ ہیں جو شبلی کے قدردانوں کے لئے کشش کا باعث ہوں گے۔

آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے۔ اس میں مولانا محمد عمران خاں ندوی [۱۹۱۱-۱۹۸۶ء] کی مرتبہ کتاب ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' میں شامل اہل قلم کے مضامین سے شبلی اور تصانیف شبلی کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کی حیثیت بھی خودنوشت ہی کی ہے۔ اس میں جن اہل علم وادب کے مضامین شامل ہیں وہ بھی بڑی عظمت وشان کے لوگ ہیں بلکہ ان کا شمار علم و ادب کے سربرآوردہ اشخاص میں ہوتا ہے۔ انہوں نے شبلی اور تصانیف شبلی سے متاثر اور فیض یاب ہونے کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔

کتاب میں شامل خودنوشتوں کا اجمالی تعارف اور ان کے مصنفین کا تذکرہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ علامہ شبلی سے ان کے روابط اور فکری مؤثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے فکر وفن پر اگر اور بھی کچھ لکھا ہے تو اس کی تفصیلات بھی دیدی گئی ہیں۔ غرض موضوع کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم اپنی کم علمی اور کم مایگی کا بجا طور پر اعتراف ہے۔ کبھی کبھی قلم جادہ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے اور

مصنف کو احساس تک نہیں ہوتا۔ بہرحال میں مثبت تنقیدوں کا استقبال کروں گا۔

یہ کتاب میرے سلسلہ مطالعات شبلی کی بارہویں کڑی ہے۔ اس کی اشاعت سے میری تصنیفات، تالیفات، تراجم اور مرتبہ کتب کی تعداد چالیس ہو جائے گی۔ اس موقع پر پلٹ کر عمر رفتہ پر نظر ڈالتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں انتہائی مایوس کن حالات میں ثانوی تعلیم کے بعد کتابت سیکھنے دارالمصنّفین آیا تھا۔ اعجاز رقم سید اقبال احمد مرحوم [م: ۱۹۸۸ء] میرے استاد تھے، جنہیں اردو اکادمی نے خطاطی میں مہارت کے لئے انعام سے نوازا تھا۔ اس وقت سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] دارالمصنّفین کے ناظم، معارف کے مدیر اور دبستان شبلی کے سربراہ تھے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷ - ۲۰۰۸ء]، مولانا عبیداللہ کوثی، مولانا عمیر الصدیق ندوی، مولانا عارف عمری رفیق تھے۔ مولوی ابوعلی اثری [۱۹۰۳-۱۹۹۳ء] مصحح اور مولوی عبدالمبین ندوی ناظر کتب خانہ تھے۔ دفتر کے ذمہ دار ایم ایم زبیری تھے جو مزاحیہ شاعری کے لئے مشہور تھے۔ دارالمصنّفین کی فضا علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے ذکر وعمل سے معمور تھی۔ کتب خانہ میں تصنیف وتالیف کا کام ہوتا، پریس سے کتابیں چھپتیں، ماہ بہ ماہ معارف شائع ہوتا اور آئے دن علم وادب کے شیدائیوں کی آمدورفت سے دارالمصنّفین کی فضا پرشور رہتی، چنانچہ اس ادارہ کے علم پرور ماحول نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اسی ادارہ سے وابستہ رہا اور آج بھی بحیثیت اعزازی رفیق وابستہ ہوں۔ یہیں میرے ذوق کی نشوونما اور مضمون نگاری کا آغاز ہوا، یہیں تعلیم کے ساتھ مطالعہ اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم ہوا۔ اسی کی فضاؤں میں زندگی کے خواب بنے، کبھی کاتب سے پروف ریڈر بننے کی خواہش ہوئی جو بالآخر ناکامی پر منتج ہوئی، کبھی کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود رفیق بننے کی تمنا کی مگر اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔ ایم اے کے بعد ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی [۱۹۳۵-۲۰۰۵ء] صدر شعبہ اردو شبلی کالج کی زیرنگرانی اسی ادارہ پر مقالہ (دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات) لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی، جسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے شائع کیا۔ سچ یہ ہے کہ دارالمصنّفین ہی میری مادر علمی ہے اور اسی کی مطبوعات نے میرے ذوق علم وادب کی آبیاری کی، یہیں میری فکر ونظر کو جلا ملی اور یہ

بھی واقعہ ہے کہ میرا تمام تر سرمایہ علم ومعلومات علامہ شبلی، ان کے تلامذہ اور رفقائے دارالمصنّفین کی کتابوں کے مطالعہ کا مرہون منت ہے۔ پھر اسی ادارہ کی تاریخ اور اس کے رفقا ونظما اور اہل قلم کی خدمات پر کثرت سے مضامین لکھے جو ملک و بیرون ملک مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ بعدازاں ان کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ عظمت کے نشاں میرا پہلا مجموعہ مضامین تھا جس پر اردو اکادمی لکھنؤ نے مجھے انعام سے نوازا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی کتابیں میرے قلم سے نکلیں، تذکرۃ القراء، علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ، یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی وغیرہ کتابوں نے بڑی مقبولیت پائی۔ علمی، ادبی، تنقیدی اور سوانحی مضامین کے دو مجموعے ''مطالعات ومشاہدات''، اور ''عکس واثر'' کو بھی ارباب ذوق نے سراہا۔ اسی زمانہ میں مولانا ضیاء الدین احمد اصلاحی مرحوم کی خواہش پر علامہ شبلی کی دو کتابیں موازنہ انیس ودبیر اور اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر ایڈٹ کیں۔ مولانا مرحوم ان دونوں کتابوں کی تحقیق ومراجعت اور اشاعت کے لئے فکرمند تھے۔ مجھ سے ذکر کیا تو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس کام کے لئے آمادہ ہوگیا، اور جو کچھ بن سکا محنت سے کیا۔ موازنہ کے دیباچہ میں مولانا مرحوم نے یہ لکھ کر حوصلہ بڑھایا کہ:

> ''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو مولانا شبلی سے بڑی عقیدت اور دارالمصنّفین سے عشق ہے۔ ان کا خاص موضوع تحقیق یہی ہے اور وہ اس کے ہر کام میں پیش پیش رہتے ہیں، انہیں جب میری اس پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے بڑی خوشی سے تصحیح ومراجعت کی ذمہ داری قبول کر لی اور بڑی محنت و جاں فشانی سے یہ کام انجام دیا اور جہاں تک بن پڑا اشعار کی صحت کے لئے مصادر کھنگالے اور کاپیوں اور پروف کی تصحیح بھی دلچسپی سے کی۔ اس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔''

بعدازاں انہوں نے معارف میں مقالات لکھوائے، وفیات اور باب التقریظ کے تحت بھی تحریریں لکھوا کر شائع کیں، اب ان کی بیس سالہ سرپرستی، شفقت اور ان کی یادوں کی بارات

تڑپا دیتی ہے۔آہ!

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اسی زمانہ طالب علمی میں حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] نے والد مرحوم الحاج عبدالرزاق [۱۹۱۸-۱۹۹۶ء] سے دیرینہ تعلق کی بنا پر دست گیری کی اور ماہنامہ الرشاد کی ادارت کی ذمہ داری دے کر خود اعتمادی پیدا کی، انہوں نے میری کتابوں پر ایسے حوصلہ افزا تبصرے اور دیباچے لکھے کہ میں پھولے نہیں سماتا تھا، اب یہ سب یادیں اور باتیں خودنوشت کا حصہ ہوں گی۔

یہاں برادر مکرم مولانا عمیر الصدیق ندوی کا ذکر ضروری ہے۔جن کی بے پناہ محبت اور لطف و کرم کی میری ابتدائی تحریریں گواہ ہیں، ان سے مجھے بڑا حوصلہ ملا۔مولوی ابوعلی اثری مرحوم کے بعد وہ میرے مضامین و مقالات کی اصلاح بھی کرتے رہے۔اور سچ یہ ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

دارالمصنّفین کے ان ارباب کمال کے علاوہ ملک و بیرون ملک کے نامور اہل قلم نے میرے مضامین و مقالات اور کتابوں پر جن حوصلہ افزا آراء و خیالات کا اظہار کیا اس سے بڑا حوصلہ ملا، ان کی ایک جھلک ''محبت نامے'' میں دیکھی جاسکتی ہے، اس میں ایک اہم اور قابل ذکر نام پروفیسر خورشید نعمانی کا ہے جنہیں میں اپنا ادبی محسن خیال کرتا ہوں انہوں نے بھی بڑا حوصلہ دیا۔ بہرحال بزرگوں کی تحسین وستائش اور رہنمائی نے میرے اندر کچھ کر گذرنے کا عزم و حوصلہ بلکہ ولولہ پیدا کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں حوصلہ افزائیوں نے اس بے مایہ کے قلم میں اتنی توانائی پیدا کر دی کہ بانی دارالمصنّفین، حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کے حیات وافکار پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ قائم ہو گیا جسے میں اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دانائے راز کے پر پرواز تک پہونچنا اس مور ناتواں کے بس کی بات نہیں۔

بہرحال کاروان زندگی تیز گام ہوتا رہا، زندگی نشیب و فراز سے دوچار ہوتی رہی، سرد و گرم آوارہ ہواؤں کے تھپیڑوں نے کبھی کبھی زندگی اجیرن کر دی، مگر ہمیشہ راضی بہ رضا رہا اور صبر

وشکر کا دامن کبھی نہیں چھوٹا اور آج بھی پوری استقامت اور حوصلہ مندی کے ساتھ اسی راہ کا مسافر ہوں جہاں سے ۳۲ر سال پہلے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ میری پہلی کتاب بیس سال کی عمر میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی اور اب ۲۰۱۸ء میں چالیسویں کتاب پریس جارہی ہے، اس طرح گویا میری زندگی کے ۳۳ر سال علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں گذر گئے۔ ۵۲ر سال کی عمر میں کمزور صحت اور اسکول کی پیچیدہ ملازمت کے باوجود آج بھی قلم رواں دواں ہے۔ یقین ہے آئندہ بھی رہے گا۔ جب یاران تیز گام دولت وثروت اور عہدہ ومنصب کی تلاش میں سرگرداں ہورہے تھے میں نے اپنے لئے علم وتحقیق کی راہ منتخب کی۔ انہیں دنیا کے عیش وآرام ملے مگر مجھے کاغذ، قلم، کتاب۔ یہی میری دولت اور یہی میرا سرمایہ حیات ٹھہرے۔ آج بھی جب میری کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو میں خود کو خوش قسمت ترین انسان تصور کرنے لگتا ہوں اور دنیا کے سارے جلوے بے نور معلوم ہونے لگتے ہیں، ممکن ہے:

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہ بازی

کا طعنہ دیا جائے مگر میں علمی زندگی کو دنیا کی تمام زندگی پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں اسے کیا کہوں کہ جب لوگ بازار سے اپنے بچوں کے لئے کھلونے خریدتے ہیں، میں ردی کی دکانوں میں پرانی کتابیں تلاش کرتا ہوں اور جب لوگ سوتے ہیں میں کتابوں کے اوراق سے جی بہلاتا ہوں۔ بہرحال اب یہ عادتیں چھوٹنے سے رہیں اور اب میرے ساتھ ہی جائیں گی۔

کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

اس ذوق جنوں اور دل خوں کرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اس سے عشاق علم وادب ہی بہرہ مند ہوتے ہیں، یہ سب کا نصیبہ نہیں۔

میں نے جب شبلی شناسی کے میدان میں قدم رکھا اور علامہ شبلی کی تحریروں سے دل و دماغ آشنا ہوئے تو سب سے پہلے ان کے اسلوب نگارش نے اسیر کیا۔ الفاظ نہیں سونے کی ڈلیاں، جملے نہیں تراشے ہوئے ہیرے یا جڑے ہوئے نگینے، جو اثر حافظ کی غزلوں میں ہے وہ

ان کے تر شے ہوئے بے ساختہ جملوں میں سمٹ آیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ معجز بیانی اور فصاحت و بلاغت کے دلکش نمونے دامن دل کھینچ لیتے ہیں، حدتو یہ ہے کہ شعرالعجم کے تنقیدی مباحث تخلیق کا رتبہ حاصل کر گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کہیں پڑھئے، ادب ہو، تعلیم ہو، منطق ہو، فلسفہ ہو، کلام ہو، سیرت ہو، سوانح ہو، تنقید ہو ہر جگہ صاف شفاف، شیرین، پاکیزہ اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی نثر جو ذوق و وجدان میں سرور اور تازگی پیدا کردے اور بقول سرسید دلی والوں کو بھی رشک آئے۔ الفاروق میں فاروق اعظم کے سفر شام کا منظر اور سیرۃ النبیؐ میں ظہور قدسی کی عبارت پڑھ کر تو میں بار ہا وجد میں آیا۔ میں ہی کیا متعدد ارباب ذوق نے شبلی کی سحر آفرینی کا اعتراف کیا ہے۔

پھر ان کی تحقیقات اور مطالعے کی وسعت پر حیران ہوا، خدا جانے انہوں نے کیا کیا پڑھا تھا، کن کن علوم کو پی لیا تھا، باوجود اس کے ہندوستان کے کتب خانے ناکافی ثابت ہوئے اور مطالعہ و تحقیق کے لئے انہیں عالم اسلام کے کتب خانوں کی احتیاج ہوئی اور انہیں روم و مصر و شام کا سفر کرنا پڑا۔ ایسا وسیع و عمیق مطالعہ، ایسی بے نظیر علمی جستجو اور ایسی مصروف علمی زندگی، بلاشبہ اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

ناچیز ایم اے میں غالب، حالی اور اقبال کو پڑھ چکا تھا، غالب کی مشکل پسندی، حالی کی شرافت اور دردمندی اور اقبال کے ترانہ ملی کے سوز و گداز نے بلاشبہ بے حد متاثر کیا، مگر علامہ شبلی کی شخصیت، تصنیفات، ان کا تنوع، جدت، افادیت اور اثرات کے سوا دینی حمیت، اسلامی غیرت، اخلاص وللّٰہیت اور ان کے عشق نبویؐ کے جلوؤں نے تو میری دنیا ہی بدل دی۔ حیرت ہوتی ہے کہ محض ۵۷/سال کی عمر اور سیکڑوں کام اور ہزاروں تحقیقات، اور سب کا سب ملت مرحومہ کے لئے۔ الفاروق اور سیرۃ النبیؐ تو مقدس موضوعات تھے، شعرالعجم میں بھی انہیں اسلام کا ابر کرم نہیں بھولا۔ خدا جانے کون سا جذبہ تھا جس نے انہیں سراپا درد و محبت بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم سے الفاروق تک اور شعرالعجم سے سیرۃ النبیؐ تک کا سفر جذبہ ایمانی سے سرشاری کا سفر ہے۔ مستشرقین کے جوابات، ندوہ کا قیام، الندوہ کا اجرا وادارت، تحریک وقف علی الاولاد، تحریک اشاعت اسلام، تعطیل جمعہ کے لئے کوشش، شدھی تحریک کے سدباب کے لئے

فکرمندی، احرار کی قیادت، غیر معمولی کام ہیں اور غیر معمولی شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہاں پہونچ کر محسوس ہوا کہ وہ واقعی شمس العلماء تھے، تاریخ کے معلم اول تھے، یگانہ روزگار ادیب وانشا پرداز، نقاد اور شاعر تھے، مصنف نہیں رئیس المصنّفین تھے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے سیرت نگار تھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے باکمال شخص تھے اور حکیم الامت کہے جانے کے مستحق، مگر افسوس کہ ان کے آخری چند سال جس میں وہ تھے اور آستانہ نبوت تھا ان ناقدر شناس لوگوں کے درمیان گذرے جن کی نگاہیں عقل وخرد کی معرفت سے عاری تھیں اور جنہوں نے انہیں رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چنانچہ انہیں نوسال کی جاں کاہ جدوجہد کا ثمرہ یہ ملا کہ ندوہ سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کا انہیں بے حد صدمہ پہونچا تاہم سیرت کا کام جاری رکھا اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبرؐ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اس موڑ پر آکر مجھے ایسا لگا کہ بس یہیں ٹھہر جانا چاہئے، چنانچہ اپنی کم علمی اور کم مایگی کے باوجود یہیں ٹھہر گیا۔ اولاً علامہ کی شخصیت اور فکر ونظر پر مضامین لکھے جن کا مجموعہ ''متعلقات شبلی'' شائع ہوا۔ ''کتابیات شبلی'' پر کئی لوگوں نے خون دل جلایا تھا مگر میں نے اسے اپنے عہد [۲۰۱۱ء] تک پہونچایا، پھر علامہ کی ضخیم اور مبسوط سوانح عمری حیات شبلی کے دوسرے حصہ کی تکمیل کا عہد کیا اور چار سال کی جاں کاہ محنت کے بعد ''آثار شبلی'' وجود میں آئی۔ ان کے منتشر خطوط کی ''مکتوبات شبلی'' کی شکل میں شیرازہ بندی کی۔ تلاش وتفحص کے بعد شذرات ومراسلات مرتب کئے، جسے دارالمصنّفین نے اہتمام سے شائع کیا۔ جہان شبلی کی وسعت کے چند نمونے ''شبلی اور جہان شبلی'' میں پیش کئے۔ ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' لکھ کر شبلی شناسی کا ایک نیا منظر نامہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کیا۔ ''شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' جمع کر کے تعلیقات وحواشی کے ساتھ شائع

کئے۔شبلی صدی کے موقع پر''شبلی شناسی کے سوسال'' کانسبتاً ایک نیا مرقع انتہائی محنت سے تیار کیا جو بے حد مقبول ہوااور بہار اردو اکادمی نے اپنے اول انعام کا مستحق قرار دیا۔گذشتہ سال علامہ شبلی کی وہ تمام تحریریں جو قدردانان شبلی کی دسترس میں نہ تھیں انہیں''نوادرات شبلی'' کے نام سے ارباب ذوق کی خدمت میں ہدیہ کیا،جس کے ذکر سے اب تک ایوان علم وادب پرشور ہیں۔اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ نئی کتاب بھی ہے جو علامہ شبلی کی ایک سو چارویں برسی [۱۸رنومبر ۲۰۱۸ء] کے موقع پر بطور خراج عقیدت شائع کی جارہی ہے۔۲۰۱۸ء اس لحاظ سے بھی بڑا اہم اور انقلاب آفریں ہے کہ سو برس پہلے اسی سال سیرۃ النبی ﷺ شائع ہوئی تھی۔جس سے اردو میں سیرت نگاری کا عام رجحان پیدا ہوا۔

کتاب کی تکمیل پر سب سے پہلے میں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوں کہ اسی نے توفیق بخشی، رہبری اور رہنمائی کی اور اب اسی سے التجا ہے کہ اسے مفید بنائے اور حسن قبول کی دولت سے سرفراز کرے۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں برادر مکرم خواجہ زاہد ندیم صاحب کراچی کا شکریہ نہ ادا کروں، انہوں نے میرے لئے زحمت اٹھا کر بڑی قیمتی علمی وادبی کتابیں خرید کر ارسال کیں۔ان کی اس محبت کا میرے دل پر بڑا اثر ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے بچوں کو ترقیات سے نوازے۔یہ کتاب انہیں کی نذر ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

جب کوئی کتاب پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے تو حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔یہ دونوں بزرگ میرے علمی کاموں سے اس قدر خوش ہوتے تھے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔وہ اک دھوپ تھی جو انہیں آفتابوں کے ساتھ گئی۔اللہ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔

میں نے اس جان بہاراں کو بہت یاد کیا
جب کوئی پھول میری شاخ ہنر پر نکلا

آبروئے اردو گرامی مرتبت پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی محبت میرے لئے سرمایہ فخر و نازش ہے، جو مجھے برسوں سے حاصل ہے۔ انہوں نے اس کتاب پر پیش لفظ لکھ کر گویا مجھے ایک سند عطا کر دی ہے، میں ان کا بے حد ممنون ہوں، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔

عالی قدر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ڈائرکٹر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی دبستان شبلی کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے گذشتہ دس برسوں میں افکار شبلی کے فروغ واشاعت میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ اب ہماری تاریخ میں آب زر سے لکھا جائے گا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور سرپرستی مجھے اول دن سے حاصل رہی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی اور مولانا عمیر الصدیق ندوی کی ہمدردیاں میرا بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ جب میں علمی میدان میں افتاں وخیزاں رہ نوردشوق تھا، ان کرم فرماؤں کی محبت بھری نگاہ شوق سفر کوئی روشنی دے دیتی تھی۔ ان کی صحت وسلامتی اور طول عمر کی دعا کرتا ہوں۔ احباب میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، ڈاکٹر مشتاق اعظمی، ڈاکٹر شباب الدین، ڈاکٹر عطا خورشید، ڈاکٹر جمشید احمد ندوی اور ڈاکٹر عمیر منظر کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو میرا تعاون اپنا خوش گوار فریضہ خیال کرتے ہیں۔ برادرم ڈاکٹر شاہ نواز فیاض، برادرم مولوی عرفات اعجاز اور برادر عزیز محمد اسماعیل اصلاحی سلمہ نے بھی متعدد کاموں کو بخوشی انجام دیا۔ میں ان سب کے روشن مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔ میں اپنی زندگی شائستہ ریاض فلاحی اور بچوں عثمان وعلی اور عفت وعشرت کے روشن مستقبل کے لئے بھی دعا کرتا ہوں جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے ماحول سازگار رکھتے ہیں۔

کمپوزنگ حافظ عبدالرحمٰن عباسی قمر اور میری بیٹی عفت جہاں (ایم ایس سی) نے کی ہے۔ جاوید میاں صاحب مالک اصیلہ پرنٹرس دہلی نے خوب صورت طباعت سے کتاب کی زینت بڑھائی ہے۔ میں ان سب کا شکر گذار ہوں۔

ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر جو احباب اور ارباب نظر میری کتابوں کے منتظر رہتے ہیں، شوق کی نگاہوں سے پڑھتے اور تنقید وتبصرہ کرتے ہیں، میں ان دیدہ و نادیدہ کرم

فرماؤں کا بھی ممنون ہوں۔ ان کی محبت میں میرا کوئی دخل نہیں بلکہ دراصل وہ ان کی علم دوستی، قدر دانی اور علامہ شبلی کے فضل وکمال کی کشش ہے جو میرے حصہ میں آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ علامہ مرحوم کی قبر کو نور سے بھردے اور ان کا نور بصیرت عام کردے۔

محمد الیاس الاعظمی

۲۳ر ستمبر ۲۰۱۸ء ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

(تصویر: نواب سلطان جہاں بیگم)

[۱]

اختر اقبال

- نواب سلطان جہاں بیگم

[مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۴ء]

دنیا کی خواتین حکمرانوں میں بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۸ - ۱۹۳۰ء] فرماں روائے بھوپال کا نام بہت ممتاز ہے۔ وہ ایک بڑی بیدار مغز، اول العزم اور حوصلہ مند فرماں روا تھیں۔ خاتون ہونے کے باوجود انہوں نے جس طرح اپنی ریاست بھوپال کو بنایا، سنوارا، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ انہوں نے اپنے دور حکومت [۱۹۰۱-۱۹۲۶ء] میں رعایا کی مستعدی سے خبر گیری کی۔ تعلیمی ترقی، امن و امان اور خوش حالی سے ہم کنار کیا اور بھوپال کی تہذیب و تمدن، معاشرت اور معیشت وغیرہ کو بڑی وسعت دی۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ گذرنے کے باوجود انہیں اب تک یاد کیا جا رہا ہے۔

بیگم سلطان جہاں کا ایک بڑا کارنامہ علوم وفنون بالخصوص اسلامی علوم کی ترقی کے لئے کوشش و کاوش ہے۔ انہوں نے مذہبی علوم و اقدار کے تحفظ و بقا کے لئے مالی امدادیں فراہم کیں۔ علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دارالمصنّفین، انجمن ترقی اردو، ندوۃ العلما اور نہ جانے کتنے ادارے اور کتنی انجمنیں ان کے دم سے شاد و آباد رہیں۔

بیگم سلطان جہاں کو حکمرانی اور کشور کشائی کے ساتھ علم و مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ودیعت ہوا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ ایک بے نظیر حکمراں خاتون تھیں۔ متعدد اہل علم اور ارباب کمال کو دربار میں جمع کر کے علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کی خدمت تو

انجام دی ہی، نہ جانے کتنے ارباب کمال ان کے وظیفوں اور مالی امداد پر علمی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ خود ایک بڑی با کمال خاتون تھیں۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ وہ بڑی زیرک، ذی شعور اور ہوش مند اہل قلم تھیں۔ علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں ان سے ملے تو بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات کا حال انہوں نے الندوہ میں لکھا اور ان کے علم و فضل اور اسلامی علوم وفنون سے ان کی گہری واقفیت کا ذکر کیا اور لکھا کہ:

''مجھ کو حکمرانان اسلام میں سے متعدد رؤسا اور والیان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان سے گفتگو اور ہم کلامی کی بھی نوبت آئی ہے۔ لیکن بغیر کسی قسم کی رواداری اور تملق کے اس کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس یا والی ملک کو اس قدر وسیع المعلو مات، خوش تقریر، فصیح اللسان، نکتہ سنج اور دقیقہ رس نہیں دیکھا۔ وہ تقریر فرما رہی تھیں اور میں محو حیرت تھا کہ کیا دہلی اور لکھنؤ کی سرزمین کے سوا اور کسی ملک کا آدمی بھی ایسی شستہ اور فصیح اردو کے بولنے پر قادر ہوسکتا ہے۔ وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو کرتی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ کیا مخدرات اور حجلہ نشیں بھی اس قدر معلومات حاصل کرسکتی ہیں؟'' (۱)

علامہ شبلی اس ملاقات میں ان کے حسن اخلاق ہی سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ علوم اسلامی پر ان کی گہری نظر، مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت، مدارس کے گرتے معیار، معیاری کتب اور مصطلحات علمی کے تراجم وغیرہ سے متعلق ان کے خیالات نے بھی متاثر کیا۔ (۲)

ان کی علمی و تصنیفی صلاحیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر رضیہ حامد کی تحقیق کے مطابق ۴۵ر کتابیں لکھیں، جس میں ۴۰ر شائع ہوئیں اور پانچ کتابیں شائع نہ سکیں۔ ان کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

تزک سلطانی، گوہر اقبال، حیات شاہ جہانی، حیات قدسی، حیات سکندری، تذکرہ باقی، سبیل الجنان، عفت المسلمات، سیرت مصطفیٰ، ہدایت سلطانی، فرائض النساء، رہبر نسواں وغیرہ۔

تعجب ہوتا ہے کہ انتہائی باپردہ اور مشرقی آب و ہوا میں پلی بڑھی خاتون نے کشور کشائی کے ساتھ کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفات کے موضوعات میں بھی بڑا تنوع ہے۔ تاریخ، تعلیم، سیرت، سوانح، ادب، سفرنامہ، معاشرت، معیشت، امور خانہ داری، باغ بانی، نہ جانے کیسے کیسے مختلف النوع موضوعات پر انہوں نے قلم اٹھایا اور موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ان کی وسعت معلومات اور فکر ونظر کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔

اختر اقبال ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۹۱۴ء میں مطبع مفید عام میں طبع ہوا۔ پہلا حصہ گوہر اقبال کے نام سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا تھا۔ گوہر اقبال بیگم سلطان جہاں کی تخت نشینی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک کے احوال پر مشتمل ہے اور اختر اقبال میں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات ہیں۔ اس دوسرے حصہ میں علامہ شبلی سے متعلق تین مسلسل تحریریں شامل ہیں۔

بیگم صاحبہ علامہ شبلی سے کب واقف ہوئیں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ غالباً ۱۸۹۲ء میں جب سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] بیگم بھوپال کے مہمان ہوئے۔ علامہ شبلی بھی ان کے ساتھ تھے، اس وقت ان کا قیام نواب سید علی حسن خاں کے مکان نور محل میں تھا، ممکن ہے اس موقع پر ملاقات بھی ہوئی ہو مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

علامہ شبلی جب ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے عہدہ سے مستعفی ہوئے تو بیگم صاحبہ نے نواب محسن الملک کے ذریعہ انہیں بھوپال میں قیام کی پیش کش کی۔ (۳) مگر علامہ شبلی نے ندوہ کی محبت میں اسے نامنظور کر دیا اور لکھنؤ آ گئے۔ اس کے بعد وہ ندوہ کی امداد کے لئے بیگم سلطان جہاں سے ملے، چنانچہ انہوں نے ندوہ کی بڑی مدد کی۔ بیگم کے تعاون اور ان کے اخلاق شریفانہ سے وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کا ذکر الندوہ میں بڑے والہانہ انداز میں کیا۔ (۴)

جنوری ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نے سیرت نبویؐ کی تالیف کا منصوبہ الندوہ میں شائع کیا تو ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بیگم سلطان جہاں کے لٹریری اسسٹنٹ منشی محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] نے انہیں سیرت کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے اپریل ۱۹۱۲ء میں

سیرت نبوی کی تالیف کے لئے دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔اس کی تفصیل اب تک تمام لوگوں کو حیات شبلی سے پڑھنے کو ملی ہے۔خود بیگم صاحبہ نے اپنی خودنوشت میں اس کے بارے میں کیا لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو:

''چونکہ اردو میں اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مفصل اور مستند سوانح عمری نہیں ہے، اس لئے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلما مولانا شبلی جو تاریخ اسلام کے ایک باکمال اور مستند عالم ہیں، سیرت نبویؐ مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن مالی امداد سے مجبور ہیں اور انہوں نے ایک اپیل امداد کے لئے شائع کی ہے۔ میں نے اس اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایک ایسی ضروری اور مذہبی تصنیف کے لئے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہونچی ہے۔ میں نے ان کو مطلع کیا کہ وہ فوراً کام شروع کر دیں اور جس قدر روپیہ کے لئے اپیل کی گئی ہے وہ میں دوں گی۔''(۵)

بیگم سلطان جہاں کی منظوری اپریل ۱۹۱۲ء میں ملی، مئی کے آخر میں علامہ شبلی بمبئی جاتے ہوئے بھوپال میں ٹھہرے اور بیگم صاحبہ سے ملاقات کی۔اسی موقع پر انہوں نے یہ قطعہ کہا تھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی ۔۔۔ مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ ۔۔۔ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اسے سن کر بیگم سلطان جہاں بے حد متاثر ہوئیں۔دو برس بعد جب امداد کی مدت میں بیگم صاحبہ نے توسیع کی تو علامہ شبلی بے حد مسرور ہوئے اور یہ قطع کہا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

سیرت نبوی کے مصارف میں کتابوں کی خریداری کے لئے یکمشت رقم کی بھی ضرورت تھی جسے بیگم صاحبہ کے صاحبزادے اور بھوپال کے آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں نے فراہم کیا۔ بیگم صاحبہ لکھتی ہیں:

''لیکن اپیل میں ان کتابوں کے متعلق ذکر نہ تھا جو تالیف سیرت نبویؐ میں ضروری تھیں، جب حمید اللہ خاں کو یہ ضرورت معلوم ہوئی تو انہوں نے ثواب میں حصہ لینے کے لئے فوراً دو ہزار روپے خرید کتب کے لئے مولانا موصوف کے پاس بھیج دئے اور اجازت دی کہ جس قدر مزید کتابوں کی ضرورت ہو وہ بھی خرید لی جائیں، ان کی قیمت بھی ادا کی جائے گی۔

امید ہے کہ یہ کتاب تیار ہو کر نہایت مفید ثابت ہو گی۔''(۶)

بیگم سلطان جہاں نے سیرت نبوی کی تالیف کا ذمہ لیا، ایک بیٹے نے کتابوں کی خریداری کے لئے دو ہزار یکمشت مرحمت فرمائے تو دوسرے بیٹے کرنل عبید اللہ خاں [۱۸۷۸-۱۹۲۴ء] نے سیرۃ النبیؐ کے انگریزی ترجمہ کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ بیگم سلطان جہاں لکھتی ہیں:

''کرنل عبید اللہ خاں نے اس کے انگریزی میں ترجمہ وطبع کے مصارف اپنے ذمہ لئے۔ یہ ان دونوں عزیزوں کا مذہبی خلوص اور وہ جذبہ ہے جو ہر ایک سچے مسلمان کے دل میں ہونا چاہئے۔''(۷)

کرنل عبید اللہ خاں کا حیات شبلی میں ذکر نہیں ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد بھوپال کی تاریخ پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اس حوالہ سے انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کرنل عبید اللہ خاں نے ترجمہ سیرت کے لئے خواجہ کمال الدین [۱۸۷۰-۱۹۳۲ء] کا انتخاب کیا تھا۔ (۸) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سیرت کی تکمیل سے پہلے تینوں نے وفات پائی۔ (۹) مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ سیرت کی پہلی جلد ۱۹۱۸ء میں اور

دوسری جلد ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی، جبکہ کرنل عبیداللہ خاں نے ۱۹۲۴ء میں اور خواجہ کمال الدین نے ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔

''اختر اقبال'' میں اس کے علاوہ علامہ شبلی سے متعلق کوئی تحریر شامل نہیں ہے، البتہ بیگم صاحبہ نے اپنی ایک دوسری کتاب عفت المسلمات میں ان کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے علم و فضل کے ساتھ ان کی روشن خیالی کا بھی ذکر ہے۔(۱۰) دراصل علامہ شبلی کی اسی روشن خیالی نے انہیں متاثر کیا تھا۔

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی تو بیگم سلطان جہاں نے بڑی حسرت سے کہا: ''فقیر بے نوا تو چل بسا سلطان باقی ہے۔''(۱۱)

علامہ شبلی کے بعد دارالمصنّفین کی بھی انہوں مدد کی، معارف پریس انہیں کے پیسے سے خریدا گیا مگر ان کی خودنوشت کے بقیہ حصے نہ لکھے گئے اور نہ شائع ہوئے اس لئے اس کی تفصیلات ان کے قلم سے دستیاب نہیں۔

حوالے

(۱) ماہنامہ الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء ص ا

(۲) ایضاً ص ۲

(۳) حیات شبلی ص ۴۰۸-۴۰۹

(۴) ماہنامہ الندوہ اکتوبر ۱۹۰۵ء ص ا-۴

(۵) اختر اقبال ص ۲۳۸

(۶) ایضاً ص ۲۳۸

(۷) ایضاً ص ۲۳۸

(۸) ایضاً ص ۲۳۶

(۹) ایضاً

(۱۰) عفت المسلمات ص ا-۲

(۱۱) حیات شبلی ص ۷۳۵

(تصویر: میر ولایت حسین)

[۲]

آپ بیتی

• میر ولایت حسین
[حبیب اللہ منزل، ڈگی روڈ، علی گڑھ، طبع اول، ۱۹۷۰ء]

یہ علی گڑھ کے ایک نامور فرزند میر ولایت حسین [۱۸۶۲-۱۹۴۹ء] کی آپ بیتی ہے۔ اسے انہوں نے منشی نجم الدین کو املا کرایا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے ہادی حسین زیدی کی خواہش پر سید محمد ٹونکی نے مرتب کیا اور ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ سے شائع کیا۔

میر ولایت حسین ۱۸۶۲ء میں ریواڑی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۷۵ء میں دہلی گئے۔ وہاں سے مڈل اور ۱۸۸۱ء میں انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے۔ جنوری ۱۸۸۲ء میں فرسٹ ایر میں داخلہ ہوا۔ یہاں سے انہوں نے بی.اے پاس کر کے کالج ہی میں ملازمت اختیار کر لی۔ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ اسکول میں سکنڈ ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر رہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور بک ڈپو کی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں۔ اسی زمانہ میں مضامین بھی لکھے جس کے نمونے آپ بیتی کے آخر میں دیئے گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ قیام علی گڑھ میں رہا۔ ۸/جولائی ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ ہی میں انتقال کیا اور یونیوسٹی قبرستان کی خاک کا پیوند ہوئے۔

میر ولایت حسین ۱۸۸۲ء یعنی سرسید کے عہد میں علی گڑھ کالج آئے۔ ان کے بہت قریب رہے۔ کالج کی تمام ترقیاں ان کے سامنے ہوئیں۔ سرسید کی وفات کا سانحہ بھی دیکھا۔ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے ادوار بھی دیکھے۔ ان کے سامنے ایم اے او کالج، مسلم

یونیورسٹی بنا گویا یہ اس کی زندہ تاریخ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتی، آپ بیتی سے زیادہ ایم اے او کالج کی کہانی ہے۔

علامہ شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں ایم.اے.او کالج سے وابستہ ہوئے تو میر صاحب طالب علم تھے اور علامہ شبلی استاذ، پھر میر صاحب بھی استاد ہو گئے۔ علامہ شبلی نے ان کے سامنے ہی علی گڑھ کو ۱۸۹۸ء میں خیر باد کہا، اس طرح شبلی کے سولہ سالہ قیام علی گڑھ کے وہ مشاہد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے اور شبلی کے حوالہ سے بعض ایسی باتیں بھی ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ یہاں ان کا علی الترتیب ذکر کیا جاتا ہے۔

[۱]

میر ولایت حسین نے آپ بیتی میں کالج اور اسکول کے اسٹاف کی فہرست درج کی ہے جو ۱۸۸۶ء کی ہے۔ اس میں پروفیسر فارسی کی حیثیت سے علامہ شبلی کا نام بھی درج ہے۔ (۱) فروری ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی کا تقرر پروفیسر فارسی اور نائب پروفیسر عربی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ مذکورہ فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۸۶ء تک علامہ شبلی اسی عہدہ فائز پر رہے۔

[۲]

۲۸ر فروری ۱۸۸۸ء کو سرسید [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے صاحبزادے سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کی شادی ہوئی۔ ۵ر مارچ ۱۸۸۸ء کو سرسید نے کالج کے ڈائننگ ہال سالار منزل میں ولیمہ کیا، جس میں کالج کے طلبہ، اساتذہ اور سرسید کے احباب نے شرکت کی۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے ایک قصیدہ پڑھا جس کا آغاز اس طرح ہوا:

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل
چھالیا سبزہ نوخیز نے سب دشت و جبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار
جھومتے آتے ہیں پھر صحن چمن میں بادل

یہ قصیدہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ (۲) اور اب کلیات شبلی اردو مرتبہ

مولانا سید سلیمان ندوی میں شامل ہے۔

[۳]

۱۸۸۸ء میں ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کے والدین اور بہن موسم سرما میں علی گڑھ آئے۔ ۲۸؍نومبر ۱۸۸۸ء کی شب میں اسٹاف کی طرف سے سالار منزل میں انہیں ڈنر دیا گیا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے معزز مہمانوں کی شان میں پہلے اپنا قصیدہ سنایا، پھر آغا سنجر ایرانی کا قصیدہ پیش کیا۔ (۳)

[۴]

فروری ۱۸۸۹ء میں سرسید احمد خاں نے پینی ریڈنگ تھیٹر کیا۔ اس میں متعدد لوگوں نے حصہ لیا۔ حاجی محمد اسماعیل خاں ترکی جنرل اور چند طلبہ ترکی سپاہی بنے۔ آغا محمد حسین، سرحدی پٹھان اور منشی سعید خاں نے سادھو بن کر تلسی داس اور کبیر کے دوہے اور بھجن گائے۔ اس تھیٹر میں علامہ شبلی نے بھی حصہ لیا۔ اس کی تفصیل حیات شبلی میں درج ہے۔ مگر میر ولایت حسین نے اختصار سے ذکر کیا ہے۔ البتہ علامہ کی پوری نظم نقل کر دی ہے۔ (۴) یہ نظم کلیات شبلی اردو میں درج ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب بہم
بھیڑ کیا ہے، نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانان ہنر پرور و ارباب ہمم
جوق کے جوق چلے آتے ہیں، کیسے پیہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید یہ اس بزم کو یہ بزم طرب سمجھے ہیں

[۵]

میر ولایت حسین نے ایم اے او کالج کے قدیم اسٹاف، عہدے اور تنخواہوں کی تفصیل بھی آپ بیتی میں قلم بند کی ہے۔ علامہ شبلی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی باوجود اپنے علم وفضل کے محمڈن کالج علی گڑھ میں چالیس روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے تھے۔ جولائی ۱۸۸۶ء میں جب مولوی محمد اکبر پروفیسر عربی کا انتقال ہوا تو مولوی شبلی ان کی جگہ پر مبلغ ستر روپیہ ماہوار پر پروفیسر عربی مقرر ہوئے۔ بعدازاں غالباً ۱۸۸۸ء میں سالار جنگ ثانی لائق علی خاں مدارالمہام ریاست حیدرآباد کی علی گڑھ تشریف آوری پر ریاست حیدرآباد سے کالج کی امداد بجائے ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار کے ایک ہزار روپیہ ماہوار ہوگئی اور مولوی شبلی کو ایک سو روپیہ ماہوار بطور تنخواہ کالج سے ملنے لگے اور یہی تنخواہ مولانا کی اس وقت تک رہی جب کہ ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد مولانا نے کالج چھوڑا۔''(۵)

[۲]

علامہ شبلی علی گڑھ کالج میں ایف .اے اور بی .اے کے کلاسز کو عربی و فارسی پڑھاتے تھے۔ علاوہ ازیں درس قرآن کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران سیکڑوں طلبہ نے اپنی علمی تشنگی سرد کی۔ ان میں محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، خوشی محمد ناظر، مولوی مسعود علی محوی، مولوی عبدالحق، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ایم اے او کالج میں علامہ شبلی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے جس کا ذکر اس آپ بیتی کے سوا شاید ہی کہیں اور ملے کہ علامہ خارجی اوقات میں بھی طلبہ کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیتے تھے۔ میر ولایت حسین نے اس کی تفصیل لکھی ہے:

''مولانا موصوف اگرچہ اسکول اسٹاف میں تھے مگر علاوہ وقت مدرسہ کے بورڈنگ کے طلبہ کو عربی فارسی میں امتحان ایم .اے کے واسطے تیار کرتے تھے۔ چنانچہ سید عبدالباقی مرحوم نے اول فارسی میں بعدازاں عربی میں مولانا کی مدد سے پرائیویٹ طور سے امتحان ایم .اے پاس کیا۔ اسی طرح پر مولوی بہادر علی مرحوم نے مولانا کی مدد سے امتحان ایم .اے عربی زبان میں فرسٹ

ڈویژن میں پاس کیا اور بعض اور طلبہ نے بھی امتحان ایم .اے پاس کرنے
میں مولانا سے مدد لی۔ بعد ازاں ۱۸۹۸ء میں بعد وفات سرسید صاحب جب
مولانا شبلی کالج سے علاحدہ ہوئے تو مولوی خلیل احمد صاحب کالج میں ان کی
جگہ پچاس روپیہ ماہوار پر پروفیسر مقرر ہوئے۔''(٦)

[۷]

میر ولایت حسین کی آپ بیتی کا ایک ذیلی عنوان تقسیم تنخواہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے عہد میں انگریز اساتذہ کو سب سے پہلے ۵ر تاریخ کو تنخواہ ادا کردی جاتی تھی۔ بعد ازاں جو سرسید کے قریب رہتے تھے یعنی مولانا شبلی ، جادو چندر چکرورتی اور مولوی عباس حسین کو تنخواہ ملتی تھی۔(۷)

[۸]

علی گڑھ کالج کا ایک بک ڈپو تھا۔مختلف اوقات میں مختلف اشخاص ان کے ذمہ دار ہوئے۔ میر ولایت حسین بھی اس کے ذمہ دار رہے۔اس بک ڈپو نے سرسید،مولانا شبلی ،مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی کی کتابیں برائے فروخت رکھی تھیں۔ میر ولایت حسین نے لکھا ہے کہ بک ڈپو نے ان کتابوں کی ایک فہرست شائع کی جس کا مقدمہ مولانا شبلی نے لکھا تھا۔(۸) اس فہرست اور اس کے مقدمہ کا ذکر اب تک راقم کی نظر سے کہیں اور نہیں گذرا۔ میر ولایت حسین نے اگر اس کا سنہ اشاعت بھی لکھ دیا ہوتا تو علامہ شبلی کی اس نادر تحریر تک رسائی ممکن ہو جاتی۔

[۹]

۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا اور علامہ شبلی اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔ میر ولایت حسین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔(۹)

[۱۰]

علی گڑھ کالج میں میلاد کی طرح علامہ شبلی نے ڈالی۔اس کا ذکر کئی اہل قلم نے کیا ہے۔ میر ولایت حسین نے بھی اس کی تفصیل سپرد قلم کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی صاحب نے میلاد شریف کا جلسہ اول اپنی کوٹھی پر کرنا شروع کیا اورتھوڑے سے آدمی اس میں مدعو ہوتے تھے۔نشست کرسی اور میز پرتھی اور مولانا خود اس میں سیرت نبویؐ بیان فرماتے تھے۔ بعد ازاں ۳۰ر اکتوبر۱۸۹۱ء کو میلاد شریف کا پہلا جلسہ نہایت شان وشوکت سے سالار منزل میں ہوااور کچھ عرصہ بعد یہ جلسہ اسٹریچی ہال میں ہونے لگا، آخر میں ایک ناگوار واقعہ کی وجہ سے اس قسم کے مذہبی جلسے اسٹریچی ہال میں ہونے موقوف ہوئے۔'' (۱۰)

میر ولایت حسین نے مذکورہ ناگوار واقعہ کی تفصیل نہیں لکھی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی حیات شبلی میں اس ناگوار واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ سالار منزل میں میلاد کا آغاز کب ہوا تھا، میر ولایت حسین کی تحریر سے اس کی تاریخ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۹۱ء کی تعیین ہوگئی۔

[۱۱]

علامہ شبلی ہندوستان کے کسی کالج کے پہلے پروفیسر تھے، جنہوں نے تعلیمی جائزے کے لئے بیرون ملک سفر کیا۔میر ولایت حسین نے ان کے سفر روم ومصر وشام کا ذکر کیا ہے اور مولانا کی روانگی کی تاریخ ۳۰ر اپریل ۱۸۹۲ء اور واپسی کی تاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۲ء لکھی ہے۔(۱۱) اس کے علاوہ انہوں نے کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے۔حالانکہ واپسی پر علامہ کو اسٹاف کی طرف سے استقبالیہ اور طلبہ کی طرف سے ڈنر دیا گیا اور باقاعدہ جلسہ ہوا۔قصائد اور استقبالیہ نظمیں پیش کی گئیں۔اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔

[۱۲]

علامہ شبلی نے ماہنامہ المعارف جاری کرنے کا ارادہ علی گڑھ میں کیا تھا، اس کا خاکہ بھی وہ بنا چکے تھے اور سرمور گزٹ ناہن میں جس کے ایڈیٹر مولوی سراج الدین تھے، اشتہار بھی دے دیا تھا، مگر پھر ان کی رائے بدل گئی۔ چونکہ علامہ نے المعارف سے میر ولایت حسین کو بھی وابستہ

کیا تھا، اس لئے اس کی تفصیل انہوں نے لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انہوں نے (شبلی) نے مجھ سے کہا تھا کہ میں لکھا کروں گا، اس کا انتظام تم کو کرنا ہوگا اور شرکت میں رسالہ معارف نکالیں گے۔ چنانچہ اعلان کیا گیا اور درخواستیں ایک ہزار کے قریب آ گئیں۔ بعدازاں مولانا کی رائے بدل گئی کہ جو وقت میں اس رسالہ کی تکمیل پر صرف کروں وہ ایسی کسی دوسری تصنیف میں کیوں نہ صرف کروں جو مستقل چیز ہوگی۔ یہ عارضی ہے اور وہ خیال چھوڑ دیا۔''(۱۲)

یہ اسکیم اگرچہ عمل میں نہ آسکی تاہم اس سے ان دونوں بزرگوں کے آپسی گہرے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے، مگر بعد میں معارف کی عدم اشاعت کو لے کر دونوں میں بحث ہوگئی اور دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار قرار دینے لگے۔ بحث یہاں تک پہنچی کہ دونوں میں چند دنوں تک گفتگو بھی بند ہوگئی۔(۱۳)

[۱۳]

سرسید کے صاحبزادے سید محمود جب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں تہنیتی جلسہ کیا۔ اس وقت وہ علی گڑھ سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں متعدد تقریریں ہوئیں۔ علامہ شبلی نے بھی بڑی شاندار تقریر کی جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی۔ چند برس پہلے پروفیسر اصغر عباس صاحب نے اسے ماہنامہ کانفرنس گزٹ میں دوبارہ شائع کرایا اور وہ کئی رسالوں میں نقل ہوئی۔ راقم کی کتاب نوادرات شبلی [مطبوعہ: ۲۰۱۷ء] میں بھی شامل ہے۔

سید محمود کی شادی ہوئی تو شبلی نے قصیدہ پیش کیا جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ ایسے بھی سید محمود سے شبلی کے تعلقات بہت اچھے تھے، مگر ایک واقعہ سے سید محمود ان سے ناراض ہو گئے اور پھر ان کی مخالفت کرنے لگے۔ میر ولایت حسین لکھتے ہیں:

''سید محمود جب پنشن لے کر علی گڑھ تشریف لائے اور سید صاحب کے

پاس مقیم ہو گئے تو اول دن مولوی شبلی صاحب کے بنگلہ پر جو سید صاحب کی کوٹھی کے احاطہ میں تھا ملاقات کو گئے ۔تقریباً دو گھنٹے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن پھر آئے اور حسب معمول بیٹھے رہے ۔ تیسرے دن پھر آئے تو مولانا خاموش ہو کر بیٹھ گئے ۔سید محمود نے دریافت کیا کہ کیوں مولانا کیسا مزاج ہے۔انہوں نے کہا مزاج تو اچھا ہے مگر صبح کے وقت ہی میں گھنٹہ دو گھنٹہ تصنیف و تالیف کا کام کر لیتا ہوں۔آپ کے تشریف لانے سے اس کام میں ہرج ہو جاتا ہے۔اس لئے مجھ کو افسوس ہوتا ہے۔سید محمود یہ سن کر اسی وقت اٹھ کر چل دیئے اور پھر ان کے پاس نہیں گئے اور باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے ۔''(۱۴)

میر ولایت حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ چوں کہ مولانا پورب کے رہنے والے تھے اس لئے علی گڑھ کی گرم اور خشک آب و ہوا ان کے ناموافق تھی اور وہ اس کے شاکی رہتے تھے۔ پرنسپل بیک نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ:

''جیسا ولایت میں ہوتا ہے کہ بعض پروفیسر خاص موسم میں آ کر یونیورسٹی میں لکچر دیتے ہیں اور باقی سال ان کے قائم مقام کام کرتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ میں مولانا شبلی جاڑے کے موسم میں آ کر تعلیم دیں اور گرمی کے موسم میں ان کا قائم مقام کام کرے۔سید محمود نے اس کی مخالفت کی مگر سید صاحب نے اس کو منظور کر لیا۔سید صاحب کے انتقال کے بعد مولانا شبلی علی گڑھ سے ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔''(۱۵)

اس تفصیل کے چند صفحات بعد میر ولایت حسین نے ایک ذیلی سرخی ''مولانا شبلی کی علی گڑھ سے علاحدگی'' قائم کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''بیک صاحب سید محمود کے طرفدار تھے۔ان کو یہ معلوم ہوا کہ مولوی شبلی صاحب حاجی اسماعیل خاں صاحب کی کوٹھی میں رہتے ہیں اور وہ حاجی

محمد اسماعیل خاں صاحب کو سید محمود کے خلاف آمادہ کرتے ہیں، اس لئے بیک صاحب نے مولوی شبلی صاحب سے کہا کہ مولانا آپ نے گرمی اور برسات کے موسم میں علی گڑھ سے باہر رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی، اب گرمی کا موسم ہے، آپ تشریف کیوں نہیں لے جاتے، چنانچہ مولوی شبلی علی گڑھ سے چلے گئے۔''(۱۶)

پرنسپل بیک سید محمود کے خیر خواہ اس لئے تھے کہ انہیں لندن سے وہی بلا کر لائے تھے۔ سرسید کی وفات کے بعد بیک صاحب چاہتے تھے کہ ان کے جانشین سید محمود ہوں۔ وہ نواب محسن الملک سے خائف اور خلاف تھے۔ اس پس منظر میں نواب محسن الملک سے علامہ شبلی کے گہرے تعلقات اور ان کی وہ کوششیں جو انہوں نے علامہ شبلی کو کالج میں واپس لانے کے لئے کیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بھی سرسید کے جانشین کے طور پر نواب محسن الملک ہی کو پسند کرتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے سید محمود شبلی کے مخالف ہوئے۔ سرسید کے آخری زمانہ میں سید محمود کی نازیبا حرکتوں سے سرسید نے کوٹھی چھوڑ کر نواب اسماعیل خاں دتاولی کے مکان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شبلی سرسید کی کوٹھی کے قریب ایک بنگلہ میں رہا کرتے تھے مگر آخر میں وہ بھی نواب اسماعیل دتاولی ہی کے مکان میں آ گئے تھے۔ گویا سرسید کے ساتھ ہی شبلی نے بھی بنگلیہ خالی کر دی تھی۔ افسوس نواب اسماعیل دتاولی کے گھر سے سرسید دنیا سے رخصت ہوئے اور شبلی علی گڑھ کالج سے۔ گویا شبلی نے علی گڑھ کالج خوشی سے نہیں چھوڑا۔

علامہ شبلی کو علی گڑھ سے بے پناہ تعلق تھا اور وہ بعد کے ادوار میں بھی علی گڑھ برابر جاتے رہے۔ طلبہ سے خطاب بھی کرتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ چھوڑنے کے جو اسباب بیان کئے ہیں، وہ دراصل علی گڑھ سے ان کے گہرے لگاؤ کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے آخری بار ۱۹۱۳ء میں طلبائے علی گڑھ سے اسٹریچی ہال میں خطاب کیا تھا۔ اس خطبہ کا خلاصہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا ہے:

''ہماری قوم کے قابل فخر فرد فرید اور زمانہ حال کے مورخ بے نظیر

علامہ شبلی نعمانی وقتاً فوقتاً علی گڑھ میں رونق افروز ہوکر کالج کے طلبہ کو اپنے
پاکیزہ خیالات اور اسلام کی اصلی تعلیمات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں ،
چنانچہ آپ نے حال میں علی گڑھ تشریف لاکر ۲۱ر فروری ۱۹۱۳ء کو نماز جمعہ
کے بعد اسٹریچی ہال میں طلبہ کے اوپر ایک مبسوط تقریر فرمائی۔''(۱۷)

اس تقریر کا عنوان ''اسلام کی بہترین جمہوریت'' تھا۔ ان کے تمہیدی کلمات کے ایک ایک حرف سے ان کی علی گڑھ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''حضرات!

گو مجھے ہندوستان کے ہر گوشہ میں تقریر کرنے کے مواقع ملے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقریر کا اصلی مقام علی گڑھ ہے، کیوں کہ تمام ہندوستان میں جیسے سامعین، جیسے قدر شناس، جیسے اندازہ داں علی گڑھ میں ہیں اور کہیں نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ علی گڑھ میں تقریر کرنا ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے سامنے تقریر کرنے کے برابر ہے۔ اسی لئے میری یہ ہمیشہ کوشش رہی کہ سال میں کم از کم چھ مہینے کالج میں بسر کروں [اور نواب محسن الملک مرحوم اور مسٹر ماریسن کے زمانہ میں اس قسم کا ایک معاہدہ تک ہوگیا تھا] مگر بعض موانع علی الخصوص ندوہ کے کام نے مجھے اپنے اس ارادہ سے باز رکھا۔ خدا کرے یونیورسٹی اسکیم جلد عملی صورت میں آئے تاکہ مجھے بھی اس کی خدمت کا موقع ملے۔''(۱۸)

اس زمانہ میں اور اس کے بعد بھی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاسوں میں بھی علامہ شبلی نے شرکت کی اور یونیورسٹی کے لئے جو وفد شملہ گیا تھا، اس کے ایک رکن علامہ شبلی نعمانیؒ بھی تھے۔ گو یہ تفصیل آپ بیتی میں نہیں ہے تاہم میر ولایت حسین کی یہ آپ بیتی سوانح شبلی میں چند اہم باتوں کا اضافہ کرتی ہے۔

حوالے

(۱) آپ بیتی ص۵۵
(۲) ایضاً ص۶۸-۶۹
(۳) ایضاً ص۷۰
(۴) ایضاً ص۷۷
(۵) ایضاً ص۸۶
(۶) ایضاً ص۸۶
(۷) ایضاً ص۸۸
(۸) ایضاً ص۹۱
(۹) ایضاً ص۹۲
(۱۰) ایضاً ص۹۲
(۱۱) ایضاً ص۱۰۰
(۱۲) ایضاً ص۱۰۷
(۱۳) ایضاً ص۱۰۷
(۱۴) ایضاً ص۱۱۵-۱۱۶
(۱۵) ایضاً ص۱۱۶
(۱۶) ایضاً ص۱۲۵-۱۲۶
(۱۷) بحوالہ خطبات شبلی ص۱۴۲
(۱۸) خطبات شبلی ص۱۴۲-۱۴۳

[۳]

یادایام

• عبدالرزاق کان پوری
[آتش فشاں پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور،۱۹۹۳ء]

یادایام اگرچہ تذکرہ کے طور پر لکھی گئی ہے، مگر اصلاً یہ مولوی عبدالرزاق کانپوری [۱۸۶۲ - ۱۹۴۸ء] کی یادداشتوں پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام یادایام ہے۔ اس کا آغاز سرسید کے ذکر سے ہوا ہے، پھر شبلی کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جسٹس سید امیر علی کا، اس کے بعد دوسرے اشخاص اکبرالہ آبادی، محسن الملک، منشی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی اور بہت سے لوگوں کی ملاقات، ان کے احوال، اور کارناموں کا تذکرہ مصنف نے اپنے خاص اسلوب میں کیا ہے اور ان کے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ منشی رحمت اللہ رعد کے بارے میں بھی لکھا ہے جن کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ شبلی کے دوست مولوی عبدالحلیم شرر کا بھی تذکرہ ہے۔ مولوی وحیدالدین سلیم، میر ناصر علی، سید محمود اور سرراس مسعود کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے۔ سرراس مسعود ہی کی خواہش اس کتاب کے لکھنے کا سبب بنی۔ اس کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ دہلی دربار اور ایجوکیشنل کانفرنس کی یادیں بھی سمیٹی گئی ہیں۔ غرض یاد ایام متنوع معلومات اور حالات و واقعات کا خزانہ ہے۔ البتہ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کتاب میں شبلی کے تذکرہ میں حیات شبلی کے مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے اور خود حیات شبلی میں جگہ جگہ اس کے حوالے موجود ہیں گویا یہ کتاب حیات شبلی سے پہلے لکھی گئی اور بعد میں مصنف نے حک و اضافہ کے ساتھ شائع کیا۔ یہ کتاب اشاعت سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کو بھیجی گئی تھی۔ سید

صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے اور خود سید صاحب نے حیات شبلی میں اس سے استفادہ کیا ہے اور حوالے دئے ہیں، تاہم وہ مولوی عبدالرزاق کان پوری کے علامہ شبلی کے ذکر میں شوخیوں سے ناخوش تھے۔ شورش کاشمیری نے اس کا ذکر کیا ہے اور خدا جانے سید صاحب کا وہ خط جو انھوں نے عبدالرزاق کان پوری کو لکھا تھا کہاں سے حاصل کر کے اپنی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں نقل کیا ہے۔ اسے یہاں بھی نقل کیا جاتا ہے:

مکرمی

السلام علیکم، یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں۔ دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں نہایت بے تکلفی سے بعض واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لئے اور وہ بھی آغاز شباب کے لئے ہوتے ہیں۔ دور جوانی افتد چنانکہ تو دانی، مگر اب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے تو ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے۔ گناہ کا ستر چاہئے نہ کہ تشہیر، اس لئے از راہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطہ سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تاکہ ان کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لئے زیبا نہیں۔ والسلام

سید سلیمان (۱)

یہ بہت اہم خط ہے اور بہت سی باتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہ خط اس وقت لکھا گیا جب سید صاحب مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہو چکے تھے۔ باوجود اس کے خط کا ایک ایک لفظ علامہ شبلی سے انتہائی گہری عقیدت اور اپنے استاد سے والہانہ لگاؤ کا پتہ دیتا ہے، جو لوگ حیات شبلی پر تھانہ بھون کا طعنہ دیتے ہیں ان کے لئے یہ تعزیانہ ہے، مگر اس سے جو سب سے بڑی بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ خود سید صاحب بھی شبلی کے گناہ اور اس کی ستر پوشی کے خواستگار ہیں اور علامہ شبلی کے اخیر کام یعنی سیرۃ النبیؐ وغیرہ کو نقصان پہنچنے کے اندیشے سے خائف ہیں۔ بڑھی ہوئی

عقیدت معمولی باتوں کو بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ دراصل یہ ستر پوشی کی خواہش ہی نے شبلی کو مجرم بنادیا۔ اگر وہ بعض ذاتی ''واقعات شبلی'' کو گوارا کر لیتے اور وہ جو نہ گناہ تھے اور نہ جرم تو شاید ان کی معرکہ آرا تصنیف حیات شبلی بعض اعتراضات سے بچ جاتی۔

یادایام کے تذکرہ شبلی کے مطالعہ و جائزہ سے پہلے یہاں اجمالاً مولوی عبدالرزاق کان پوری کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری ۱۸۶۸ء میں کان پور میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن فرخ آباد تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ان کے والد منشی الٰہی بخش نے کان پور میں سکونت اختیار کی۔ مولوی عبدالرزاق کی پرورش و پرداخت ننہال فتح پور ہسوہ الہ آباد میں ہوئی۔ صوفی میر حسن نے بسم اللہ کرائی، پھر وہیں کے مکاتب و مدارس میں تحصیل علم کرتے رہے۔ عربی و فارسی کی درسیات متوسات تک وہیں پڑھیں اور پھر وہیں مدرس ہو گئے۔ ۱۸/سال کی عمر تک وہیں رہے۔ والد نے یہ کہہ کر کہ میں تم کو ملا نہیں بنانا چاہتا، وہاں سے واپس بلالیا۔ کان پور آئے تو یہاں کلکٹری میں اہلمد مقرر ہو گئے، پھر میونسپلٹی میں سررشتہ داری کے عہدہ پر تعینات ہوئے۔ کان پور میں انھوں نے مولوی احمد حسن معقولی سے درس نظامی کی بقیہ کتابیں تمام کیں اور حدیث کا درس مولانا محمد علی مونگیری سے لیا۔ ۱۹۰۷ء میں بھوپال گئے اور علامہ شبلی کی سفارش پر بیگم صاحبہ نے تحصیل دار کا عہدہ عنایت کیا۔ (۲) بقیہ زندگی یہیں گذری اور ۱۸/فروری ۱۹۴۸ء کو یہیں انتقال کیا۔ (۳)

عبدالرزاق کان پوری نے مصنف البرامکہ کی حیثیت سے پورے ملک میں شہرت پائی اور بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ البرامکہ ۱۸۹۷ء میں کان پور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب ۱۹۱۲ء میں نظام الملک طوسی شائع ہوئی۔ تیسری کتاب یہی یادایام ہے جس کا سنہ اشاعت معلوم نہیں۔ میرے پیش نظر ۱۹۹۰ء کی لاہور کی اشاعت ہے۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں بقول مولانا سید سلیمان ندوی غیر مطبوعہ تھیں، اس میں تاریخ تمدن اسلام کی پانچ جلدیں بھی تھیں جو انہوں نے بیگم سلطان جہاں کو پیش کی تھیں اور ان کے حکم سے شاہی کتب خانہ میں

داخل کی گئی تھیں۔(۴) معلوم نہیں شائع ہوسکیں یا نہیں۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری نے علامہ شبلی کو پہلی بار لکھنؤ کے ایجوکیشنل کانفرنس میں دیکھا تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا۔اس کے بعد وہ ان کے شیدائی ہوگئے، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے مہمان ہوتے، مولوی عبدالرزاق کانپوری علی گڈھ میں اور علامہ شبلی کان پور میں۔

علامہ شبلی کی کتابیں مطبع نامی میں طبع ہوتی تھیں۔منشی رحمت اللہ رعد جوخود بڑے اہل علم اور شاعر تھے، کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں علامہ شبلی کے رابطہ میں رہتے تھے۔مکاتیب شبلی میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر آیا ہے۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری کے رعد سے بڑے گہرے مراسم تھے اور وہ ان سے مطبع نامی کا کام بھی لیتے تھے۔اس سلسلہ سے انہوں نے علامہ شبلی کی بعض کتابوں کے پروف پڑھے اور علامہ شبلی سے متاثر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ علامہ شبلی کے سلسلہ نامور فرماں روایان اسلام کی طرح انھوں نے بھی سلسلہ وزرائے اسلام کا آغاز کیا اور اس کے دو حصے البرامکہ اور نظام الملک طوسی لکھے۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری نے یادایام میں شبلی سے اپنی گہری دوستی اور خوب خوب ملاقاتوں، سیر سپاٹوں، خوش گپیوں کا بار بار ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان کے بڑے رازدار تھے مگر تعجب ہوتا ہے کہ شبلی نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔مکاتیب شبلی کے دونوں مجموعوں میں ان کا نام تک نہیں آیا ہے۔مکتوبات شبلی میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔اس کے برعکس اخیر دور میں ان کے امین زبیری سے گہرے مراسم تھے۔ان کے نام مولوی صاحب نے متعدد خطوط بھی لکھے تھے جواب چھپ گئے ہیں، واقعہ صرف اس قدر ہے کہ وہ علامہ کے کثرت سے ملنے والوں میں تھے۔علامہ شبلی کے ذریعہ وہ پہلے سید محمود پھر سرسید کی بارگاہ تک پہنچے اور پھر ان کے حوالہ سے بھی ایسے واقعات لکھے ہیں جن کی کہیں اور سے تصدیق نہیں ہوتی۔جولوگ سرسید سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ سرسید کا دائرہ اثر کس قدر وسیع تھا۔ان کے احباب

ومعاصرین نے ان کی سوانح اور یادداشتیں بھی لکھی ہیں اور اپنے واقعات بھی بیان کئے ہیں مگر عبدالرزاق کان پوری نے جس طرح کے واقعات لکھے ہیں ان میں اس کا شائبہ بھی نہیں ملتا اور اگر کہیں کوئی بات تھی بھی تو عبدالرزاق کان پوری نے اپنی طرف سے اس میں اضافے کر دئے ہیں اور بات سے بات پیدا کی ہے۔ بقیہ یاد ایام میں جو کچھ لکھا ہے، وہ حیات شبلی سے ماخوذ ہے۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ البرامکہ میں ان کا جو اسلوب نگارش ہے وہ نظام الملک طوسی میں نہیں ہے۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ البرامکہ کی تصحیح و اصلاح علامہ شبلی نے کی تھی اور نظام الملک طوسی کی خود مصنف نے۔ جب اس کی زبان و بیان کو لے کر سوالات اور اعتراضات ہوئے تو انہوں نے تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی پر ڈال دی۔(۵) جو لوگ علامہ شبلی کے اسلوب نگارش اور زبان و بیان پر گہری نظر سے واقف ہیں وہ اس کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟

دراصل ان میں معاصرت تھی۔ انہوں نے ابتداءً شبلی سے اس قدر استفادہ کیا کہ وہ اس کا برملا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ شبلی کی وفات کے بعد جب انھوں نے شبلی پر قلم اٹھایا تو ان کے ہر کام اور ہر بات میں ان کی تضحیک کے پہلو نکالے ہیں اور اس طرح کہ تضحیک بھی ہو جائے اور ان پر الزام بھی نہ آئے۔

ان کی تصنیف البرامکہ پوری کتاب شبلی نے دیکھی اور صحیح کی یہی وجہ ہے کہ اس کا انتساب ان کے نام کیا اور اس طرح کیا:

> ''بکمال ادب وعقیدت بنابر اظہار شکر یہ تصنیف سلسلہ ہیروز آف اسلام یہ کتاب عالی جناب معلٰی القاب شمس العلماء مولانا مولوی شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ وفیلو یونیورسٹی الٰہ آباد مدظلہم کے نام نامی واسم گرامی سے منسوب کی جاتی ہے۔
>
> مسند علم از وجودت منبع آداب باد
>
> آستانت قبلہ جان اولی الالباب باد(۶)

اب ایک اور پہلو دیکھیں۔ وہ یاد ایام میں سرسید کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

''جب پہلی مرتبہ میری کتاب ''البرامکہ'' شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ نذر کیا۔ اس وقت سرسید بسترِ مرگ پر تھے۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا ''کتاب احتیاط سے رکھو میں انشاءاللہ اس پر ریویو لکھوں گا۔'' لیکن جب تہدیہ کا صفحہ دیکھا تو فرمایا کہ ''مصنف نے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کتاب کا تہدیہ مولوی شبلی کے نام کیا گیا، یہ تو میرا حق تھا۔'' مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بہ حیثیت ایک بزرگ قوم اور اردو کے معلم ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا (اردو کے معلم اول اسداللہ خان غالب دہلوی تھے۔) یہ سن کر سرسید غصہ ہوئے اور فرمایا کہ تم نے میرا منشا نہیں سمجھا۔ جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہوا تم جانتے ہو کہ میں خاندانِ وزارت سے ہوں۔ میرے نانا دولت مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندانِ وزارت کی تاریخ ہے۔ لہٰذا میرا حق انتسابِ شبلی سے بدرجہا فائق تھا۔'' (۷)

سرسید جیسے بلند ظرف صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ انہوں نے اس طرح کی کوئی بات کہی ہوگی۔

مولوی عبدالرزاق کان پوری نے یادِ ایام کا آغاز سرسید کے تذکرہ سے کیا ہے، پھر علامہ شبلی کا تذکرہ لکھا ہے۔ اولاً علامہ شبلی کا حسب نسب خاندان اور ولادت کا ذکر کیا ہے، پہلے خانوادہ شبلی کے بزرگوں اور خوردوں کا ذکر ہے، پھر شبلی کی ولادت اور اعظم گڈھ کا ذکر ہے، شبلی نے اپنے وطن موضع بندول کے بارے میں جو شاعرانہ تعلی کی تھی اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ:

''حب وطن کے جوش میں انھوں نے کہا ہے کہ ''جو بندول کی عظمت سے انکار کرے وہ انسان نہیں بلکہ نسناس (بن مانس) ہے اور بندول بہشت کا ایک مرغ زار ہے''، ممکن ہے کہ کسی عہد میں بندول کا یہی درجہ ہو، میں نے

اس موقع کی دو دفعہ سیر کی ہے، میری نظر میں وہ ایک معمولی گاؤں ہے۔‘‘(۸)

علامہ شبلی کا شعر یہ ہے:

فضل بندول گر تو نہ شناسی
آدمی نیسی تو نسناسی

اب مولوی عبدالرزاق کانپوری کو دیکھئے انہوں نے اس شعر سے کتنے معنی پیدا کر لئے ہیں اور شاعرانہ تعلی کے کیا کیا مفہوم نکالے ہیں۔ بہر حال اس سے ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ مولوی صاحب علامہ شبلی کے وطن بندول بھی تشریف لائے تھے۔

انہوں نے علامہ کی تاریخ ولادت مئی ۱۸۵۷ء لکھی ہے جو یقیناً حیات شبلی سے نقل کی گئی ہوگی۔ جدید محققین کے مطابق ۴ر جون ۱۸۵۷ء تاریخ پیدائش ہے، اس سے پہلے ۳ر جون کی تحقیق تھی، مگر ان کے عہد میں بھی بعض تذکرہ نگاروں نے مئی کے بجائے جون ۱۸۵۷ء لکھا تھا، اس کی انہوں نے تحقیق نہیں کی۔

علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل کا تذکرہ بھی حیات شبلی سے ماخوذ ہے۔ بعد ازاں علامہ کی تعلیم و تربیت کے احوال درج ہیں، اس میں بھی کوئی ندرت نہیں، تمام کا تمام حیات شبلی میں درج احوال کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ ان کی عربی دانی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

’’مولانا شبلی درس نظامیہ کے ہر شعبہ میں امتیازی خصوصیت رکھتے تھے، لیکن ادب عربی سب پر غالب تھا۔ ان کی عربی انشا پردازی کو مصر اور شام کے علما نے تسلیم کیا ہے اور فارسی بھی مثل اہل زبان کے تھی۔‘‘(۹)

لیکن ان کی اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’رہی اردو، اس زبان میں شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی کے بعد ان کا درجہ تسلیم کیا جاتا ہے اور حقیقت میں وہ آزاد کے مقلد تھے۔ قصص ہند اور سخن دان فارس کا عرصہ تک مطالعہ کیا تھا، چنانچہ ادب اردو میں ان کی نثر اور نظم دونوں مقبول ہیں۔‘‘(۱۰)

بعدازاں لکھا ہے کہ:

اعظم گڈھ کی اردو صوبہ متحدہ میں نہایت ادنی درجہ کی ہے اور میری رائے میں اس کو اردو کہنا زبان کی توہین ہے اور عوام وخواص سب کی ایک ہی بولی ہے۔'' (۱۱)

اس کے بعد انہوں نے اعظم گڈھ کی بولیوں کی کچھ مثالیں دی ہیں پھر یہ تعجب کرتے ہیں کہ آخر مولانا کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ دراصل مولانا کم سنی میں اعظم گڈھ چھوڑ کر صوبہ متحدہ میں آ گئے تھے۔(۱۲) حالانکہ یہ حقیقت واقعہ نہیں۔علامہ کی تمام تر تعلیم غازی پور اور اعظم گڈھ میں ہوئی۔دوسال سے کم مدت ان کے رام پور اور لاہور کے قیام کی ہے۔

صوبہ متحدہ کا ذکر کرنے کے فوراً بعد مولانا شبلی کے بچپن کے ذکر میں کتب فروشوں کی دوکانوں پر مشاہیر شعراء کے دیوان پڑھنے کا ذکر کرتے ہیں گویا وہ بھی اعظم گڈھ میں نہیں صوبہ متحدہ میں پڑھتے تھے، حالانکہ انھوں نے اعظم گڈھ کے کتب فروشوں کے یہاں شعراء کے دواوین کا مطالعہ کیا تھا۔

اس کے بعد ان کی شاعری اور تخلص کا تذکرہ ہے۔چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں اپنی پہلی ملاقات اور جلسہ کی تفصیلی روداد لکھی ہے اور علامہ شبلی کے لکچر ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کا ذکر کیا ہے۔مولانا کا حلیہ اور انداز خطاب کا بھی بیان کیا ہے اور لکچر کے بارے میں لکھا ہے کہ فی الحقیقت موضوع کے لحاظ سے اردو میں یہ پہلا خطبہ تھا۔(۱۳) لیکن فوراً بعد اس کی اہمیت کم کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر عربی میں مولانا عبداللہ العبیدی کا رسالہ شائع ہو چکا تھا۔(۱۴)

اس اجلاس میں علامہ نے قصیدہ عیدیہ بھی پیش کیا تھا، اس کا ذکر بھی مولوی صاحب نے کیا ہے اور اس کے اپنے پسندیدہ اشعار بھی نقل کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ:

''اس موقع پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس عالمانہ خطبہ سے مولانا کی عام

شہرت ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ محض ادبیات کے پروفیسر ہی نہیں بلکہ تاریخی مذاق بھی رکھتے ہیں اور فارسی کے ماہرفن شاعر بھی ہیں۔'' (۱۵)

اس کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کی ان ستائشوں کا ذکر ہے جو انھوں نے علامہ شبلی کے لئے کی تھیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۸۸۹ء میں شبلی نے جو ترکیب بند پیش کیا تھا اس میں ڈپٹی نذیر احمد کی تعریف تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے علامہ شبلی سے کہا کہ آپ نے جو اشعار میری تعریف میں کہے ہیں، اس کے اصل مستحق حالی تھے، جن کے مداح غالب تھے۔ (۱۶) پھر ڈپٹی نذیر احمد کی اس تقریر کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ''اب عربی کی طرف سے ڈھول ہوتا جاتا ہے اگر مولوی شبلی پوچھ بیٹھیں کہ عیسیٰ اور موسیٰ کا کیا صیغہ ہے تو بغلیں جھانکنا پڑیں۔'' (۱۷) مولوی عبدالرزاق کان پوری کا یہ خیال ہے کہ دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے پیش نظر یہ نکتہ تھا کہ اس سے شبلی روشناس ہو جائیں گے۔ (۱۸) پھر اپنی رائے دی ہے کہ:

> ''میری رائے میں یہ پہلا دن تھا کہ مولانا شبلی کو کانفرنس میں علامہ نذیر احمد نے گویا مولویت کی سند عطا کی اور اس ایک جملہ نے وہ کام کیا جو قصیدہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔'' (۱۹)

جس کانفرنس کا یہ ذکر ہے وہ ۱۸۸۹ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت تک علامہ شبلی کا نہ صرف رسالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم بلکہ المامون کا دوسرا ایڈیشن سرسید کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہو چکا تھا مگر مولوی صاحب انھیں اس سنہ یعنی ۱۸۸۹ء میں روشناس کرا رہے ہیں۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے شبلی کی وکالت اور ملازمت کا چند سطروں میں ذکر کیا ہے۔ پھر سرسید سے پہلی ملاقات اور شبلی کے قصیدہ کا ذکر ہے۔ اس کے چند اشعار اور اس کا ترجمہ درج کیا ہے۔ یہ ترجمہ ان کا نہیں بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے جو انھوں نے حیات شبلی سے نقل کیا ہے۔ پھر ان کی علی گڑھ سے وابستگی کی تفصیل ہے۔ سرسید کے قومی تھیٹر جس میں شبلی نے بھی ایک کردار ادا کیا تھا کا ذکر ہے۔ اس موقع پر علامہ نے جو مسدس پیش کیا تھا، اسے نقل بھی کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ان کی تصانیف کا تذکرہ ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ۳۲ سال ملک وقوم کی

خدمت میں صرف کئے، پھر اس ۳۲ رسالہ خدمات کو سلسلہ وار بیان کیا ہے۔

۱-اشاعت علوم وفنون بذریعہ قومی مدارس واسکول

۲-اصلاح علمائے قدیم، تالیفات میں جدید اسالیب اور اس کا اہتمام

۳-انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس اور اس کا اہتمام

۴-مسلمان طلبہ میں مذہبیت کا جوش، مطالعہ قرآن، نماز کی پابندی

۵-عہد ملازمت کی خدمات (یہ ایک وسیع مضمون ہے)

۶-ندوۃ العلما کے قیام کے بعد علوم مشرقی کی ترقی اور اصلاح نصاب، درس کے جدید طریقے، ذوق فراہمی کتب نایاب وقلمی، اسلام کی حفاظت واشاعت، سیرت نبویؐ کی تکمیل۔

۷-حیدرآباد دکن کے کارنامے (تصنیفات جدید)

علامہ کی علی گڑھ سے پہلے کی کتب اسکات المعتدی اور ظل الغمام وغیرہ کے ذکر کے ساتھ عہد جدید کی تصنیفات کا بھی ذکر ہے۔ المامون کے بارے میں لکھا ہے:

''پروفیسر پامر نے ایک کتاب ہارون الرشید لکھی تھی، اس کی ہذیان سرائی کے جواب میں المامون لکھی گئی۔'' (۲۰)

یہ کس قدر غلط ہے؟ اہل علم اس سے واقف ہیں۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کی اہمیت کم کرنے کے بعد المامون کا یہ حشر، دراصل مولوی صاحب اس طرح شبلی کی ہر کتاب کا ذکر کرتے ہیں۔ آئندہ سطور میں ان کی نشاندہی کی جائے گی۔ المامون کے بعد سیرۃ النعمان کا تعارف ہے اور لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی کو زمانہ تعلیم سے فقہ حنفی سے انتہائی ذوق تھا۔ چنانچہ یہ کتاب امام ابوحنیفہ کے حضور میں بطور نذر عقیدت پیش کی گئی ہے، جو اپنے رنگ کی پہلی کتاب تھی اور اہل حدیث کے لئے بھی یہ ایک ہدیہ تھا، اس کتاب کی اشاعت نے مناظرہ کے قدیم طرز کو بالکل تبدیل کر دیا۔'' (۲۱)

مولوی صاحب نے نہ جانے اسے اہل حدیث کے لئے ہدیہ کیوں لکھا ہے؟ جبکہ اہل

حدیث علماء نے اس کے خلاف مضامین بلکہ ایک مستقل کتاب حسن البیان لکھی ہے۔

بعد ازاں سفرنامہ روم ومصر وشام کا ذکر ہے اور اس کا موازنہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے سفرناموں سے کر کے اسے جامعیت سے خارج قرار دیا ہے۔ (۲۲) لیکن تعلیمی نقطہ نظر سے نہایت مفید بتایا ہے۔ (۲۳)

یہ سفرنامہ انگریزی گورنمنٹ کی نظر میں کس قدر مشکوک ٹھہرا گو اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے اور مولوی عبدالرزاق کان پوری ہی کے حوالہ سے ہے، تاہم یہ طویل اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''جب یہ سفرنامہ شائع کیا گیا تو گورنمنٹ ہند نے سختی سے اس پر نکتہ چینی کی اور جو تمغہ مجیدی امیر المومنین سلطان عبدالحمید خاں نے عطا فرمایا تھا، اس کے استعمال کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ سبب یہ تھا کہ اس سفرنامہ میں سلطان کے ساتھ انتہائی جوش عقیدت کا اظہار کیا گیا تھا جو گورنمنٹ کی پالیسی کے خلاف تھا۔ گورنمنٹ کے اس طرز عمل سے سرسید بھی ناراض ہوئے۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد کو توجہ دلائی، گورنمنٹ نے اس کے جواب میں صرف یہ کیا کہ مولانا شبلی کو جنوری ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ چنانچہ اس کی تہنیت میں طلبہ اور احباب نے ایک جشن منایا۔ رباعیات، قطعات اور مدحیہ قصائد لکھے گئے۔ میں صرف مبارک باد کا تار ارسال کر سکا۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک کی تقریر جو طلبہ کو مخاطب کر کے کی تھی مختلف حیثیتوں سے نہایت دلچسپ اور معنی خیز تھی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر گورنمنٹ کے دل میں مولانا کی طرف سے جو بدگمانی ہوگئی تھی وہ نہ گئی اور یہ ریشم کی گرہ اخیر تک نہ کھل سکی۔'' (۲۴)

شبلی کے چھوٹے بھائی بیرسٹر مہدی حسن کی خواہش پر مولوی عبدالرزاق کانپوری نے بھی سفرنامہ پر تبصرہ کیا تھا، افسوس وہ تبصرہ تلاش بسیار کے باوجود آج تک نہ مل سکا۔ اس ریویو کا بقول

عبدالرزاق کانپوری یہ انجام ہوا کہ:

''مجسٹریٹ کان پور کے اجلاس میں میری طلبی ہوئی، لیکن مجسٹریٹ صاحب کے سامنے میں نے اپنی ناتجربہ کاری اور سیاسیات سے لاعلمی ظاہر کی تو ہدایت کی گئی کہ تم برطانیہ کی رعایا ہو، لہٰذا آئندہ تر کی حکومت اور گورنمنٹ کے معاملات پر کچھ نہ لکھنا۔ چنانچہ اس قسم کے اسباب تھے کہ مولانا کو علی گڈھ سے حیدرآباد جانا پڑا اور مخفی پولس ان پر مسلط کر دی گئی۔''(۲۵)

مولانا کے حیدرآباد جانے کا یہ سبب بھی کسی اور اہل قلم نے نہیں لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ علامہ کو انگریزوں کی دشمنی ہی کی وجہ سے حیدرآباد جانا پڑا۔

اس کے بعد مجموعہ نظم فارسی کا ذکر ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ مولوی عبدالرزاق کان پوری کو بہت پسند ہے اور وہ چونکہ اصلاً فارسی شعروادب پر گہری نظر رکھتے تھے اس لئے ان کا یہ کہنا ہے کہ:

''قدیم فارسی اور نئی طرز میں یہ قندوگلاب کا برف آمیز شربت تھا۔ یہ جملہ قصائد اور ترکیب بندوغیرہ جدید انشا میں اچھوتے تھے، جس کی کوئی نظیر موجود نہ تھی۔

جب وہ [شبلی] قومی نظم کو جوش وخروش سے پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا باربد جہرمی خسرو پرویز کے دربار میں نغمہ سنجی کر رہا ہے۔ حاضرین جلسہ پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔''(۲۶)

رسائل شبلی علامہ کے تحقیقی اور تاریخی مقالات کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے ذکر کے بعد الفاروق کا ذکر ہے اور یہ اعتراف ہے کہ ''جس حیثیت سے مولانا شبلی نے الفاروق لکھی اس معیار سے اس کتاب کا ہندوستان میں لکھنا محال تھا اور ان کو تکمیل الفاروق کے لئے مصر وشام کا سفر اختیار کرنا پڑا۔''(۲۷)

مولوی عبدالرزاق صاحب علامہ شبلی کی ہر کتاب پر ایک نئی روایت ڈھونڈ لاتے ہیں

الفاروق پر بھی ڈھونڈ لائے، انہوں نے لکھا ہے کہ:

''مولانا کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کو جب اس کی خبر ہوئی کہ الفاروق اردو میں لکھی گئی ہے تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا شبلی سے مجھے امید تھی کہ وہ فلسفہ یا معقول یا تفسیر کی کوئی کتاب عربی میں لکھیں گے، ایسی کتابیں تو میرے گھر کی کنیزیں بھی لکھ سکتی ہیں۔'' (۲۸)

خود مولانا فاروق چریا کوٹی تو لکھ نہ سکے کنیزیں کیا لکھتیں لیکن مجھے یہ واقعہ ہی سرے سے درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پہلے تو مولانا فاروق چریا کوٹی کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریا کوٹی اردو میں رسالہ بشریٰ لکھ چکے تھے جو اگرچہ بعد میں شائع ہوا۔ ادب و انشا کے شاہکار الفاروق کے بارے میں کوئی سوچ سکتا ہے کہ مولانا فاروق چریا کوٹی کی کنیزیں ایسی کتاب لکھ دیں گی۔ اس واقعہ کی کسی اور ماخذ سے تصدیق بھی نہیں ہوتی، دراصل یہ واقعہ مولوی عبدالرزاق کان پوری کی اختراع ہے۔

بعدازاں مولوی صاحب نے الفاروق کی شہرت و مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ سبقت کی غرض سے مولوی سراج الدین کے سیرۃ الفاروق لکھنے کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اسے لوگوں نے شبلی کی الفاروق سمجھ کر بکثرت خریدا۔ اس پر مولوی سراج الدین کو سرسید نے تنبیہ کی تھی، اس کا ذکر بھی ہے۔ ان کے اظہار معذرت پر لکھے خط کا بھی ذکر کیا ہے، پھر لطیفہ سنایا ہے کہ مراد آباد کے ایک سب جج نے الفاروق کا خیالی رد لکھنا شروع کیا لیکن الفاروق کی اشاعت کے بعد وہ شائع نہیں ہوا۔ غالباً مولوی صاحب کو اطلاع نہیں تھی کہ الفاروق کا انھوں نے جو رد لکھا تھا وہ الفرق کے نام سے مراد آباد سے دو حصوں میں شائع ہو چکا تھا۔

الغزالی کے بعد علم الکلام اور الکلام کا تعارف ہے۔ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کتابوں کی تالیف کے متعدد اسباب تھے۔ اول علماء کی مخالفت جنہوں نے ندوہ کے سلسلے میں مولانا پر کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ

الغزالی کی تصنیف میں علم کلام کی بہ کثرت کتابیں نظر سے گذر چکی تھیں، اس لئے ادھر متوجہ ہوئے اور یہی موقع تھا کہ وہ اپنے مخالفین پر حملہ کریں۔'' (۲۹)

یہ کس قدر خلاف واقعہ بات ہے، علم الکلام اور الکلام ۱۹۰۳ء-۱۹۰۴ء میں لکھی گئیں۔ اس وقت علامہ شبلی حیدرآباد میں ناظم سررشتہ علوم وفنون تھے اور علماء سے بظاہر اس وقت تک کوئی مخالفت بھی نہیں تھی، چہ جائیکہ کفر کا فتویٰ۔ کفر کا فتویٰ تو ۱۹۱۳ء میں ندوہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے مولوی عبدالحق حقانی کے حواریوں نے لگایا تھا۔

سوانح مولانا روم بھی اسی سلسلہ کلامیہ کا حصہ ہے۔ اس کے بعد علامہ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر کا ذکر ہے۔ اس کے لکھنے کے اسباب اور اس کی اہمیت ومقبولیت بیان کی ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک نئی اطلاع دی ہے کہ موازنہ کی اشاعت کے وقت مرزا دبیر زندہ تھے۔ (۳۰) موازنہ انیس و دبیر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی اور مرزا دبیر کی تاریخ وفات ۷/ مارچ ۱۸۷۵ء ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی معلومات کس درجہ ناقص تھیں۔

اور بہت سے دبیریوں کی طرح مولوی عبدالرزاق کان پوری نے بھی یہ تنقید کی ہے کہ شبلی نے جس قدر انیس کو بڑھایا اسی قدر مرزا دبیر کو گرایا ہے، حالانکہ انصافاً مرزا صاحب اس کے مستحق نہ تھے۔ (۳۱) پھر مولوی صاحب نے ردالموازنہ اور المیز ان اور ان کے مصنفین اور ان کتابوں کی حیثیت وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہے مولوی صاحب نے جس اودھ کے فصحا کے مقابلہ میں شبلی اور ان کے وطن کی زباں کو کم تر گردانا تھا، اعتراف کرتے ہیں کہ موازنہ کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اردو کا ایک حرف بھی نہیں جانتے۔'' (۳۲)

شعرالعجم علامہ شبلی کی لاجواب کتاب ہے۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے بھی اسے لاجواب قرار دیا ہے، مگر اس طرح کہ شعرالعجم کی بنیاد براؤن کی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا پر ہے اور حالی کی حیات سعدی سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ طرز استدلال میں محمد حسین آزاد کی تقلید کی گئی ہے۔ اگرچہ مولانا نے فارسی شاعری کا جو تجزیہ کیا ہے، ان کا حصہ ہے مگر ان کے پیش نظر قیروانی کی کتاب العمدہ تھی۔ (۳۳) یعنی مولانا شبلی کا کچھ نہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولوی

صاحب علامہ شبلی کی کتابوں کی حیثیت پر کس طرح حملہ کرتے ہیں۔ کہاں براؤن اور کہاں شبلی۔ شبلی کا فارسی مذاق براؤن کہاں سے لاتے، اس کا اعتراف کئی اہل قلم نے کیا ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا، حیرت کی بات ہے کہ حالی کی حیات سعدی یعنی ایک سوانح عمری شعر العجم کا نمونہ بن گئی؟

اخیر میں سیرۃ النبیؐ کا ذکر ہے اور اسے جوش عقیدت کا نتیجہ قرار دیا اور بلا شبہ سیرۃ النبیؐ کی تصنیف میں شبلی جوش وجذبہ حب نبویؐ سے سرشار تھے۔

مولوی صاحب نے تصنیفات کے بعد تحریک ندوۃ العلما کی مختصر تاریخ لکھی ہے اور اس میں شبلی کا حصہ بھی دکھایا ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ تحریک ندوہ کے بالکل آغاز میں اپنی شمولیت کا بھی ذکر کیا ہے۔(۳۴) حالاں کہ تاریخ ندوہ میں ان کا کہیں نام بھی نہیں آتا۔

تحریک ندوہ اور اس کے اجلاسوں کی تاریخ بیان کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ عملی کارروائی میں سب سے زیادہ حصہ مولانا شبلی کا تھا۔(۳۵) پھر مولانا شبلی کی ندوہ کی معتمدی کا ذکر ہے اور مولانا کی ۹؍سالہ خدمات کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس بات پر افسوس کیا ہے کہ مولویوں کی مخالفت کی وجہ سے انھیں مستعفی ہونا پڑا۔(۳۶) اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق کے فتوئ کفر صادر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ ندوہ میں مولانا کی مخالفت کی بھی تفصیل پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''دوران معتمدی میں بھی مولانا کو بہت کوفت اٹھانا پڑی۔ خصوصاً وہ زمانہ جب شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری مدعی نظامت تھے اور بہار و بنگال سے رائے دہندہ لکھنؤ تک پہونچتے تھے، جس کی تفصیل قابل اظہار نہیں۔''(۳۷)

شبلی کے احباب کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ سرسید کی رفاقت، علی گڈھ کی پروفیسر، تصنیفات و تالیفات اور ان کی شہرت و مقبولیت اور سلسلہ آصفیہ میں ان کی شمولیت نے تمام ہندوستان کے اہل علم کو شبلی نے گرویدہ کر لیا تھا۔ مولوی عبدالرزاق صاحب نے ''مولانا شبلی کے احباب'' کی سرخی لگائی ہے اور لکھا ہے کہ وہ نازک مزاج تھے۔ ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے مخلص احباب کی تعداد قلیل ہے۔''(۳۸) حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔ ہاں ان کی مصروفیات

نے احباب بنانے کا موقع نہیں دیا۔صرف ۵۷رسال عمر پائی۔ ۱۹رسال کی عمرتحصیل علم میں گذاری۔ ذرا اندازہ لگائیں ۳۲رسال میں ۳۲رسے زاید کتابیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن ترقی اردو اورتحریک ندوہ کے علاوہ مختلف جلسوں میں شرکت، خط و کتابت، اعزہ و اقربا کی خبرگیری، مہمانوں کی آمد اور ان کا قیام حتی کہ خود مولوی عبدالرزاق کان پوری اور ان جیسے دوسرے اہل علم کی برابرعلی گڈھ آمد، ان کی تصنیفات کی تصحیح واصلاح، تلامذہ کی تربیت اوران کے مستقبل کی فکر، انھیں دوستی نبھانے کا موقع کب تھا۔ اور یہ تمام باتیں مولوی عبدالرزاق کان پوری کے علم میں تھیں۔

بہرحال حبیب الرحمٰن خاں شروانی، ابوالکلام آزاد اورمہدی افادی، مولوی عبدالرزاق کان پوری کی فہرست میں شبلی کے احباب ہیں، اس کے بعدانہوں نے بعض ناروا واقعات لکھے ہیں اور جو سب سے بڑا واقعہ لکھا ہے وہ ان کے رام لیلا دیکھنے کا ہے اوراس کو لکھنے میں اپنی ادبیت وانشاپردازی کی تمام صلاحیتیں لگادی ہیں۔ پھرایک کشمیری عورت کی تعریف وتحسین کا واقعہ لکھا ہے، اس موقع پرانہوں نے جواشعار سنائے اسے بھی نقل کیا ہے۔(۳۹)

اہل علم اورحیات شبلی پڑھنے والے واقف ہیں کہ علمی کاموں اور انتھک محنتوں کی وجہ سے مولانا شبلی کی صحت خراب ہوگئی تھی۔۱۹۰۴ء میں بیٹے اوراہلیہ کی وفات سے وہ بہت ملول اوردل برداشتہ ہوئے اوربقول مولانا آزاد کے اہلیہ کے انتقال پر دہاڑ مار مارکرروئے، لیکن دوسرے ہی دن مولانا آزادکو لےکرندوہ حاضر ہوگئے۔ وہ ہمیشہ ذاتی زندگی پرقومی معاملات ومسائل کوترجیح دیتے رہے۔ ۱۹۰۷ء میں ان کے پاؤں کا حادثہ ہوااورلکڑی کا پاؤں حیدرآباد میں بنا، اس سے انھیں چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔کمال ہے مولانا کے عزم وہمت کا کہ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک ایک دن بیٹھے ہوں۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے علامہ کی تیسری شادی کی خواہش اور پھر وہ عورت کیسی ہواس کی خوبیاں وغیرہ انہی کی زبانی بیان کی ہیں۔شبلی کے حبیب خاص تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اورمہدی افادی تھے، شبلی نے ان سے اس طرح باتیں نہیں کیں، اس کے لئے انہوں نے مولوی عبدالرزاق کان پوری کا انتخاب کیا؟ سچ یہ ہے کہ یہ تمام

باتیں مولوی صاحب کا ذہنی اختراع بلکہ تلبیسات کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں اور علامہ شبلی کو خود سے فروتر ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے علامہ شبلی کی زندگی اور ان کے معمولات سے متعلق متعدد باتیں اور واقعات قلم بند کئے ہیں اور سب میں کچھ نہ کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جن سے شبلی کی شخصیت کی نفی یا سطحیت ظاہر ہوتی ہے۔ کتابوں کی تحقیر اوپر گذر چکی ہے۔

انہوں نے سیر نہر کا ایک واقعہ سپرد قلم کیا ہے اور قدرے تفصیل سے اسے بیان کیا ہے کہ علامہ کانپور آئے، حاجی کفایت اللہ کے مہمان ہوئے اور پھر دریا کی سیر کا پروگرام بنا۔ تمام احباب جمع ہوئے ان میں صرف رحمت اللہ رعد کا نام لکھا ہے۔ کشتی دریا میں ڈالی گئی اور شعروشاعری کا دور شروع ہوا، یکا یک بارش آئی، دریا میں پانی بڑھ گیا، کشتی بے قابو ہوئی، کسی طرح سنبھالی گئی، اس تفصیل کے بعد لکھا ہے کہ اس موقع پر:

''مولانا نے جس قدر اشعار پڑھے، ان میں کوئی ایسا نہ تھا جو سمندر، دریا، ملاح، تلاطم کے الفاظ سے خالی ہو۔''(۴۰)

پھر ان کی غذا، ملازم، شیرینی کی پسندیدگی وغیرہ کی تفصیل اور ان سے امراض کا پیدا ہونا وغیرہ دکھایا ہے۔(۴۱)

طباعت میں نفاست اور اس کے لئے مطبع نامی کان پور کا انتخاب اور حسن طباعت کا خیال وغیرہ موضوعات پر انہوں نے داد دی ہے۔ اس سے الفاروق اور علم الکلام وغیرہ کے مطبع نامی میں طبع ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔

آخر میں ان کے مذاق شاعری کا تذکرہ ہے۔ صبح امید سے آخر وقت تک کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے، پھر اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ مرثیہ والد، مرثیہ اسحاق، مسجد کان پور کے قطعات اور بعض دوسری نظموں کے اشعار نقل کئے ہیں۔

شبلی کے اخیر دور کے واقعات بھی لکھے ہیں اور حادثات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس قدر واقف ہونے کے باوجود اس دور میں شبلی کے والد کی وفات کا ذکر کیا ہے حالانکہ ان کا سنہ ۱۹۰۰ء

میں انتقال ہو چکا تھا۔اس وقت یعنی ۱۹۱۳ء میں ان کے منجھلے بھائی مولوی اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کا انتقال ہوا تھا۔ بہرحال ان ذاتی سانحات نے بقول مولوی عبدالرزاق مولانا شبلی کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔(۴۲) اور وہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ان کے انتقال سے ہندوستان میں صف ماتم بچھ گئی۔اس موقع پر جو مراثی اور وفیاتی مضامین لکھے گئے ان کا ذکر کیا ہے پھر مولانا عبدالحلیم شرر کا پورا مضمون نقل کیا ہے۔(۴۳)

مولوی عبدالحلیم شرر خود معاصر شبلی تھے اور اہل حدیث بھی۔ جبکہ شبلی غالی حنفی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بھی شبلی پر بہت تنقیدیں کی ہیں، جن کے ذکر و مطالعے کا یہ موقع نہیں ہے، تاہم مولوی عبدالرزاق کان پوری نے یادایام میں اشاعت کے لئے مولوی عبدالحلیم شرر کے مضمون کو منتخب کیا ہے جس میں خود متعدد بے سروپا باتیں ہیں۔اس سے ان کی ذہنی کیفیت اور واضح ہوتی ہے۔اخیر میں ذاتی رائے کے عنوان سے کچھ اور باتیں بھی لکھی ہیں جو گذشتہ صفحات میں آچکی ہیں۔ یہاں ان کا ذکر اعادہ ہوگا۔ البتہ بعض اور الزامات بھی مضمون ختم کرتے کرتے عائد کردئے ہیں، جیسے سرسید کا فراخدلی سے ذکر نہ کرنا، حالانکہ انھیں کی بدولت شمس العلما بنے۔ دراصل مولوی عبدالرزاق کانپوری واقعات کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور صحیح استدلال کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔اسی طرح ان کا طریقہ تحریر بھی گنجلک اور بے ربط باتیں کہنے کا ہے۔

یادایام آپ بیتی کے طور پر لکھی گئی ہے اور شبلی کا تذکرہ دوست بن کر لکھا گیا ہے مگر جس قدر خرافات اس کتاب میں بیان ہوئے، وہ امین زبیری کی کتاب سے کم نہیں۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی اشاعت سے انکار کردیا تھا مگر ۱۹۴۸ء میں ان کی وفات پر سید صاحب نے جب خود ان کا تذکرہ لکھا تو انکار کے بجائے معذرت کا لفظ استعمال کیا اور ان کا اتنا شاندار تذکرہ لکھا کہ اپنی طبعی شرافت اور مروت اور وضع داری کا نمونہ قائم کردیا ہے۔ (۴۴) حالانکہ وہ ان کے استاد کے ایک بڑے ناقد تھے۔

مولوی عبدالرزاق کانپوری کا طرز تحریر انتہائی گنجلک ہے۔ بے ربط باتیں اور بغیر سیاق و سباق لکھنا اور قصہ گو کی طرح بات میں بات پیدا کرنا، سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا یہ وہی صاحب قلم

ہیں جن کے قلم سے البرامکہ جیسی معرکتہ الآرا کتاب نکلی تھی۔ شاید سلسلہ ہیروز آف اسلام کے مقابلہ میں سلسلہ وزرائے اسلام قائم کرنے کے بعد بھی وہ دوسرے شبلی نہ بن سکے جس کا قلق یاد ایام کے صفحات میں ہمدرد بن کر آ گیا ہے۔

حوالے

(۱) شورش کاشمیری، ابوا کلام، ص۵۱۲، دہلی، ۲۰۱۳ء

(۲) یاد ایام ص۱۸

(۳) یاد رفتگاں ص۳۵۷-۳۶۱

(۴) یاد ایام ص۲۰

(۵) ایضاً ص۱۹

(۶) ایضاً ص-۲

(۷) ایضاً ص۳۱-۳۲

(۸) ایضاً ص۴۶

(۹) ایضاً ص۴۷

(۱۰) ایضاً ص۴۷

(۱۱) ایضاً ص۴۷

(۱۲) ایضاً ص۴۷

(۱۳) ایضاً ص۴۹

(۱۴) ایضاً

(۱۵) ایضاً ص۵۱

(۱۶) یاد ایام ص۵۲

(۱۷) ایضاً ص۵۲

(۱۸) ایضاً ص۵۲

(۱۹) ایضاً ص۵۳

(۲۰) ایضاً ص۶۱

(۲۱) ایضاً ص۶۲

(۲۲) ایضاً ص۶۲

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً ص۶۲

(۲۵) ایضاً ص۶۲

(۲۶) ایضاً ص۶۳

(۲۷) ایضاً ص۶۴

(۲۸) ایضاً ص۶۴

(۲۹) ایضاً ص۶۵

(۳۰) ایضاً ص۶۶

(۳۱) ایضاً ص۶۶

(۳۲) ایضاً ص۶۶

(۳۳) ایضاً ص۶۷

(۳۴) ایضاً ص۶۸

(۳۵) ایضاً ص۷۰

(۳۶) ایضاً ص۷۳

(۳۷) ایضاً ص۷۴

(۳۸) ایضاً ص۷۴

(۳۹) ایضاً ص۷۴-۷۵

(۴۰) ایضاً ص ۷۷

(۴۱) ایضاً ص ۷۷

(۴۲) ایضاً ص ۸۲

(۴۳) ایضاً ص ۸۲-۸۶

(۴۴) یادرفتگاں ص ۳۵۷-۳۶۱

[۴]

تذکرہ طاہر

• نواب سید محمد علی حسن خاں

[ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جنوری تا جون ۱۹۳۷ء]

''تذکرہ طاہر'' نواب سید علی حسن خاں کی خودنوشت ہے۔ نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶-۱۹۳۶ء] محتاج تعارف نہیں۔ وہ نواب سید صدیق حسن خاں [۱۸۳۲-۱۸۹۰ء] کے صاحبزادے تھے۔ ۱۶؍اگست ۱۸۶۶ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ وہیں علماء و مشائخ سے تعلیم و تربیت ہوئی۔ تحصیل علم کے بعد ریاست بھوپال کے محکمہ تعلیمات کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ شعر و ادب کا بڑا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ اردو و فارسی دونوں میں دادسخن دیتے تھے۔ طاہر تخلص تھا۔ ان کا کلام معارف اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوتا تھا۔ ان کے فارسی و اردو کے دو مجموعہ کلام ''خرمن گل'' اور ''نالہ دل'' ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔ بقیہ کلام وفات کے بعد جون ۱۹۳۷ء کے معارف میں شائع ہوا۔

نواب سید علی حسن خاں ممتاز اہل قلم اور مصنف تھے۔ بڑی صاف ستھری نثر لکھتے تھے۔ ان کے قلم سے ۲۲ سے زیادہ کتابیں نکلیں۔ (۱) فطرۃ الاسلام اور مآثر صدیقی نے زیادہ شہرت پائی۔ بعض شعراء کے تذکرے بھی انہوں نے لکھے۔ آخر میں علم و ادب کے اساطین اور باکمالوں کے حالات ''مردم دیدہ'' کے نام سے لکھ رہے تھے مگر وہ پایہ تکمیل کو نہ پہونچ سکے۔

وہ بڑے نیک دل، پاک طینت اور پاکباز شخص تھے۔ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے معاونین میں تھے، سرسید سے خط و کتابت رہی۔ تحریک ندوہ میں

شریک رہے، بھوپال سے مستعفی ہوکر لکھنؤ آئے تو یہاں کی بعض کی علمی، ادبی اور فلاحی تنظیموں میں بھی حصہ لیا اور ان کی مالی مدد کی۔ مولوی سید عبدالحی حسنی کی وفات کے بعد ۱۹۲۳ء میں ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے۔

علامہ شبلی کے بے تکلف دوستوں بلکہ قدردانوں میں تھے اور خاص طور پر ان کے فضل و کمال کے بڑے معترف و مداح تھے۔ مآثر صدیقی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''علامہ ممدوح کی تالیف وتصنیف نے ارباب قلم کے لئے ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا اور اہل ہند میں تاریخی مذاق پیدا کر کے گویا ایک صلائے عام دیدی، اس لئے چند دنوں میں بہت سی سوانح عمریاں جمع و مرتب ہو کر مشتہر ہوگئیں اور تھوڑے عرصہ میں ایک عظیم الشان ذخیرہ تاریخی واقعات اور اسلاف کے حالات کا فراہم ہوگیا۔'' (۲)

نواب سید علی حسن خاں نے اپنے والد نواب صدیق حسن خاں کی مفصل سوانح عمری لکھی ہے جس کے چار حصے ۱۹۲۴ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئے۔ آخری حصہ میں اولادوں کے ذکر میں انہوں نے اپنی خودنوشت بھی لکھی ہے جو شائع نہ ہوسکی تھی کہ انہوں نے وفات پائی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے معارف میں قسط وار شائع کیا ہے۔ بظاہر خودنوشت مکمل نہیں معلوم ہوتی ہے، تاہم اس میں انہوں نے علامہ شبلی کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

نواب صاحب علامہ شبلی سے پہلے ان کی تصنیفات مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم اور المامون کے ذریعہ واقف ہوئے۔ المامون کی اشاعت نے مسلمانوں کے تاریخی مذاق میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جس وقت یہ شائع ہوئی نواب صاحب بھوپال میں تھے۔ بھوپال میں المامون کا کیا اثر ہوا نواب سید علی حسن خاں کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ وہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''اسی عرصہ میں حضرت مولانا شبلی کی کتاب المامون طبع ہوئی اور بھوپال میں خاص کر اس کتاب نے ایک عام ذوق تاریخ اسلام کے مطالعہ کا پیدا کر دیا اور جو مخالفت تحریک علی گڑھ اور سرسید سے عام طور پر برپا تھی اس کا

آہستہ آہستہ ازالہ صرف سلسلہ تصانیف علامہ شبلی و دیگر اسلامی تاریخی کتب کی اشاعت و عام مطالعہ سے ہوتا گیا۔'' (۳)

تصانیف شبلی سے متاثر ہو کر نواب سید علی حسن اور علامہ شبلی میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی سر سید کے ساتھ حیدر آباد سے واپس آ رہے تھے تو نواب صاحب کی کوشش سے بیگم بھوپال نے انہیں اپنا مہمان بنایا، اسی موقع پر دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی تفصیل انہوں نے خود نوشت میں لکھی ہے:

> ''حضرت علامہ سے اس عرصے میں خط و کتابت رہی اور بہ اصرار وہ بھوپال طلب کئے گئے۔ ان کی اول تشریف آوری سر سید کے حیدر آباد ڈیپوٹیشن کے موقع پر ہوئی۔ غریب خانہ نور محل میں ان کا قیام رہا اور یہیں انہوں نے اپنا وہ مشہور قصیدہ فارسی جس کا مقطع ہے:
>
> شہ نظام است و بز یبد کہ نظامی باشم
>
> طبع کرایا۔ اللہ، اللہ کیا پر لطف صحبتیں تھیں۔ قریباً تمام علما و شعرائے بھوپال سے مولانا کے علمی مباحث رہتے تھے۔'' (۴)

نواب سید علی حسن خاں بھوپال میں محکمہ تعلیمات کے افسر اعلیٰ تھے۔ اس زمانہ میں بھوپال کے مدارس بڑی بدنظمی اور ابتری کا شکار تھے۔ ان کی ترتیب و تنظیم اور اصلاح کے لئے نواب صاحب نے انجمن نظارۃ المعارف قائم کی جس میں علمائے بھوپال کے علاوہ علامہ شبلی اور مولانا ابراہیم آروی کو بھی شامل کیا۔ اس انجمن کے اجلاس سال میں دو مرتبہ ہوتے تھے۔ (۵) ان مدارس کے مجوزین نصاب میں بھی علامہ شبلی کا نام شامل ہے۔ (۶) چنانچہ علامہ شبلی نے بھوپال کے مدارس کا جائزہ لیا اور اس کا مفصل دستور العمل تیار کیا جو نواب سید علی حسن کے کاغذات میں سید صاحب کو مل گیا تھا، جسے انہوں نے حیات شبلی میں نقل کر دیا ہے۔ (۷) علامہ شبلی کے تیار کردہ دستور العمل پر مدارس میں عمل کیا گیا اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اس کی روداد سے علامہ شبلی کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے مسرت ظاہر کی۔ (۸)

علامہ شبلی مطالعہ کتب کے لئے متعدد بار ایشیا ٹک سوسائٹی کلکتہ گئے۔ خاص طور سے سیرت نبوی کی تالیف کے زمانہ میں انگریزی کتب کے لئے بار بار گئے۔ان کی علمی خدمات سے متاثر ہوکر ایشیا ٹک سوسائٹی نے ۱۸۹۵ء میں علامہ کو اپنا رکن نامزد کیا اور وہ اس کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ انہیں نے نواب سید علی حسن خاں کو اس کا رکن نامزد کرایا۔نواب صاحب لکھتے ہیں:

''اسی زمانہ میں حضرت شمس العلماء علامہ شبلی مرحوم نے ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کے سالانہ جلسہ میں میرے ممبر بنائے جانے کی تحریک کی اور مسٹر آرنلڈ پروفیسر علی گڑھ کالج نے تائید کی جو ممبروں کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔''(۹)

علامہ شبلی نے نواب سید علی حسن خاں کو نہ صرف ایشیا ٹک سوسائٹی کا رکن نامزد کرایا بلکہ ندوہ کا بھی رکن بنایا،نواب صاحب لکھتے ہیں:

''ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے آنے کے بعد حضرت علامہ شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے رکن بنائے جانے کی تحریک کی اور مجلس انتظامیہ نے مجھ کو منتخب کر کے رکن ہونے کی عزت بخشی۔ چنانچہ چند سال تک میں نے دلی جوش وتوجہ کے ساتھ ندوہ کی مذہبی تعلیمی خدمات میں حصہ لیا۔''(۱۰)

علامہ شبلی جس وقت حیدرآباد سے مستعفی ہوکر لکھنؤ آئے اور ندوہ کے معتمد تعلیم اور الندوہ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھنؤ میں قیام کیا،اس وقت نواب علی حسن خاں اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس میں مقیم تھے۔نواب صاحب ملاقات کے لئے ندوہ آتے اور اکثر گاڑی بھیج کر علامہ شبلی کو اپنی کوٹھی پر بلواتے اور بڑی ضیافتیں کرتے۔کئی بار انہوں نے نذرانے بھی پیش کرنے چاہے مگر غیور شبلی نے منع کردیا۔

نواب صاحب کا بڑا قیمتی کتب خانہ تھا۔علامہ شبلی کے کہنے پر انہوں نے ندوہ پر وقف کر

دیااوراپنی بہن صفیہ بیگم کا کتب خانہ بھی ندوہ ہی کو دیا۔ ۱۹۰۷ء میں علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ پیش آیا، اتفاقیہ بندوق چل جانے سے پاؤں زخمی ہوگیا تھا جو بالآخر الگ کر دیا گیا۔ اس موقع پر نواب صاحب مزاج پرسی کے لئے اعظم گڑھ تشریف لائے۔ اسی موقع پر انہوں نے یہ رباعی کہی تھی:

شبلی! ترے قوم پر بہت احساں ہیں
باتیں تری درد قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر
اس ایک قدم پہ لاکھ سر قرباں ہیں

جیسا کہ اوپر آچکا ہے نواب صاحب اراکین ندوہ میں ایک بڑے فعال شخص تھے۔ تعلیم و تربیت کے موضوع پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس پر وہ ایک رسالہ بھی لکھ چکے تھے۔ ندوہ میں وہ اصلاح نصاب کے حامیوں میں تھے۔ ندوہ کے اختلافات طے کرنے کے لئے جو اصلاحی کمیٹی بنی تھی نواب صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے اصلاح ندوہ کے لئے بڑی جدو جہد کی۔ اس سلسلہ کی تفصیل انہوں نے خودنوشت میں لکھی ہے۔ اصلاح ندوہ کی اہمیت وضرورت واضح کرنے کے ساتھ جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اختلاف و نزاع کی اگر چہ انہوں نے تفصیل قلم بند نہیں کی ہے مگر مصالحت کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور حکیم اجمل خاں وغیرہ نے اجلاس دہلی میں جو مساعی و کوشش کی ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ البتہ مخالفین شبلی کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی کا ذکر اس طرح ہے کہ:

''مولانا عبدالحی صاحب مرحوم ناظم سابق ندوۃ العلما عہدہ نظامت کو قبول فرما کر رفع نزاع میں کوشش نہ فرماتے تو تمام سعی و جدو جہد رائیگاں جاتی۔''(۱۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ندوہ میں علم وفضل میں علامہ شبلی کا کوئی مدمقابل نہ

تھا،نواب علی حسن خاں نے بھی علامہ شبلی کا ذکر اسی انداز میں کیا ہے اور انہیں مصلح حکیم، مرشد خبیر اور قتیل ندوہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ جو معاملہ ہوا اسے بد بختانہ عمل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اب میں اس تذکرہ کو اس مصلح حکیم اور مرشد خبیر کے ذکر و دعا پر ختم کرتا ہوں جس کو ندوہ کے ساتھ روح و جسد کا سا تعلق رہا ہے۔جس نے اپنی زندگی کی بہترین فرصتوں اور قوتوں کو ندوہ کی راہ میں وقف کر رکھا تھا۔جس کی فکر حکیم اور رائے مستقیم نے قیام دارالعلوم اور اصلاح نصاب کو اصلاح دینی کا اصل و اساس سمجھ کر سب سے پہلے اس عمل جلیل کی بنیاد ڈالی اور احیائے امت مرحومہ کی جس حقیقت کبری کو باوجود محسوس کرنے کے حکیم الامۃ جمال الدین اسدآبادی اور مفتی محمد عبدہ مرحوم عمل میں نہ لا سکے، اس کو حضرت علامہ شبلی مرحوم نے عملاً نمایاں کر کے دکھایا۔مگر افسوس ہے کہ بایں ہمہ بدبختانہ طور پر ندوۃ العلما اس کے فیض بخشی حیات سے محروم رہا اور اس قتیل ندوہ اور فدائے اصلاح دینی کے خدمات عظیمہ سے مستفید نہ ہوسکا۔'' (۱۲)

علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہوئے تو انہوں نے بھی استعفیٰ دیدیا۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد جب ندوہ میں مصالحت ہوگئی تو نواب صاحب پھر ندوہ سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۱۵ء کے ندوہ کے اجلاس میں علامہ کی خدمات کے اعتراف میں کتب خانہ کی ایک عمارت تعمیر کر کے اسے علامہ شبلی کے نام موسوم کرنے کی قرارداد انہیں نے پیش کی تھی جو متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ (۱۳) جس پر برسوں بعد عمل کیا گیا۔

حوالے

(۱) معارف مئی ۱۹۳۷ء ص ۳۷۲

(۲) مآثر صدیقی حصہ اول ص ۵

(۳) معارف اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۸۴

(۴) ایضاً

(۵) معارف مارچ ۱۹۳۷ء ص ۲۰۹

(۶) ایضاً

(۷) حیات شبلی ص ۳۳۹-۳۴۴

(۸) ایضاً ص ۳۴۵

(۹) ماہنامہ معارف اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۸۶

(۱۰) ماہنامہ معارف مئی ۱۹۳۷ء ص ۳۶۷

(۱۱) ایضاً ص ۳۷۱

(۱۲) ایضاً ص ۳۷۱

(۱۳) تاریخ ندوۃ العلما حصہ دوم ص ۱۱۴

[۵]

میری کہانی میری زبانی

• سید ہمایوں مرزا

[شمس المطابع، شاہی روڈ حیدرآباد دکن، طبع اول، ۱۹۳۹ء]

سید ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا [۱۸۷۰-۱۹۳۸ء] کا شمار حیدرآباد کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ وہ ماہر قانون داں، ادیب، شاعر اور عوامی خدمت گذار تھے۔ مشہور شاعر سید الفت حسین فریاد کے فرزند تھے۔ پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک کا سفر کیا اور بیرسٹر ایٹ لا کی سند لی۔ وہ نہایت شریف اور عظیم آباد کی راویتوں کی یادگار تھے۔ تحصیل علم کے بعد کچھ دنوں تک کلکتہ میں رہے بعد ازاں حیدرآباد کا رخ کیا اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ ہمایوں نگر حیدرآباد میں ان کا شاندار مقبرہ ان کی اہلیہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا [۱۸۸۴-۱۹۷۴ء] نے تعمیر کرایا ہے۔

سید ہمایوں مرزا نے اگرچہ وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور بڑی عزت وشہرت اور ناموری حاصل کی، باوجود اس کے کاغذ اور قلم سے بھی اپنا رشتہ ہمیشہ رکھا۔ ان کے قلم سے کرشمہ تقدیر، شاہ راہ نجات، گلشن ترنم، اسوۂ حسین، آثار صنادید دکن، مختصر حالات ابن رشد [۱۹۲۳ء] جیسی کتابیں نکل کر شائع ہوئیں۔

وہ اچھے شاعر تھے، حقیر تخلص تھا۔ ان کا دیوان چمنستان فصاحت اور ان کی خودنوشت میری کہانی میری زبانی اور بعض دوسری کتابیں ان کی اہلیہ بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا حیا نے بڑے اہتمام سے شائع کیں۔ وہ خود بہت باذوق ادیبہ، خطیبہ، شاعرہ اور مصنفہ تھیں۔ ان کی تعلیم گھر پر

ہوئی تھی، تاہم وہ ایک پختہ مشق اہل قلم تھیں۔ خواتین کے رسائل میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ مضامین کا ایک مجموعہ مقالات صغریٰ شائع ہو چکا ہے۔ انہوں نے مختلف ممالک یورپ، عراق، عرب اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے سفر کئے اور ان کے سفرنامے لکھے۔ ایک درجن سے زیادہ کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ چند کے نام یہ ہے:

تحریر النساء [۱۹۰۹ء]، سرگذشت ہاجرہ [۱۹۳۰ء]، میرے موسومہ خطوط [۱۹۵۱ء]، مجموعہ نصائح حصہ اول [۱۹۲۱ء]، راز و نیاز [۱۹۳۳ء]، سفر یورپ، مشیر نسواں، سفرنامہ عراق، سفرنامہ پونہ و مدراس، سیر بہار و بنگال، مختصر حالات بی بی فاطمہؓ، رہبر کشمیر، بی بی طوری کا خواب [۱۹۵۲ء] وغیرہ۔

سید ہمایوں مرزا کے علامہ شبلی سے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ یہ تعلقات کب قائم ہوئے اس کا تعیین مشکل ہے، تاہم ان کے نام علامہ شبلی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلقات ۱۸۹۸ء سے پہلے قائم ہو چکے تھے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے دو رقعے ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ تھے جو ماہنامہ سب رس حیدرآباد جنوری ۱۹۴۰ء [ص ۱۵۳] میں شائع ہو گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ۱۸۹۸ء میں دونوں میں بڑی بے تکلفی تھی۔ ایک رقعہ یہ ہے:

''مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں اگر آپ کے سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلئے۔

شبلی

۱۹/اکتوبر ۱۸۹۸ء'' (۱)

ان کی خودنوشت میری کہانی میری زبانی سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں گہرے مراسم تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حیدرآباد میں دونوں کی رہائش بھی متصل تھی۔ آپ بیتی کے صفحہ ۲۵۹ پر علامہ شبلی کا پہلی بار وہاں ذکر آیا ہے، جہاں حیدرآباد میں مرزا صاحب نے سفارش پر عہدے ملنے کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کی مثالیں دی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مولوی سید مرتضیٰ فلسفی کے لئے محکمہ علوم وفنون قائم ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی شبلی نعمانی کو کوئی خدمت دینی تھی تو فلسفی مرحوم کی جگہ مولوی شبلی کو دی گئی اور فلسفی صاحب جو قانون سے نابلد تھے، عدالت دیوانی وفوجداری کے ناظم بنائے گئے۔ یہ دونوں غیر ملکی تھے۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں، یہ لوگ کسی فن کے یا علم کے ماہر عالم بھی تھے۔ یہاں سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں ''پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔''(۲)

سید ہمایوں مرزا نے لکھا ہے کہ ان کے مشورہ سے وکلا نے ایک انجمن افتخار دکن قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو درست کرنا تھا۔ اس کے ماہانہ جلسے پابندی سے منعقد ہوتے تھے جس میں علامہ شبلی بھی شرکت کرتے تھے۔ اس وقت علامہ شبلی وہاں [حیدرآباد] ناظم سررشتہ علوم وفنون تھے اور سید ہمایوں مرزا کے مکان کے قریب ہی ان کی رہائش تھی۔ مولانا ظفر علی خاں بھی قریب ہی ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ بھی ان جلسوں میں شریک ہوتے۔ ان جلسوں کی صدارت سید ہمایوں مرزا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا ظفر علی خاں نے کھڑے ہوکر صدارت کے لئے علامہ شبلی کا نام پیش کیا، مگر مولانا شبلی نے کہا کہ سید ہمایوں مرزا کی موجودگی میں، میں اپنے تئیں اس کا اہل نہیں سمجھتا ہوں اور صدارت قبول نہیں کی۔ سید ہمایوں مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''واضح ہو کہ مسٹر ظفر علی خاں نے جبکہ شبلی صاحب علی گڑھ کالج میں عربی پڑھاتے تھے۔ ان سے پڑھا تھا تو حق شاگردی ادا کیا۔''(۳)

اس خودنوشت میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی عزیز مرزا جب ہوم سکریٹری ہوئے تو انہوں نے ناظم سررشتہ علوم وفنون مولوی سید مرتضیٰ فلسفی کو ہٹا کر کریم نگر دیوانی کا ناظم بنادیا اور ان کی جگہ پر علامہ شبلی کو مقرر کر دیا۔(۴)

سید ہمایوں مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''شبلی صاحب نے اس زمانہ میں اپنے مکان میں اس غرض سے کئی جلسے کئے کہ انجمن ترقی اردو قائم کی جائے اور وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس کے تحت کردی جائے۔ دو یا تین جلسے ان کے مکان میں ہوئے اور ہر بار انہوں نے مجھے صدر بنایا۔ مختصر سا جلسہ ہوتا تھا۔ شرکاء میں مولوی عبدالغنی وارثی مرحوم سابق مددگار صدر محاسب، عبدالغفور خاں، مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم اور مرزا سجاد بیگ وغیرہ شریک ہوتے۔''(۵)

علامہ شبلی جنوری ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نامزد ہوئے۔ چنانچہ اردو کی ترقی کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی جس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔(۶) البتہ اس میں ان جلسوں کا ذکر نہیں ہے، جو علامہ شبلی نے اپنے مکان حیدرآباد میں منعقد کئے تھے۔ ان کا علم اسی خودنوشت سے ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کون لوگ شریک ہوتے تھے۔ البتہ سید ہمایوں مرزا نے عدم معلومات کی وجہ سے یہ لکھا ہے کہ علامہ نے انجمن کو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے تحت کرنے کی غرض سے جلسے کئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو ایجوکیشنل کانفرنس ہی کا ایک شعبہ تھی۔

سید ہمایوں مرزا لکھتے ہے:

''حیدرآباد سے جو مولوی شبلی جا چکے تو مولوی عزیز مرزا ضلع بیڑ کی تعلقہ داری سے رکن ہائی کورٹ کئے گئے اور وہ اس حیثیت سے حیدرآباد آئے۔ انہوں نے نظام کلب میں کئی جلسے انجمن ترقی اردو کے قیام کے متعلق منعقد کئے تھے۔ نہیں معلوم پھر انجمن کیونکر قائم ہوئی اور مولوی عبدالحق کے تحت کیونکر آ گئی اور اس کے اراکین کون کون ہیں۔''(۷)

علامہ شبلی نے دربار کی ریشہ دوانیوں بلکہ سازشوں سے تنگ آ کر حیدرآباد کو فروری ۱۹۰۵ء میں خیر باد کہہ دیا تھا۔ ریشہ دوانیاں کیا تھیں اور کیونکر حالات ناسازگار ہوئے اس کی تفصیل کسی قدر حیات شبلی میں درج ہے، البتہ اس میں کون لوگ شامل تھے، اس کی نشاندہی سید ہمایوں مرزا کی خودنوشت سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کا محکمہ (سررشتہ علوم وفنون) اس لئے برخواست کیا گیا کہ

سر کسون واکر نے ایک کمیشن قائم کیا،ممبروں میں مولوی میر افضل حسین سابق
چیف جسٹس وسید احمد سابق مددگار محاسبی تھے۔ان کی رپورٹ کی بنا پر کہ محکمہ
بےضرورت ہے برخواست کیا گیا۔''(۸)

۱۹۱۳ء میں ندوہ سے مستعفی ہوکر علامہ شبلی نے حیدرآباد کا سفر کیا اور سید ہمایوں مرزا کے مہمان ہوئے اور ان کے مکان ہمایوں منزل میں ایک ماہ قیام کیا۔۱۸۹۶ء میں سر وقارالامراء کی کوششوں سے علامہ شبلی کا جو سو روپیہ وظیفہ مقرر ہوا تھا، اس میں عمادالملک سید حسین بلگرامی کی کوششوں سے دوسو روپئے کا اضافہ ہوا۔مرزا صاحب نے اس اضافہ کی رقم تین سو لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ چونکہ یہ اضافہ ہمایوں منزل کے قیام میں ہوا اس لئے مرزا صاحب نے اس مکان کو مبارک قرار دیا ہے۔(۹)

سید ہمایوں مرزا کا درج ذیل اقتباس اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں علامہ شبلی کے حوالہ سے بعض نئی باتوں کا علم ہوتا ہے جس کا ذکر اب تک راقم کو کہیں اور نہیں ملا۔وہ لکھتے ہیں:

''اس غرض سے یہ اضافہ ہوا تھا کہ شبلی صاحب سیرۃ النبیؐ لکھ رہے تھے۔بھوپال سے بھی ماہانہ پانچ سو مقرر ہوئے تھے اور سیرۃ النبیؐ کتاب ایسی لکھی کہ تمام فرقہ امامیہ کو اپنا مخالف و منحرف کر دیا۔

خان بہادر مولانا اولاد حیدر صاحب نے بعد کو آخر پانچ جلدوں میں ''اسوۃ الرسولؐ '' کتاب لکھی۔تاریخی حیثیت سے دونوں کا مقابلہ کرنے سے قدر و محبت دونوں کتابوں کی معلوم ہوجاتی ہے۔مولانا مرتضیٰ حسین صاحب مولوی شبلی کی سیرۃ النبیؐ کے خاص مقامات کے جوابات ایک ضخیم تالیف کے ذریعہ سے دئے ہیں، وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔اس کتاب کا نام التکمیل ہے۔''(۱۰)

مولانا اولاد حیدر کی کتاب اسوۃ الرسولؐ پانچ نہیں چار جلدوں پر مشتمل ہے اور آگرہ

سے شائع ہوئی ہے، اس کی ایک تلخیص بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کا مقدمہ ۲۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ البتہ التکمیل راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ یہ دونوں کتابیں سیرۃ النبیؐ کے رد میں لکھی گئی ہیں۔ سید ہمایوں مرزا شیعہ تھے، اس لئے ان کی تحریر سے ان کا جھکاؤ مولانا اولاد حیدر اور مولانا مرتضٰی کی طرف محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال سیرت النبیؐ کے مقابلہ میں اسوۃ الرسول اور جواب میں التکمیل کے لکھے جانے کا پہلی بار علم ہوا۔ اس کا کہیں اور ذکر نہیں ملتا ہے۔

بیگم بھوپال نے سیرۃ النبیؐ کے لئے پانچ سو نہیں دو سو روپئے کا وظیفہ مقرر کیا تھا۔ مرزا صاحب کو اس کی صحیح اطلاع نہیں تھی۔

غرض ''میری کہانی میری زبانی'' سے علامہ شبلی کے قیام حیدرآباد کے زمانہ کی مذکورہ چند نئی معلومات سامنے آتی ہیں۔

حوالے

(۱) مکتوبات شبلی ص ۱۵۳

(۲) میری کہانی میری زبانی ص ۲۵۹

(۳) ایضاً ص ۳۰۱-۳۰۲

(۴) ایضاً ص ۳۰۱

(۵) ایضاً ص ۳۰۲

(۶) حیات شبلی ص ۴۰۲

(۷) میری کہانی میری زبانی ص ۳۰۲

(۸) ایضاً ص ۳۰۲

(۹) ایضاً ۳۰۲

(۱۰) ایضاً ص ۳۰۲-۳۰۳

(تصویر: شیخ محمد عبداللہ)

[۶]

مشاہدات وتاثرات

• شیخ محمد عبداللہ

[قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی، ۲۰۱۵ء]

شیخ محمد عبداللہ پاپا میاں [۱۸۷۴-۱۹۶۵ء] کا شمار سرسید تحریک کے ممتاز اشخاص میں ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۹۱ء میں ۱۷ سال کی عمر میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے اور بی اے، ال ال بی کی اسناد حاصل کیں۔ ان کا بڑا کارنامہ تعلیم نسواں کے لئے جدوجہد ہے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم نسواں کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے لئے کانفرنسیں منعقد کیں۔ اسی مقصد کی حصولیابی کے لئے ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے رسالہ خاتون جاری کیا اور دس برس تک اس کی ادارت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم کے لئے علی گڑھ ہی کو مرکز بنا کر اسکول قائم کیا۔ یہی اسکول ہے جو آج مسلم یونیورسٹی کا ویمنس کالج کہلاتا ہے جس سے ہزاروں تشنگان علم خواتین سیراب ہو رہی ہیں۔ شیخ عبداللہ نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۹۶۵ء میں وفات پائی۔

شیخ محمد عبداللہ ایک ممتاز اہل قلم بھی تھے اور بڑی پختہ نثر لکھتے تھے۔ انہوں نے بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ سرسید اور شبلی پر ان کے مضامین خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین کا انتخاب دو جلدوں میں ''مضامین شیخ عبداللہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ خاتون کی ادارت کے زمانہ میں ان کے اداریے خاص طور پر مقبول تھے۔ ان کے علاوہ سرسید اور شبلی و سلیمان سے متاثر ہو کر انہوں نے سیرت پر ایک کتاب خاتم الانبیاء لکھی ہے، جو ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ

سے شائع ہوئی۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کی سوانح عمری عبداللہ بیگم بھی لکھی ہے۔ سب سے آخر میں انہوں نے اپنی خودنوشت مشاہدات وتاثرات قلم بند کی جوان کی وفات کے چار سال بعد ۱۹۶۹ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ پہلا ایڈیشن شیخ عبداللہ کی صاحبزادی اور ویمنس کالج کی پرنسپل ممتاز جہاں نے شائع کرایا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن اطہر صدیقی کی ترتیب وتدوین کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ یہی اشاعت راقم کے پیش نظر ہے۔

شیخ محمد عبداللہ علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ کالج میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، مولانا ظفر علی خاں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین ان کے احباب میں تھے۔ علی گڑھ میں انہوں نے سرسید اور نواب محسن الملک کا زمانہ پایا۔ گویا علی گڑھ کالج کے دور اول کی تاریخ اور واقعات وشخصیات کا بچشم خود انہوں نے مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ اپنی خودنوشت میں انہوں نے اپنی طالب علمی سے لے کر خودنوشت لکھنے تک کی ہندوستان کی ادبی، تاریخی اور تہذیبی تاریخ سپرد قلم کی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ آپ بیتی کم جگ بیتی زیادہ ہے۔ خاص طور پر علی گڑھ کے ابتدائی زمانہ کی صحیح اور سچی تاریخ اس میں آ گئی ہے۔ علی گڑھ کے دور آغاز وشباب کی تاریخ، سرسید اور اس دور کے دوسرے ارباب حل وعقد کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جن لوگوں نے دیوانہ وار علی گڑھ کالج اور سرسید تحریک کے لئے قربانیاں دیں، ان کا ذکر بھی کسی نہ کسی نوع سے آ گیا ہے۔ چونکہ علامہ شبلی ان کے استاد تھے اور علی گڑھ کالج کی ابتدائی تاریخ کا ایک اہم حصہ تھے، بلکہ ایک زمانہ میں ان کا شمار سرسید کے پہلوانوں میں ہوتا تھا اور کالج کی تمام پر رونق محفلوں کی وہ جان تھے۔ نظمیں پڑھتے، قصیدے پیش کرتے، تقریریں کرتے اور ہر جگہ نمایاں رہتے۔ علی گڑھ کالج کو ترقی دینے کے لئے سرسید نے جو پلے کیا تھا جسے قومی تھیٹر کا نام دیا جاتا ہے، اس قومی تھیٹر کے ایک کردار علامہ شبلی بھی تھے اور سچ یہ ہے کہ اپنے قصیدے سے انہوں نے اس تھیٹر میں ایک نئی جان پیدا کر دی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ علی گڑھ کی ابتدائی تاریخ بغیر شبلی کے ذکر مکمل نہیں قرار دی جا سکتی۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ کالج میں پیر پیکدہ یعنی سرسید کے بعد سب سے جامع ہستی شبلی ہی کی تھی۔

شیخ محمد عبداللہ نے مشاہدات وتاثرات لکھنے سے پہلے اپنے استاذ علامہ شبلی پر ایک جامع مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے علامہ کی شخصیت اور کارناموں کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی کے بعض واقعات لکھے ہیں اور اپنے استاذ کا ذکر بڑے ادب واحترام سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولانا نہایت ہی خوش اخلاق اور زندہ دل بزرگ تھے۔ طالب علموں سے نہایت بے تکلفی سے اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کا طریقہ گفتگو نہایت موثر تھا۔

اس مضمون میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ علامہ شبلی نے ندوۃ العلما کے لئے جو قواعد وضوابط مرتب کئے تھے، شیخ عبداللہ نے ان کے مرتب کرنے میں اپنے استاذ کی مدد کی تھی۔ یہ قواعد وضوابط علامہ شبلی نے دہلی میں اجمیری دوازے کی مسجد میں بیٹھ کر مرتب کئے تھے۔

یہ مضمون ''مضامین شیخ محمد عبداللہ'' میں شامل ہے۔ یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔ یہ تفصیل مجھے ڈاکٹر راحت ابرار سابق ایڈیٹر فکر ونظر علی گڑھ نے فراہم کی ہے۔

شیخ محمد عبداللہ نے مشاہدات وتاثرات میں شبلی کے اپنے استاذ ہونے اور جامع کمالات ہونے کا ذکر ایک سے زاید بار کیا ہے۔ جہاں اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ:

''شمس العلماء مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کے لٹریچر میں اس قدر زبردست اضافہ کیا کہ اور کسی ہندوستانی مصنف نے اس قدر اضافہ نہیں کیا ہے۔ مولانا مرحوم مغفور کی سیرت اور الفاروق اور المامون کے حالات، کتب خانہ اسکندریہ بہت مقبول تصنیفات ہیں۔''(۱)

شیخ عبداللہ مولانا شبلی کے درس قرآن میں بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت سب سے اول کالج کا وقت شروع ہونے سے قبل سب جماعتوں کے طالب اسٹریچی ہال میں یا کسی اور بڑے ہال میں جمع ہو جاتے تھے اور وہاں مولانا شبلی صاحب خوش الحانی کے ساتھ قرآن پاک کے کسی رکوع کی تلاوت فرماتے تھے اور ترجمہ کر کے ہم لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ اتنے میں گھنٹی ہو جاتی اور ہم سب لوگ اپنی اپنی کلاس

میں چلے جاتے تھے۔''(۲)

علی گڑھ میں علامہ شبلی کے درس قرآن کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور اس زمانہ کے تقریباً تمام طلبہ نے اس میں شرکت کی۔مولانا محمد علی جوہر نے اپنی انگریزی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میرا قرآن پاک کا ذوق مولانا شبلی کے درس قرآن کا مرہون منت ہے۔غالبًا اسی درس قرآن جس میں علامہ شبلی ترجمہ وتشریح بھی کرتے تھے۔ان کو قرآن پاک کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے قرآن پاک کے ترجمہ کرنے کا خیال سرسید کی ایک مجلس میں پیش کیا۔اس کی تفصیل شیخ عبداللہ کے قلم سے ملاحظہ ہو۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ میری موجودگی میں انہوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں قرآن شریف کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔سرسید نے فرمایا کہ ہمیں پوربی اردو میں کسی ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔اسی وقت سید راس مسعود جن کی عمر سات آٹھ سال کی تھی وہ کھل کھلا کر ہنستے ہوئے باہر سے آئے اور کہا کہ ''ہم باہر کھیل رہے تھے اور درخت کے پیچھے چھپ گئے اور اماں سمجھیں ہم کھو گئے، خوب چاروں طرف ڈھونڈیا پڑی۔ہم درخت کی آڑ سے نکل آئے تو اماں خوش ہو گئیں۔''مولانا شبلی مرحوم نے کہا کہ مسعود ہم کو بھی اردو سکھا دو۔راس مسعود نے پوچھا کہ آپ اردو نہیں بولتے تو کیا بولتے ہیں۔مولانا نے فرمایا کہ ہم تو پوربی اردو بولتے ہیں۔راس مسعود ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔''(۳)

علامہ شبلی قیام علی گڑھ کے زمانہ میں سرسید کے بہت قریب رہے۔عمر میں ان سے چالیس سال چھوٹے ہونے کے باوجود ان کی علمی مجلسوں کا حصہ رہے۔اس کا ذکر متعدد اہل قلم نے کیا ہے۔مولانا عبدالحلیم شرر اور عبدالرزاق کانپوری نے بھی اس کی تفصیل لکھی ہے۔شیخ عبداللہ نے بھی ضمناً ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سرسید دن کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرتے تھے اور پھر تصنیف وتالیف کی میز پر بیٹھ جاتے تھے۔اس وقت شمس العلما مولانا شبلی اور

مولوی وحیدالدین سلیم اور چند اور بزرگوں کو بھی سرسید کی تصنیف کی میز کے
گرد بیٹھا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سرسید اکثر مسائل پر اپنے
احباب سے جو اس وقت موجود ہوتے تھے بعض وقت بحث بھی کیا کرتے تھے
اوران کی رائے طلب کرتے تھے۔''(۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم مغفور میں قابلیت تو بہت تھی لیکن ان کی قابلیت میں
روح پھونکنے والے سرسید احمد خاں مرحوم تھے۔ مولانا مرحوم سرسید کی کوٹھی
کے قریب ایک چھوٹی سی بنگلیہ میں رہا کرتے تھے اور اکثر میں نے ان کو
سرسید کی محفل میں حاضر پایا۔''(۵)

بلاشبہ مولوی شبلی کو علامہ شبلی سرسید کی ذات نے بنایا اور انہیں کے زیر اثر انہوں نے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دئے اور ان کی شہرت ایک عالم و مصنف کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں پھیلی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ سرسید کی قربت ایک سے بڑھ کر ایک اہل علم اور قابل لوگوں کو حاصل ہوئی مگر ان میں کوئی علامہ شبلی نہ بن سکا۔ یہاں ایک اور دلچسپ بات یاد آ گئی، سید جالب دہلوی[۱۸۷۴-۱۹۳۰ء] سرسید کے رشتہ دار تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شبلی کو کچھ لوگ مولانا شبلی اور کچھ لوگ مولوی شبلی کہتے تھے۔ جو لوگ مولوی شبلی کہتے تھے بقول جالب دہلوی ان کا خیال تھا کہ:

''تہذیب الاخلاق میں مذہبی امور پر سرسید جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں
مذہبی کتب کے حوالے علامہ شبلی مغفور ان کو تلاش کر کے دیتے ہیں، حالانکہ اس
واقعہ کی کوئی اصلیت نہیں، مگر سرسید مرحوم کے دہلی کے اکثر اعزہ و احباب اسی
غلط فہمی میں مبتلا تھے اور مولانا شبلی مرحوم سے ناحق بدگمانی رکھتے تھے۔''(۶)

دہلی میں علامہ شبلی کے متعلق ایک عرصہ تک لوگوں کی رائے اچھی نہیں رہی۔ خانوادہ سرسید کا حال اوپر گذرا، دوسرا حلقہ خواجہ حسن نظامی کا تھا جو علامہ شبلی سے تمام تر تعلق کے باوجود انہیں تصوف مخالف سمجھتا تھا اور دور آخر میں مولانا عبدالحق حقانی جن کی تمام تر سرگرمیوں کا محور

دہلی تھی انہیں کے حواریوں نے علامہ پر کفر کا فتویٰ جاری کیا تھا۔

سرسید کے مذہبی افکار سے علماء کو ہمیشہ اختلاف رہا اور آج بھی ہے۔ علامہ شبلی بھی ان کے بعض مذہبی افکار کو ناپسند کرتے تھے، مگر شیخ عبداللہ نے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

مشاہدات وتاثرات میں متفرق مقامات پر علامہ شبلی کا ذکر تو ہے، ہی ایک مقام پر مستقل تذکرہ ہے، جس میں انہوں نے پہلے کالج سے وابستہ مولوی خلیل احمد اور مولانا عباس حسین کا مختصراً ذکر کیا ہے، پھر قدرے تفصیل سے مولانا شبلی کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

> ''تیسرے مولانا شبلی صاحب تھے جنہوں نے متعدد کتابیں اردو زبان میں بڑی تحقیقات اور انتظام سے لکھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کتاب سیرت ہے، یعنی آنحضرت ﷺ ''بانی مذہب اسلام'' کی سیرت پر جو انہوں نے کتاب لکھی وہ علی گڑھ سے جانے کے بعد لکھی۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے وہ فقط دو جلد لکھ پائے تھے کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔............مولانا شبلی مرحوم نے اور بھی اچھی اچھی کتابیں لکھیں لیکن وہ سب عرب کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے واقعات کے متعلق چھوٹے چھوٹے مضامین ہمیشہ لکھتے رہتے تھے۔ الفاروق ان کی بہت مستند ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات دیکھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی گڑھ نے سرسید علیہ الرحمہ کے بعد ایک ایسا مصنف پیدا کیا تھا جن کا شمار مصنفین کے گروہ میں صف اول میں رکھنے کے قابل ہے۔''(۷)

اس کے بعد شیخ عبداللہ نے علامہ شبلی کے علم وفضل، ترکی کے سفر، پروفیسر آرنلڈ کی ہمراہی، جہاز ڈوبنے کی خبر اور پروفیسر آرنلڈ کا اطمینان وسکون، اور پھر واپسی وغیرہ کی تفصیل لکھی ہے۔ ترکی سے واپسی پر کالج میں ایک شاندار استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی تھی، اس تقریب کا ذکر علامہ شبلی کے متعدد سوانح نگاروں نے کیا ہے۔ شیخ عبداللہ اس تقریب میں شریک تھے۔ ان کی زبانی اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی جب ٹرکی سے واپس تشریف لائے تو سرسید، ٹرسٹیوں اور ممبران اسٹاف اور طلبہ نے ان کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ ہم طالب علموں نے ان کو ایک بڑا ڈنر دیا، جس میں علاوہ اسٹاف کے علی گڑھ کے سر برآوردہ اشخاص کو مدعو کیا۔ مولانا نے فارسی میں ایک نظم پڑھی جس کا مقطع ''ہمانست کی بود'' تھا، یعنی جب میں آیا تو ہر چیز جیسی تھی ویسی ہی دیکھی۔'' (۸)

علامہ شبلی کے علی گڑھ سے ترک تعلق کے اسباب کے ذکر میں بعض اہل قلم نے پرنسپل مسٹر بیک سے ناچاقی بتائی ہے مگر شیخ عبداللہ کی تحریر سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی سرسید کی زندگی میں ملازمت سے علاحدگی چاہتے تھے، لیکن مسٹر بیک نے سرسید سے کہا کہ مولانا موصوف ایک قابل مصنف آدمی ہیں۔ ایسے آدمیوں کا کالج میں رہنا بہت ضروری ہے۔ آپ ان سے کہیے کہ یہ کالج سے علاحدگی نہ اختیار کریں۔ یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے علاحدہ ہوکر تصنیف و تالیف کا کام کروں گا، ہمیں موقع دینا چاہئے کہ یہ تصنیف کا کام بھی کریں اور کالج سے بھی تعلقات قائم رہیں۔ سرسید نے فرمایا کہ مجھے منظور ہے اور میں ان سے کہوں گا۔ چنانچہ تجویز ہوا کہ مولانا شبلی چھ ماہ کالج میں کام کریں اور باقی چھ ماہ ان کو پوری تنخواہ پر رخصت مل جایا کرے گی۔ یہ مجھ کو یاد نہیں رہا کہ مولانا شبلی نے اس تجویز کو منظور کیا یا نہیں۔ یہ یاد ہے کہ سرسید کے انتقال سے کچھ پہلے یا کچھ بعد میں مولانا نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔''(۹)

علی گڑھ کالج میں علامہ شبلی نے طلبہ کے لئے دو انجمنیں لجنۃ الادب اور اخوان الصفا قائم کی تھیں۔ شیخ عبداللہ نے بھی اخوان الصفا کے قائم کرنے کا ذکر کیا ہے اور کسی قدر اس کی سرگرمیوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ (۱۰)

سرسید کے سیاسی نظریہ سے علامہ شبلی کو اختلاف رہا۔ سرسید کانگریس کے مخالف اور شبلی حامی تھے۔ اس کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بھی کیا ہے اور علامہ شبلی کے

موقف کی نہ صرف تائید کی ہے بلکہ اسے درست قرار دیا ہے۔ یہ بات علی گڑھ کے شیدائیوں کو بڑی ناگوار گذری اور انہوں نے علامہ شبلی کی مخالفت کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ خاص طور سے محمد امین زبیری نے تبصرہ حیات شبلی جو ذکر شبلی کے نام سے بھی شائع ہوا ہے، علامہ شبلی کی کردار کشی کے مرتکب ہوئے۔ شیخ عبداللہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ البتہ انہوں نے استاد شبلی کی کردار کشی کے بجائے اسے مولانا سید سلیمان ندوی کی ناواقفیت پر محمول کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مرحوم بھی سرسید کی (سیاسی) رائے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن اپنی زندگی میں اپنی تصنیفات میں کبھی سرسید کی صداقت پر حملہ نہیں کیا، لیکن ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ''حیات شبلی'' میں سرسید کے مذہبی اور پولیٹکل اور دیگر خیالات پر بہت کچھ نکتہ چینیاں کی ہیں۔ میں اپنی ذاتی واقفیت سے مولوی صاحب موصوف کی نکتہ چینیوں کی تصدیق نہیں کر سکتا، بلکہ ان نکتہ چینیوں کو مولوی صاحب کی ناواقفیت پر محمول سمجھتا ہوں۔''(۱۱)

گذشتہ صفحات میں علامہ شبلی کے سفر ترکی کا ذکر آچکا ہے، ان کو ترکی اور خلافت دونوں سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کے سفر نامے ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' کے ایک ایک حرف اس کی شہادت دیتے ہیں۔ ایک شاگرد کے قلم سے اس کی شہادت ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں:

''سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے کی بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگ ہندوستان سے خلیفہ کی زیارت کے لئے سفر کیا کرتے تھے۔ منجملہ ان کے ہمارے بڑے عالم اور مصنف مولانا شبلی مرحوم بھی تھے۔ وہ بھی یہی سعادت حاصل کرنے کے لئے ٹرکی پہونچے تھے۔ مرحوم میرے استاذ تھے۔ اکثر ان سے ٹرکی کے بارے میں مجھ سے گفتگو ہوئی یا میں نے دوسروں سے گفتگو کرتے سنا اور میں نے یہ اندازہ کیا کہ مولانا مرحوم کے دل میں واقعی سلطان ٹرکی کے خلیفہ ہونے کا خیال موجود تھا، گو

مولانا مرحوم اتنے روشن خیال تھے اور جید عالم تھے کہ ان کی زبان سے کبھی کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں سنی تھی، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ باوجود ایک مورخ ہونے کے خلافت کے مسئلے میں کسی تاریخی پہلو کو اپنے سامنے آنے نہیں دیتے تھے، بلکہ دوسرے لوگوں کی طرح سلطان ٹرکی کو بلا دلیل خلیفہ مانے ہوئے تھے۔''(۱۲)

چونکہ سرسید خلافت کو ناپسند کرتے تھے، اس لئے شیخ محمد عبداللہ علامہ شبلی کے اس نظریہ کو بلا دلیل بتاتے ہیں، لیکن یہ بھی لکھتے ہیں کہ علامہ شبلی سے انہوں نے کبھی کوئی مبالغہ آمیز گفتگو نہیں سنی۔(۱۳)

شیخ محمد عبداللہ نے ''مشاہدات و تاثرات'' کے آخر میں ہندوستان کی تاریخ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اورنگ زیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ مورخ سر جدوناتھ سرکار کی کتاب سے ثابت ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر گو بہت بدنام ہیں لیکن اس نے مذہب کے بہانے ایک ہندو کو بھی قتل نہیں کیا۔(۱۴) اسی بحث میں انہوں نے شبلی کا یہ شعر نقل کیا ہے:

تمہیں لے دے کہ ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندوکش تھا ظالم تھا، ستم گر تھا

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں:

''ہندوکش ہونے کا مجھے معلوم نہیں کہ مولانا شبلی نے کہاں سے لیا ہے۔ ہندوؤں میں اس بات کا کوئی چرچا نہیں تھا لیکن اس کے ظالم اور ستم گر ہونے میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اس نے اکبر کی اولاد میں سوائے اپنے بیٹوں کے (کسی کو) زندہ نہ چھوڑا۔''(۱۵)

تاریخ عجائبات سے بھری پڑی ہے۔ اس کے دامن میں درد والم کے نہ جانے کتنے راز پوشیدہ ہیں۔ اسی طرح کا ایک تکلیف دہ واقعہ سرسید اور ان کے بیرسٹر صاحبزادے سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کے درمیان اختلاف و نزاع بھی ہے۔ دونوں میں اتنی ناچاکی ہوئی کہ سرسید

کوکوٹھی چھوڑ کر دوسرے مکان میں پناہ لینی پڑی۔ پھر کالج کے ٹرسٹیوں نے اسے کسی طرح سلجھایا اور سرسید واپس آئے۔ دراصل سید محمود کالج کا شعبہ مالیات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے۔ سرسید کی واپسی کے بعد بھی سید محمود اپنے موقف سے نہیں ہٹے، اس کا انجام یہ ہوا کہ سرسید دوبارہ کوٹھی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور نواب اسماعیل دتاؤلی کے یہاں چلے گئے۔ وہیں بیمار پڑے، علالت بڑھتی گئی اور پھر اسی عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ وفات کے بعد تجہیز و تکفین کے بھی پیسے نہ تھے۔ ان کا ملازم کئی لوگوں کے پاس گیا بالآخر نواب محسن الملک نے پچاس روپئے دئے جس سے سرسید کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ بیٹا مرحوم باپ کو دیکھنے تک نہ گیا۔ دوسروں نے تجہیز و تکفین انجام دی۔ ہاں لوگوں کے کہنے پر تدفین میں شرکت کی۔ سرسید جیسا مدبر اور مخلص قوم ان کے بعد آج تک نہ پیدا ہوا لیکن بیٹے کے اس رویے پر رونا آتا ہے، چونکہ اس ناچاکی سے متعلق ایک واقعہ علامہ شبلی کی روایت سے شیخ محمد عبداللہ نے لکھا ہے، اس لئے یہ درد بھری داستان دہرانی پڑی۔ سید محمود کس قدر آپے سے باہر تھے، وہ ملاحظہ فرمائیے۔ شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ مولانا شبلی مرحوم نے بیان فرمایا کہ سید محمود نے غصے میں آ کر ایک گھونسا اس کرسی پر مارا جہاں سرسید بیٹھے تھے اور زبان سے کہا کہ پیر فانی اب تک تمہاری حرص حکومت کرنے کی اور روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے اس واقعہ کی کچھ تحقیقات نہیں کی تھی کیونکہ مولانا شبلی مرحوم نے یہ واقعہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا لیکن اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو اس میں سید محمود کی نہایت بے جا حرکت تھی۔ لیکن اس زمانے میں سید محمود کی وہ حالت تھی کہ ہم واقعہ کو بعید از قیاس بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس زمانے میں سید محمود اور سرسید میں بے لطفی حد کو پہنچ گئی تھی، لیکن سرسید کے دل میں قوم کا جو درد موجود تھا اس کی آگ باوجود اپنی نجی زندگی کی بے لطفی کے کسی طرح کم نہیں ہوتی تھی۔''(۱۶)

اللہ سرسید کی قبر کو نور سے بھر دے، قوم کے لئے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کیں۔ بہرحال

آج برصغیر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے جو ثمرات میسر ہیں، وہ اسی مخلص قوم کی جد و جہد کا نتیجہ ہیں۔

حوالے

(۱) مشاہدات و تاثرات ص ٦-٧
(۲) ایضاً ص ٧-٨
(۳) ایضاً ص ۲٧
(۴) ایضاً ص ١٨
(۵) ایضاً ص ۲٦
(٦) خضر راہ لکھنؤ شبلی نمبر ص ١٠
(٧) مشاہدات و تاثرات ص ۲۵-۲٦
(٨) ایضاً ص ۲٧
(٩) ایضاً ص ۲٧-۲٨
(١٠) ایضاً ص ١۲
(١١) ایضاً ص ٦٦
(١۲) ایضاً ص ۲١٦
(١۳) ایضاً ص ۲١٦
(١۴) ایضاً ص ۳٩٨
(١۵) ایضاً ص ۳٩٩
(١٦) ایضاً ص ٧٧-٧٨

(تصویر: خواجہ حسن نظامی)

[۷]

آپ بیتی

• خواجہ حسن نظامی

[دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۲۲ء طبع دوم]

یہ خواجہ حسن نظامی دہلوی [۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کی آپ بیتی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۹ء میں حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس کا شمار اردو میں لکھی جانے والی اولین خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں خواجہ حسن نظامی کی زندگی کے ابتدائی دور کے بیشتر احوال آ گئے ہیں۔ اس کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وثوق سے لکھا گیا ہے اور نہ صرف احوال لکھے گئے ہیں بلکہ افکار ونظریات بھی قلم بند ہو گئے ہیں۔ دراصل نظامی صاحب نے یہ آپ بیتی اپنے مریدوں کے لئے لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ اس میں ناصحانہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ نظامی صاحب وسیع المشرب تھے، اس لئے ہندوؤں کے تیرتھوں اور تہواروں کی بھی تفصیلات اس میں موجود ہیں، اس کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ انداز معروضی ہے گفتنی کے ساتھ ناگفتنی بھی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ آپ بیتی مسلسل نہیں بلکہ بے ربط باتیں بھی آ گئی ہیں۔ اس پر تین دیباچے ہیں جو خواجہ حسن نظامی کے علاوہ ملا واحدی، احسان الحق اور خواجہ صاحب کی اہلیہ لیلیٰ خواجہ کے قلم سے ہیں۔ ملا واحدی نے تعرف وتحسین کی ہے۔ نثر کی داد دی ہے۔ سلیقۂ تحریر کی خوبی گنائی ہے اور کسی قدر تعارف بھی پیش کیا ہے۔ لیلیٰ خواجہ نے اسے نصیحت آمیز قرار دیتے ہوئے مطالعہ کی تلقین کی ہے۔ البتہ احسان الحق نے تجزیہ پیش کرتے ہوئے تنقید کی ہے۔ کچھ حصوں کے حذف کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ خواجہ

حسن نظامی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بعض حصے مریدوں کی خواہش پر حذف کئے گئے گویا محاسن تو ہیں البتہ نقائص کے کچھ پہلو حذف کر دئے گئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی حذف کے خلاف تھے مگر مریدوں کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ بہر حال اس خودنوشت سے خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کے بہت سے اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ان متعدد اشخاص کا ذکر بھی کیا ہے جن سے ان کے روابط رہے۔ ان میں مفتی غلام نظام الدین، حافظ عبدالمغنی، مرزا قادیانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی نعمانی قابل ذکر ہیں۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تصوف وسلوک کی اس ممتاز شخصیت سے علامہ شبلی کا دوستانہ تھا۔ خط وکتابت کا سلسلہ بھی عرصہ تک جاری رہا۔ علامہ شبلی کے نام ان کے خطوط تو کہیں دستیاب نہیں ہیں، البتہ علامہ شبلی کے بہت سے خطوط میں سے بیس خطوط انہوں نے اپنی کتاب ''اتالیق خطوط نویسی'' [دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ۵۵-۶۲] میں شائع کئے ہیں۔ راقم نے ان خطوط کو ''مکتوبات شبلی'' میں شامل کیا ہے۔ یہ خطوط اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۱۳ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ گویا علامہ کی وفات ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء سے ایک سال پہلے تک مراسلت کا سلسلہ رہا۔ ان خطوط سے جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کے درمیان انتہائی بے تکلفانہ مراسم تھے۔ مگر خواجہ صاحب کی آپ بیتی سے اس کا اظہار نہیں ہوتا۔

حیات شبلی میں صرف ایک جگہ خواجہ حسن نظامی کا ذکر آیا ہے۔ محمد اکرام اللہ خاں ایڈیٹر کانفرنس گزٹ کے حوالہ سے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۴ء کے شروع میں جب اصلاح ندوہ کے سلسلہ میں ان کو دہلی میں قیام کا اتفاق ہوا تو ایک دفعہ خواجہ حسن نظامی کے حلقہ مشائخ میں انہوں نے تصوف پر تقریر فرمائی، جو بڑی جامع و مانع و مؤثر تھی۔ تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔''(۱)

یہ واقعہ ۱۹۱۴ء کا نہیں ۱۹۰۹ء کا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ایک چشم دید نے قلم بند کی ہے۔ یہ چشم دید ضیاء الدین احمد برنی [۱۸۹۰-۱۹۶۹ء] ہیں، جو اس وقت مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] کے اخبار ہمدرد دہلی سے وابستہ تھے اور اس جلسے میں شریک تھے، بلکہ خواجہ حسن نظامی نے انہیں اور چند دوسرے طلبہ کو علامہ شبلی کی تقریر قلم بند کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۰۹ء کا ذکر ہے علامہ شبلی نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا کہ ''میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں مجھے کامل سکون ملے۔'' خواجہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ آپ دہلی آجایئے اور میرے ساتھ رہئے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور خواجہ صاحب نے انہیں نواب بڈھن کی محل سرائے واقع چتلی قبر میں ٹھہرایا۔ وہاں وہ تقریباً ایک مہینے تک قیام پذیر رہے۔ اس عرصہ میں انہیں کامل سکون ملا۔ خواجہ صاحب لوگوں کو ان سے ملنے بھی نہیں دیتے تھے۔ ایک تقریر انہوں نے جامع مسجد میں عشاء کے بعد چاندنی رات میں حوض کے پاس کی تھی۔ اس تمام عرصہ میں ملا واحدی علامہ کی خدمت کے لئے محل سرائے میں مقیم رہے۔

نواب بڈھن کی محل سرائے کی ایک تقریر یاد رہ گئی ہے، اس موقع پر صحن اور دالان کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب نے مجھے اور تین چار دوسرے طلبہ کو علامہ کی تقریر قلم بند کرنے پر مقرر کر دیا تھا۔ بعد میں سب کی یادداشتوں سے تقریر مرتب کی گئی۔ تقریر کا موضوع تصوف تھا۔

علامہ کھڑے ہو کر تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے بلند آواز میں علامہ سے درخواست کی کہ وہ بیٹھ کر تقریر فرمائیں۔ غالباً اس شخص کو علم تھا کہ علامہ کا ایک پاؤں کٹ چکا ہے۔ اور اس لئے وہ برداشت نہ کر سکا کہ وہ کھڑے کھڑے تقریر فرمائیں۔ چنانچہ علامہ

بیٹھ گئے اور تقریر جاری رکھی۔

تقریر سے قبل ہم میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ چونکہ علامہ صوفی منش بزرگ نہیں ہیں، اس لئے تصوف جیسے موضوع پر ان کی تقریر بالکل خشک ہوگی لیکن جب انہوں نے تقریر ختم کی تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے کم سے کم یہ محسوس کیا کہ علامہ تو چھپے رستم نکلے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنید یا بایزید بسطامی کے پایہ کا کوئی درویش ہے جو تصوف کے رموز و نکات کے دریا بہائے چلا جارہا ہے۔ تقریر کے بعد جس عقیدت مندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔'' (۲)

خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی میں یہ واقعہ اور اس کی تفصیل مذکور نہیں۔

ملا واحدی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] علامہ شبلی کے ساتھ ان کی خدمت کے لئے محل سرائے میں مقیم رہے، ان کا بیان ہے کہ علامہ اپنا باورچی ساتھ لے کر آئے تھے تاہم اس سے معمولی کام لیتے اور کھانا خود پکاتے تھے خاص طور سے سالن اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے۔ اس قیام میں صرف ایک دعوت قبول کی، ضیاء الدین احمد برنی نے لکھا ہے کہ:

''اس ایک مہینہ کی مدت میں علامہ نے صرف ایک شخص کی دعوت قبول کی اور وہ بھی خواجہ صاحب کے زور دینے سے۔ ان کا نام تھا لالہ چندولال چانول والے، وہ دہلی کے رئیس تھے اور رسالہ ''زبان'' کے مالک۔ چندولال شاعر آغا قزلباش کے شاگرد تھے۔ انہوں نے دعوت میں کافی اہتمام کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں چندولال نے کہا کہ ''ذرا گرم زردہ لانا''۔ واپسی میں علامہ شبلی نے چندولال کی مہمان داری اور وضعداری کی بہت تعریف کی مگر ایک جگہ ان کی زبان کی گرفت بھی کی۔ فرمایا ''مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ دہلی والے ہوکر انہوں نے گرم زردہ لانا، کیوں استعمال کیا؟ گرم کا لفظ تو بریانی کے لئے بولا جاتا ہے۔'' (۳)

اسی قیام کے دوران خواجہ حسن نظامی کی پہلی بیوی اور بچے کا انتقال ہوا۔ بڑا حادثہ تھا تاہم خواجہ صاحب نے اس کا بہت کم اثر لیا اور برابر اپنے کاموں میں مشغول رہے تو علامہ شبلی نے خواجہ صاحب سے کہا کہ:

''خواجہ صاحب میری بیوی کا جب انتقال ہوا تھا تو میں پاگل سا ہو گیا تھا، لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے مشاغل میں مصروف ہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ آپ واقعی بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔'' (۴)

آپ بیتی میں خواجہ صاحب نے ان واقعات کا سرے سے ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ آپ بیتی میں ایک ذیلی سرخی ہے ''مولانا شبلی''۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

''تیرتھ یاترا کے زمانہ میں چند روز مسلسل لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہمراہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا اس زمانہ میں رسالہ الندوہ کے (جوائنٹ) ایڈیٹر تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلما واقع گولہ گنج کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ میں انہی کے کمرہ میں ان کے ساتھ عرصہ تک ٹھہرا رہا اور مولانا شبلی کی صحبتوں سے فیض اٹھائے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس زمانہ میں کم سن طالب علم تھے۔ اسی زمانہ سے میری اور ابوالکلام کی بہت بے تکلفانہ دوستی ہو گئی۔'' (۵)

سوائے مولانا شبلی سے فیض اٹھانے کے اعتراف کے اس اقتباس میں علامہ سے متعلق کچھ نہیں ہے بلکہ ان سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر ہے۔ اسے تعجب خیز ہی کہا جا سکتا ہے۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۴۸۷ — (۲) عظمت رفتہ ص ۲۶۵-۲۶۶

(۳) ایضاً ص ۲۶۶-۲۶۷ — (۴) ایضاً ص ۲۶۶

(۵) آپ بیتی ص ۶۹-۷۰

(تصویر: مولانا محمد علی جوہر)

[۸]

میری زندگی

• مولانا محمد علی جوہر

[اردو ترجمہ پروفیسر محمد سرور مشمولہ مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے،
سندھ ساگر اکاڈمی لاہور، جنوری ۱۹۶۲ء]

علامہ شبلی نعمانی عربی و فارسی کے استاد کی حیثیت سے سولہ سال [۱۸۸۳-۱۸۹۸ء] ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ رہے۔ یہاں ان سے بے شمار طلبہ نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان کے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

مولانا محمد علی جوہر، مولوی مسعود علی محوی، مولانا ظفر علی خاں، مولوی ماجد علی، مولوی بہادر علی، سید سجاد حیدر یلدرم، میر محفوظ علی بدایونی، داؤد بھائی عباسی، خوشی محمد ناظر، حافظ ولایت اللہ، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عزیز مرزا، شیخ محمد عبداللہ، وغیرہ۔

علامہ شبلی کے علی گڑھ کے تلامذہ تین قسم کے ہیں۔ایک وہ جو کالج میں ان سے کلاس میں عربی و فارسی پڑھتے تھے۔ دوسرے وہ جنھوں نے ان کے درس قرآن میں شرکت کی۔ تیسرے وہ جو خارجی اوقات میں علامہ شبلی سے پڑھتے اور امتحانات کی تیاری کرتے تھے۔ان تینوں طرح کے تلامذہ کی خاصی تعداد ہے۔مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] ان کے درس قرآن کے شاگرد تھے۔

مولانا محمد علی جوہر جیسے عبقری مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عہد میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آبرو تھے۔اسلام کا وقار تھے، ان کا دل مدۃ العمر اسلام اور عالم اسلام کے لئے

دھڑکتا رہا۔ تحریک خلافت ان کے دم سے قائم رہی۔ تحریک آزادی کے وہ صف اول کے رہنماؤں میں تھے۔ ان کی قربانیاں اور جدوجہد کسی سے کم نہیں۔ افسوس کہ آزادی کے بعد انہیں فراموش کر دیا گیا۔ البتہ جناب محمد اعظم خاں سابق کابینی وزیر حکومت اتر پردیش نے ان کے نام سے رام پور میں یونیورسٹی قائم کر کے ایک قابل ستائش کام کیا ہے، یقین ہے یہ یونیورسٹی ان کے نام اور کام کو زندہ رکھے گی۔

محمد علی جوہر کے استاذ علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے تعلق اور سرسید سے انتہائی قربت کے باوجود ان کی بعض مذہبی اور سیاسی فکر کو ناپسند کرتے تھے اور غالبًا کالج کے وہ پہلے ایسے استاذ تھے جنہوں نے سرسید کی سیاسی فکر سے انحراف کیا اور کانگریس کو پسند کرتے رہے۔ پھر ۱۸۹۲ء میں جب وہ روم و مصر و شام کے سفر پر گئے، وہاں کے علمی، تعلیمی اور سیاسی حالات دیکھے، اسلام کے خلاف انگریزوں کی عیاریاں اور ریشہ دوانیاں دیکھیں تو ان کی سیاسی فکر میں اور بھی پختگی آ گئی۔ انہوں نے سفرنامہ میں ترکی خلیفہ کی جس قدر تعریف وتحسین کی اور اتحاد اسلامی کے پروانوں کا جس طرح ذکر کیا وہ انگریزی حکومت اور ان کے ہم نواؤں کے لئے سوہان روح تھا، چنانچہ انگریزی حکومت نے انہیں اتحاد اسلامی کا نمائندہ خیال کیا اور خلیفہ نے جو تمغہ مجیدیہ دیا تھا اس کے استعمال کی اجازت نہیں دی۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری [۱۸۶۴ - ۱۹۴۸ء] کے بقول ان پر خفیہ پولس لگا دی گئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزوں نے اگر چہ غلط خیال کیا تھا کہ وہ اتحاد اسلامی کے نمائندہ بن کر آئے ہیں تاہم انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ایک انقلاب آفریں جماعت کی راہ ہموار کر دی، جس کا دل عالم اسلام کے لئے دھڑکتا تھا۔ جسے اس زمانہ میں احرار کا نام دیا جاتا تھا۔ اس میں تین اشخاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸ - ۱۹۳۱ء]، مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳ - ۱۹۵۶ء] اور مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء]، ان تینوں نے صحافت کا میدان اختیار کیا اور تینوں نے کامریڈ، زمیندار اور الہلال کے ذریعہ، عالم اسلامی کے مسائل و معاملات سے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کیا بلکہ انہیں اتحاد اسلامی کے جذبہ سے سرشار کیا، ان کے شیخ طریقت بقول مولانا سید سلیمان ندوی

علامہ شبلی ہی تھے۔ (۱) یہی وجہ ہے کہ احرار کی تحریروں میں علامہ کا ذکر بڑے احترام وعقیدت سے ملتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر تو استاد مکرم، استاذی ومولائی، مولانا واستاذ نا کے الفاظ سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں علامہ شبلی سے بڑا تعلق خاطر تھا، مولانا شبلی بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔

۱۹۲۳ء میں جب مولانا محمد علی جوہر بیجا پور جیل میں قید تھے، انہیں انگریزی میں ایک ایسی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جس میں دوسرے مذاہب پر اسلام کی فوقیت ثابت کی جائے۔ اس کا نام انہوں نے ISLAM: Kingdom of God رکھا۔ اسے چار حصوں میں لکھنے کا ارادہ تھا، اس سلسلہ میں وہ اپنے استاذ علامہ شبلی کے انداز میں سیرت نبویؐ بھی لکھنا چاہتے تھے۔ حصہ اول کا آغاز انہوں نے اپنی خودنوشت سے کیا جس میں اپنے حالات وسوانح کے ساتھ اپنے مذہبی افکار کو بھی قلم بند کیا۔ دوسرے حصہ کے کچھ صفحات ہی لکھ سکے تھے کہ انہیں رہائی مل گئی اور یہ کتاب نامکمل رہ گئی۔ اس کے بعد اگرچہ وہ سات برس حیات رہے تاہم اس کی طرف توجہ نہ کر سکے۔

۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ایک اسکالر افضل اقبال نے پروفیسر محمد مجیب [۱۹۰۲-۱۹۸۵ء] سے مولانا محمد علی جوہر کی مذکورہ نا تمام کتاب کا مسودہ حاصل کر کے اسے مرتب کیا، ابواب قائم کئے، حواشی لکھے اور My Life: A Fragment کے نام سے شائع کیا۔ اس کے اب تک پانچ ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۶ء، ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۷ء شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں جناب مشیر الحسن کا مرتب کردہ ایک ایڈیشن منوہر پبلشرز دہلی نے شائع کیا ہے۔ پروفیسر محمد منور جنہوں نے مولانا محمد علی جوہر پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، اپنی کتاب ''مولانا محمد علی جوہر بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز'' میں اس کا اردو ترجمہ شامل کیا ہے۔ راقم کے پیش نظر وہی ترجمہ ہے، جسے سندھ ساگر اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس خودنوشت میں مولانا محمد علی جوہر نے اپنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر نہایت عقیدت واحترام سے کیا ہے۔ یہاں اس کے مندرجات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ آئے اور اسکول میں داخل

ہوئے۔اس وقت ان کے دونوں بڑے بھائی ذوالفقارعلی اور مولانا شوکت علی کالج میں زیرتعلیم تھے۔کالج کے قائم ہوئے ۱۵سال ہو چکے تھے اور وہ بہت کچھ ترقی کر چکا تھا مگر محمد علی جوہر اس سے مطمئن نہ تھے۔آپ بیتی میں انہوں نے اس دور کے علی گڑھ کو تاریکی سے تعبیر کیا ہے۔البتہ علامہ شبلی کو اس تاریکی میں روشنی کا نقیب بتایا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''لیکن اس عام گھپ اندھیرے کے باوجود علی گڑھ میں ایک روشن نشان بھی تھا جس کا ذکر میں یہاں نظرانداز نہیں کر سکتا۔ یہ ایک غیر معمولی خوبیوں اور بالکل نئے ادبی نقطے نظر کے مالک کالج کے پروفیسر تھے،جنہیں سرسید احمد خاں کالج میں کھینچ لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔موصوف کا اسم گرامی شبلی نعمانی تھا۔آپ عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ نیز شاعری اور تاریخ اسلام سے انہیں بے حد لگن تھی۔آپ علی گڑھ میں فارسی اور عربی پر روزانہ جو عام لیکچر دیا کرتے تھے وہ بڑے جاذب توجہ ہوتے تھے۔''(۲)

چونکہ مولانا محمد علی جوہر اسکول کے طالب علم تھے اور علامہ شبلی کالج کے پروفیسر، اس لئے انہیں کلاس میں فیضیاب ہونے کا موقع میسر نہیں تھا، تاہم انہیں علامہ شبلی کی شفقت سے درس قرآن میں شرکت کا موقع ملا اور اس طرح انہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔آپ بیتی میں اس کی تفصیل اس طرح قلم بند کی ہے:

''تاہم میں اتنا خوش نصیب ضرور تھا کہ باوجود اس کے میں اسکول کا طالب علم تھا، مجھے ان کے قرآن پر وہ لیکچر سننے کا موقع ملا جو وہ کالج کی بڑی جماعتوں کے طلبہ کو دیا کرتے تھے۔موصوف جو صبح نصف گھنٹے کے قریب قبل اس کے کہ کالج کے طالب علم اپنی دنیوی تعلیم شروع کرتے، روزانہ پرنسپل ہال میں قرآن کی اجمالی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ میں اسکول میں ہونے کی وجہ سے قاعدے کے مطابق مولانا شبلی کے ان دلچسپ اور مختصر اسباق کو سننے کا استحقاق نہ رکھتا تھا،لیکن خوش نصیبی سے مجھے ان کے شاگرد بننے کا موقع مل گیا۔

ہمارا اسکول گو اپنی الگ عمارت میں تھا لیکن وہ عمارت تھی اسی احاطے میں جس میں کہ کالج اور اس کے دارالاقامہ تھے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اسکول کی جس عمارت میں داخلہ لیا اسے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے اسکول کی عمارت سے کالج کے ایک کمرے میں جس کے متصل ہال میں مولانا شبلی نعمانی تفسیر پر روزانہ لکچر دیا کرتے تھے منتقل کر دیا گیا۔ ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں اتفاق سے اس ہال کے باہر کھڑا تھا کہ مولانا شبلی نے اپنا مقررہ درس شروع کر دیا، میں وہیں کھڑا رہا اور پورے غور سے سنتا رہا۔''(۳)

اس طرح ہال کے باہر کھڑے ہوکر وہ درس قرآن سنتے اور کبھی کبھی ناشتہ چھوڑ کر اس میں شرکت کے لئے آجاتے۔ ان کا یہ شوق دیکھ کر ان کے برادران ذوالفقار علی اور مولانا شوکت علی نے علامہ شبلی سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ چنانچہ انہوں نے از راہ شفقت انہیں ہال میں بیٹھ کر درس قرآن سننے کی اجازت دے دی۔ وہ لکھتے ہیں:

''الغرض قرآن مجید کے درس کے سلسلے میں یہ جان کر کہ میں ان کی باتوں کی داد دے سکا تھا اور یہ کہ میں ان کے لکچر دروازے کے باہر کھڑا ہوکر سنا کرتا ہوں انہوں نے مجھے از راہ عنایت اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اور اس طرح مجھے اس غیر معمولی مسرت سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا کہ میں پرنسپل ہال کے اندر بیٹھ کر ایک کالج کے انڈر گریجویٹ کی پوری شان کے ساتھ مولانا کا درس قرآن سن سکوں، مختصراً قرآن مجید کے معانی و مطالب سے اس طرح میرا پہلی بار تعارف ہوا۔''(۴)

نصف گھنٹہ کے اس درس قرآن نے مولانا محمد علی جوہر کے اندر قرآن پاک کا ایسا ذوق و شوق پیدا کیا کہ وہ تاحیات قائم رہا۔ اس کا وہ برملا ذکر و اعتراف بھی کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ محمد علی مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ میرا قرآن پاک کا ذوق اسی زمانے کی یادگار ہے۔(۵) وہ آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

''تاہم یہ صبح کے مختصر سے نصف گھنٹے تمام عمر میرے حافظے میں محفوظ رہے ہیں۔ چنانچہ بعد میں جب حکومت نے مجھے ایک ایسی کمیٹی میں نامزدگی کی عزت بخشی جس کے ذمہ ڈھاکہ میں ایک نئی طرز کی مقامی اور رہائشی یونیورسٹی کے سلسلے میں بالخصوص اس کے شعبہ اسلامیات کے لئے نصاب کے تعیین کا کام کیا گیا تھا اور وہ اس لئے کہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی تو میں نے اس کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ وہ مولانا شبلی کو آمادہ کرے کہ وہ ہمیں اس بارے میں اپنے خیالات سے مستفید کریں اور مولانا اس بات کے لئے بخوشی راضی ہوگئے تھے۔ چنانچہ جب وہ اس سلسلہ میں ڈھاکہ آئے تو میں نے ان کے نصف گھنٹہ روز کے وہ قرآن مجید کے درس یاد دلائے، انہیں بڑی خوشی ہوئی کہ مجھے اب تک ان کے وہ درس یاد ہیں۔''(۶)

علامہ شبلی درس قرآن اس قدر دلچسپ انداز اور مفید معلومات کے ساتھ دیتے تھے کہ طلبہ میں قرآن پاک سے لگاؤ پیدا ہو جاتا تھا، اس کا ذکر اس دور کے متعدد طلبہ نے کیا ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم [۱۸۸۰-۱۹۴۳ء] کا بیان ہے کہ مولانا شبلی قرآن پاک کے اصول بلاغت اور صنایع و بدایع کو بتاتے تھے اور ان صنائع کی مثالوں میں ایسے اچھے اچھے فارسی اشعار سناتے تھے کہ ہم وجد کرتے تھے۔(۷)

اس دلنشیں، مؤثر اور معلومات افزا درس قرآن کا اثر یہ ہوا کہ اب عام اور سطحی تقریریں طلبہ کو پسند نہ آتیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں درس قرآن کا جو نظم کیا گیا، اس سے ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے ان درسوں کا جنہیں سنے اتنے برس ہو گئے تھے، ایک نتیجہ میری وہ بیزاری تھی جو نئے اور پرانے طرز کے مولویوں کی ان سطحی معلومات کے خلاف جنہیں کالجوں میں دینیات کا نام دیا جاتا تھا، مجھ میں پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہماری سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ شعبہ اسلامیات کے نصاب

میں ترجمہ قرآن کو بھی رکھا جائے۔ یہ ترجمہ قرآن اس تفسیر قرآن سے الگ چیز تھی جو معمولی عربی مدارس میں بھی صرف ونحو، اعتقادی بحثوں اور اس طرح کی دوسری خشک تفصیلات سے پر ہوتی ہے اور دس پندرہ سال کی تعلیمی مدت میں بھی یہ قرآن کے تہائی حصہ سے آگے نہیں بڑھی۔''(۸)

قوم پرستی کے جذبات سے سرشار ہوکر جب جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا اور مولانا محمد علی جوہر اس کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے تو یہاں پھر انہیں علامہ شبلی کے درس قرآن یاد آئے اور انہوں نے جامعہ میں درس قرآن کا انتظام والتزام کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعدازاں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ یعنی اسلامیہ نیشنل مسلم یونیورسٹی بنی اور میں اس کا شیخ الجامعہ مقرر ہوا تو پہلے ہی دن سے میں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ اس میں مولانا شبلی کے سے درس قرآن کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے ہاں تعلیمی دن کا آغاز ایک گھنٹہ بھر کے روزانہ درس قرآن سے ہوا کرتا، جس میں قرآنی آیات کی مختصر تشریح کی جاتی، لیکن افسوس اس وقت یہ درس دینے کے لئے مولانا شبلی موجود نہ تھے۔''(۹)

مولانا محمد علی جوہر ذہانت، قوت حافظہ اور ادبی مذاق کی وجہ سے علامہ شبلی اسی دور طالب علمی میں ان سے بہت متاثر ہوگئے تھے، جیسا کہ ان کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک دن میں اپنے بھائی شوکت علی کو ان عربی اشعار کا جو وہ پڑھ رہے تھے حیران کن صحت کے ساتھ ترجمہ کر کے اچنبھے میں ڈال دیا۔ انہوں نے پوچھا کہ مجھے ان اشعار کا علم کیسے ہوا، بالخصوص میں نے ان کے معنی کہاں سے معلوم کئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کی کتابوں میں مولانا شبلی کی تصنیف المامون پڑی ہوئی ہے اور میں نے اس سے ان عربی اشعار کو زبانی یاد کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ یہ محض پر اثر رقت اور سادگی کی وجہ سے میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں، اتنے متاثر ہوئے کہ اس واقعہ کا ذکر انہوں نے

مولانا شبلی سے کیا، لیکن پروفیسر [شبلی] صاحب کو اس کا یقین نہ ہوا اور ان کی حیرانگی یہ سن کر اور بڑھ گئی کہ میں گیارہ سال کی ناپختہ عمر میں اردو شاعری میں بھی ٹانگ اڑاتا ہوں۔''(۱۰)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علی برادران دور طالب علمی ہی میں نہ صرف علامہ شبلی نعمانی بلکہ ان کی معرکتہ الآرا تصنیف المامون سے بخوبی واقف ہو گئے تھے اور اس کتاب کے ذریعہ خلافت اور خلیفہ مامون الرشید کے حالات اور اس کے عظیم الشان کارنامے ان کی نگاہوں میں آ گئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں جب علامہ شبلی نے حیرانگی کے عالم میں مولانا محمد علی جوہر کا امتحان لیا تو ان سے خلیفہ مامون کا حلیہ اور اس کی اولادوں کی تفصیل دریافت کی، جس میں نے بقول خود انہی کے ''میرے حافظے کا یہ امتحان اپنے نتیجے کے اعتبار سے اطمینان بخش رہا۔''(۱۱)

بعد میں علی برادران نے تحریک خلافت کے لئے جو جدوجہد کی اور جس کا شہرہ ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام تک پہنچا، ممکن ہے اس کی داغ بیل خلیفہ مامون کے حالات پڑھنے سے اسی زمانہ میں پڑی ہو؟ واضح رہے کہ مولانا جوہر نے آپ بیتی میں المامون کا ذکر ایک سے زاید بار کیا ہے۔

اسی زمانہ میں علامہ شبلی روم و مصر و شام کے سفر پر گئے اور جب واپس آئے تو ان کی ہر محفل اور ہر مجلس ترکی خلیفہ اور خلافت کے ذکر سے معمور ہوتی تھی۔ ان کے ایک شاگرد شیخ عبداللہ پاپا میاں نے لکھا ہے کہ گو مولانا شبلی نے مبالغہ آمیز گفتگو کبھی نہیں کی مگر وہ خلافت بالخصوص ترکی خلیفہ کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ بعدازاں ان کا سفرنامہ شائع ہوا جو کالج میں خاصا مقبول رہا، یقیناً اس کے اثرات بھی علامہ شبلی کے تلامذہ پر پڑے ہوں گے۔

مولانا محمد علی جوہر نے گیارہ سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس کا ذکر بھی مولانا شوکت علی نے علامہ شبلی سے کیا، چنانچہ علامہ نے انہیں مصرعہ طرح دے کر شعر کہنے کو کہا اور انہوں نے چند شعر برجستہ کہے، جسے خود انہوں نے لچر پوچ کہا ہے مگر یہ بھی لکھا ہے کہ فن عروض پر وہ پورے اترے۔ آپ بیتی میں اس کی تفصیل بھی درج ہے۔(۱۲) اس کے علاوہ مولانا عبدالماجد

دریابادی[۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] کے نام ایک خط میں بھی انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گیارہ برس کی عمر میں علی گڑھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظے کا کہ المامون میز پر رکھی تھی اٹھا کر پڑھنے لگا اور ایک نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا، حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے۔ پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہوگئے تو ایک مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہوگئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر جو سکہ بیٹھ گیا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک انعامی نظم میں نے لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔''(۱۳)

علامہ شبلی اسی زمانہ میں علی برادران سے بے حد متاثر ہوگئے تھے، بلکہ ان سے محبت کرنے لگے، چنانچہ انہوں نے ایک دن ان برادران کی دعوت کی۔ آپ بیتی میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی کے اس کڑے امتحان میں کامیاب ہونے کا مجھے معاوضہ بھی ملا، یعنی کہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک شام انہوں نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا، لیکن مجھے اعتراف کرنا ہوگا کہ میں نے اس شام مولانا شبلی کی گفتگو کی دلآویزی کی داد دینے میں چنداں خوش مذاقی کا ثبوت نہ دیا کیونکہ جب کافی دیر بعد کھانا چنا جانے لگا تو انہوں نے اس ننھے شاعر کو کمرے کی سب سے بڑی آرام کرسی میں بڑے آرام سے لوٹ پوٹ مارے سویا ہوا پایا اور بعد میں جب اسے شاعرانہ خیال آفرینیوں سے

جگا کر غیر شاعرانہ نثری حقیقتوں یعنی بریانی اور شاہی ٹکڑوں کی دنیا میں لایا گیا
تو اس نے زور زور سے آنکھیں ملنی شروع کر دیں تا کہ وہ اپنے آپ سے
نیند کے شبہے کو دور کر سکے۔''(۱۴)

استاذ وشاگرد دونوں نے یکے بعد دیگرے علی گڑھ کو خیر باد کہا، تاہم جو رشتہ انس ومحبت علی گڑھ میں قائم ہوا وہ آخر تک باقی رہا۔

مولانا محمد علی جوہر نے ملازت کے کئی برس بڑودہ میں گذارے اور علامہ شبلی کو بہ اصرار بڑودہ بلایا، چنانچہ وہ تشریف لے گئے اور انہیں کے یہاں ٹھہرے۔ یہیں محمد علی جوہر نے اورنگزیب عالم گیر پر عائد الزامات کے تردید کے لئے انہیں آمادہ کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ماہنامہ الندوہ میں ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین لکھا جو ۱۹۰۹ء میں امرت سر سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔(۱۵) وہ اس کا انگریزی ترجمہ کرنے کے بھی متمنی تھے مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ اس کے ترجمہ کی اور لوگوں نے بھی کوشش کی مگر ۱۹۸۲ء میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اس کام کو پورا کیا۔

مولانا محمد علی جوہر نے علامہ شبلی کو نہ صرف اورنگزیب عالم گیر پر عائد الزامات کے جوابات لکھنے پر آمادہ کیا بلکہ سیرت نبویؐ کی تالیف کی طرف بھی متوجہ کیا اور ان کا خیال ہے کہ اس کی تالیف کا فیصلہ بھی کم از کم بڑودہ ہی میں ہوا۔(۱۶) آپ بیتی میں قدرے تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات کا علم پہلے بھی تھا اور اسی لئے میں نے اپنے استاذ
مولانا شبلی مرحوم سے دس سال قبل جب وہ بڑودہ میں میرے پاس تشریف
لائے تھے، شکایتاً کہا تھا کہ ان جیسے مورخ اسلام نے بھی، جنہوں نے ہیروز
آف اسلام کے ذیل میں مامون الرشید کے سوانح حیات مرتب کئے اور اس
کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح عمری سے آگے نہیں بڑھے۔ دنیا کے سب
سے بڑے ہیرو یعنی رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت کو مرتب نہیں

کیا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کہ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قسم کی سیرت، میں اور میرے جیسے لاکھوں آدمی آج چاہتے ہیں، اس طرح کی سیرت اب تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ سیرۃ النبیؐ کے متعلق عربی زبان میں بڑی ضخیم کتابیں موجود ہیں لیکن ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کرنے کے لئے صرف مواد کا کام لیا جا سکتا ہے اور ایک سوانح نگار کو اس مواد کی چھان بین اور جانچ پڑتال کرنا پڑے گی اور پھر کہیں جا کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر آج کی ضرورت کے مطابق ایک صحیح، تنقیدی، معیاری کتاب شائع ہو سکتی ہے۔ بہر حال مولانا شبلی نے اس وقت نہ صرف اس کام کی ضرورت کا اعتراف کیا بلکہ اس کی فوری اہمیت کو بھی انہوں نے محسوس کیا اور اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ مرحوم نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کا اعلان کر دیا، چنانچہ ہر ہائی نس بیگم بھوپال کی ہمہ وقت حاضر مالی مدد اور اپنے مستعد شاگردوں کی بدولت جنہیں مولانا شبلی نے اپنے گرد جمع کر لیا تھا، انہوں نے دنیا سے رخصت ہونے سے کچھ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مکمل کر دی۔'' (۱۷)

مولانا محمد علی جوہر جس زمانہ میں دہلی سے ہمدرد شائع کر رہے تھے اس زمانہ میں بھی اپنے استاذ سے رابطہ میں رہے، چنانچہ ہمدرد میں ان کے بعض مضامین و مراسلات بھی شائع ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی دہلی گئے تو انہوں نے ہمدرد کے دفتر میں ان کی دعوت کا اہتمام کیا، جس میں ہمدرد کے عملہ، اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر محمد شفیع [۱۸۸۳-۱۹۶۳ء] اور بعض دوسرے اکابر شامل تھے۔ ضیاء الدین احمد برنی مصنف عظمت رفتہ بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''کھانے کے بعد علامہ نے حاضرین کے اصرار پر مسجد کان پور کے

بارے میں اپنی رباعیاں سنائیں جن میں وہ رباعیاں بھی شامل تھیں جنہیں حکومت نے ممنوع الاشاعت قرار دیدیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا محمد علی کی مساعی کا تشکر آمیز لہجہ میں ذکر کیا جو انہوں نے مسجد کی بحالی کے سلسلہ میں انجام دی تھیں، پھر فرمایا ''آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ لازماً بڑا آدمی ہے۔'' اور اس ضمن میں انہوں نے اپنے نظریہ کی تائید میں تاریخ اسلام سے چند نام پیش کر کے فرمایا کہ ''یہ بڑے لوگ وہ ہیں جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔'' مولانا محمد علی ایک طرف کونے میں سر جھکائے بیٹھے تھے، کچھ دیر تک تو وہ اپنی تعریف سنا کئے اور پھر یکا یک بولے کہ ''محمد علی والی ایران کا بھی تو ذکر کیجئے۔'' علامہ نے معاً جواب دیا کہ ''یہ تو کلیہ کی استثنا ہے۔'' اس پر خوب قہقہہ ہوا۔'' (۱۸)

۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی۔ اسی ماہ میں انگریزوں نے مولانا محمد علی جوہر کو گرفتار کر کے لاہور میں قید کیا، یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کی وفات پر ان کی کوئی تعزیتی تحریر نہیں ملتی۔ لیکن وہ مزار شبلی پر حاضری کے لئے کس درجہ بے قرار تھے، اس کا اندازہ مولانا سید سلیمان کے نام خط کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب چھوٹوں گا تو ضرور روضہ استاذ کے پھولوں کی خوشبو سے دماغ و روح کو معطر کروں گا:

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری (۱۹)

اور جب وہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ آئے تو سب سے پہلے مزار شبلی پر حاضر ہوئے اور انہوں نے وہ تمام گلہائے عقیدت جو قوم نے ان کے سر باندھے تھے اتار کر استاذ شبلی کی قبر کے ایک گوشے ڈال دئے۔ (۲۰)

اپنے استاد کی آخری یادگار دارالمصنّفین اور معارف سے بھی انہوں نے بڑی دلچسپی لی اور

مفید مشورے دیتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد شائع ہوئی تو وہ اس کے مطالعہ کے پہلے سے مشتاق تھے اور اس کے ملنے میں کسی قدر تاخیر ہوئی تو مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا کہ:

''اگر آپ کو پہلے سے بھی اس کا کافی احساس نہ تھا کہ میں سیرت نبویؐ کے لئے عرصے سے بے قرار ہوں تو کم سے کم یہاں تشریف لانے کے بعد تو قطعی طور پر اس کا احساس ہو گیا ہوگا بلکہ میں نے آپ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر مکمل نہیں تو اجزا ہی ارسال کر دئے جائیں گے، اگر اس پر بھی آپ کو میری بے قراری پر شک ہے تو میں دربار نبویؐ میں ازالہ حیثیت عرفی کی نالش روانہ کروں گا۔ آپ کے جانے کے بعد سے کل تک برابر انتظار تھا اور مجھ جیسے کاہل اور خط لکھنے میں چور نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ایک عریضہ ارسال خدمت کروں۔ آج صبح کے لئے ارادہ مصمم تھا کہ کل شام ہی کو معارف دیکھنے میں آیا اور سیرت کی پہلی جلد کا مژدہ سنایا۔ اب بھی اگر آپ ایک جلد ارسال نہ فرمائیں گے تو یقین کیجئے کہ رسیاں تڑوا کر خود اعظم گڑھ آ کو دوں گا اور دارالمصنّفین میں ہڑبونگ مچا دوں گا کہ آپ حضرات اہل قلم کی محبوب یک سوئی کا خاتمہ ہو جائے گا۔''(۲۱)

واقعہ یہ ہے کہ انہیں جب قرآن مجید، تاریخ اسلام اور سیرت کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا انہیں علامہ شبلی کی یاد آ جاتی۔ سیرت کے موضوع پر تقریروں کا موقع آیا تو انہیں سیرۃ النبیؐ کی یاد آئی۔ آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

''جب مجھے میلاد النبیؐ کی ان تقریروں کے سلسلے میں اپنی ان تقریروں کے لئے اس طرح کی کتاب کی ضرورت پڑی تو اس وقت مولانا شبلی کی یہ کتاب موجود نہ تھی۔ بہرحال ہم چھندواڑہ ہی میں تھے کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس کی کئی جلدیں ابھی شائع ہونا ہیں اور ۱۹۲۳ء کے وسط گرما میں میں جو یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو مجھے اس کی تیسری

جلد کے شائع ہونے کا انتظار ہے۔''(۲۲)

اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر کے انگریزی ترجمہ کی خواہش کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سیرت کی اشاعت کے بعد وہ اس کے ترجمہ کا بھی ارادہ رکھتے تھے، بلکہ اس کی تکمیل کے لئے وہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں قیام کرنے کی نیت کر چکے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے مولوی مسعودعلی ندوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''محمد علی کا مستقل ارادہ ہے کہ جب خدا کی دی ہوئی آزادی ہم کو ملے گی تو والدہ کی خدمت ضروری سے جلد تر فارغ ہوکر سیدھے اعظم گڑھ آئیں اور وہاں قیام کرکے پوری محنت کے ساتھ انگریزی قابلیت اللہ کی راہ میں صرف کریں۔ سیرت نبویؐ کو انگریزی جامہ پہنا کر حق یورپ کے کانوں تک پہونچائیں۔''(۲۳)

ان کی یہ بھی تمنا تھی کہ اگر سیاست سے فرصت ملتی تو وہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں قیام کرتے اور خالص علمی مشغلہ اختیار کرتے مگر اس کی نوبت نہ آسکی اور ان کی سیاسی مشغولیات اور قومی ضروریات نے ان کاموں کا موقع نہیں دیا اور وہ یہ حسرت لئے ہوئے دیار غیر لندن میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ جہاں وہ آزادی کا پروانہ لینے گئے تھے۔ ان کا جنازہ مصر میں پڑھا گیا اور بیت المقدس کے ایک گوشے میں ابدی آرام کی جگہ ملی۔ ایسے عظیم افراد ہزاروں سال میں پیدا ہوتے ہیں:

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ ان کی قبر کو تا قیامت منور رکھے۔

مولانا کی آپ بیتی نامکمل رہی ورنہ خدا جانے وہ اپنے استاد کا کس کس طرح ذکر کرتے اور کیسے کیسے احوال بیان کرتے۔

علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ نے ان سے بے پناہ محبت کی اور ان کے افکار کی اشاعت میں سرگرم حصہ لیا۔ ان میں چند بہت ہی نمایاں ناموں میں ایک نام ہندوستان کے اس بطل جلیل

مولانا محمد علی جوہر کا بھی ہے۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۶۰۶

(۲) مولانا محمد علی جوہر بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے ص ۷۷-۷۸

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً ص ۸۰

(۵) حیات شبلی ص ۱۹۶

(۶) مولانا محمد علی جوہر بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے ص ۸۱

(۷) حیات شبلی ص ۱۹۶

(۸) محمد سرور محولہ بالا ص ۸۱

(۹) ایضاً ص ۸۱-۸۲

(۱۰) ایضاً ص ۸۱

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً ص ۸۱

(۱۳) خطوط محمد علی ص ۱۲۶-۱۲۷

(۱۴) مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے، ص ۸۰

(۱۵) مشاہیر کے خطوط ص ۷۵

(۱۶) مشاہیر کے خطوط ص ۸۰

(۱۷) مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے ص ۱۷۵-۱۷۶

(۱۸) عظمت رفتہ ص ۲۶۸

(۱۹) مشاہیر کے خطوط ص ۸۷

(۲۰) شذرات سلیمانی حصہ اول ص۹۱

(۲۱) مشاہیر کے خطوط ص۹۴

(۲۲) ایضاً ص۱۷۶

(۲۳) معارف اکتوبر ۱۹۵۷ء ص۳۰۷

(تصویر: سررضاعلی)

[۹]

اعمال نامہ

• سر رضا علی

[خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، طبع دوم، ۱۹۹۲ء]

سر رضا علی [۱۸۸۲ - ۱۹۴۹ء] علی گڑھ کالج کے نامور فرزند، اہل قلم اور ممتاز دانشور تھے۔ ''اعمال نامہ'' ان کی آپ بیتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں پہلی بار ہندوستانی پبلشرز دلی سے شائع ہوئی۔ ۱۹۹۲ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ ۵۲۷ صفحات پر مشتمل اس ضخیم آپ بیتی میں سر رضا علی کی سوانح، علمی و عملی کام، بلکہ ان کی زندگی کی تمام جدوجہد کی داستان آ گئی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف آپ بیتی ہی نہیں، جگ بیتی بھی ہے۔ مصنف نے اپنے عہد کے علمی و تعلیمی اور سیاسی و معاشرتی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ علی گڑھ کالج میں وہ اس سال داخل ہوئے جس سال [۱۸۹۸ء] سرسید نے وفات پائی۔ ان کے سامنے ہی نواب محسن الملک سکریٹری نامزد ہوئے اور انہیں سید محمود [۱۸۵۰-۱۹۰۳ء] کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی مشکل سے انہوں نے رام کیا۔ اس دور کے علی گڑھ کالج کی تاریخ اور طلبہ کی تعلیمی زندگی وغیرہ کا پورا مرقع اس میں آ گیا ہے۔

ہندوستان کے سیاسی حالات، جدوجہد آزادی، کانگریس، مسلم لیگ اور ان کے رہنماؤں کی جدوجہد اور ان کے افکار و خیالات غرض گونا گوں موضوعات نے اس آپ بیتی کو گویا مسلمانان ہند کی تاریخ کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے پہلے اردو میں اس قدر ضخیم، مبسوط اور مفصل آپ بیتی نہیں لکھی گئی۔

سر رضا علی کے بہت سے بیانات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ انہوں نے بعض باتیں سنی سنائی بلا تحقیق لکھ دی ہیں۔ ان کا مطالعہ وتجزیہ ایک الگ تحریر کا متقاضی ہے، مگر راقم الحروف کو سر دست علامہ شبلی سے متعلق ان کے بیانات واندراجات سے بحث ہے۔

سر رضا علی نے بہت سے علماء وفضلا، ادبا وشعراء اور اہل دانش کا تذکرہ اور ان کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہیں کہیں علامہ شبلی کا بھی نام لیا ہے۔ علی گڑھ کے تذکرے میں شبلی کے متعلق سوائے اس کے وہ علمی کاموں کے لئے علی گڑھ چھوڑ گئے اور ایک حرف نہیں ملتا۔ یہ تو تعجب خیز ہے ہی طرفہ تماشا یہ کہ ۱۸۹۸ء میں جس وقت سر رضا علی علی گڑھ میں داخل ہوئے، ان کا خیال ہے کہ اس وقت وہاں کوئی علمی ماحول نہیں تھا۔ طلبہ کی تمام تر دلچسپیاں کھیل کود سے وابستہ تھیں، اس کا ذمہ دار انہوں نے پرنسپل مسٹر بیک کو بتایا ہے۔ ان کے اس بیان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ سرسید کی وفات اور شبلی کے استعفٰی کے باوجود علی گڑھ میں ارباب کمال کی پوری جماعت موجود تھی اور وہ پورے ہندوستان کو متاثر کر رہی تھی۔ یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں کوئی علمی فضا نہیں تھی۔

اس خودنوشت کا ایک عنوان ہے ''سرسید کے نورتن'' اس میں انہوں نے علامہ شبلی کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

> ''مولوی شبلی عمر کے لحاظ سے سرسید کے جلیس نہ تھے لیکن سید صاحب کی صحبت کا شرف ان کو حاصل ہوا تھا۔ وہ مولوی حالی کی طرح خشک مزاج تھے، نہ مولوی نذیر احمد کی طرح ظریف اور بذلہ سنج، لیکن طبیعت میں بلا کی چلبلاہٹ تھی۔ شوخی طبع کا اندازہ ان کی کتابوں سے ہوتا ہے۔ جن میں عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کے نام کے خطوط جواب چھپ گئے ہیں، خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں۔ روزمرہ کی بے تکلف بات چیت میں یہ شوخی اور بھی مزہ دیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ حالی کی نثر کی تصانیف کی عمر شبلی کی تصانیف سے کہیں زیادہ ہوگی، مگر شبلی کی طرز ادا اور شوخی نے عوام کی نظر میں جو مقبولیت

حاصل کی وہ حالی کے ٹھوس اور عالمانہ انداز بیان کو نصیب نہ ہوئی۔''(۱)

جس دور میں یہ آپ بیتی قلم بند ہوئی اس دور کے اہل قلم جب سرسید کے رفقا اور ان کی نثر پر خامہ فرسائی کرتے ہیں تو ان کے ذکر کے بجائے علی العموم ان کا موازنہ و مقابلہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ تجزیہ بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

البتہ حالی و شبلی کی نثر کا یہ تجزیہ درست قرار نہیں دیا جا سکتا، شبلی کی نثر کی داد خود سرسید نے دی تھی اور آج عام طور پر یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ علمی بحث و نقد اور تجزیہ کے لئے سب سے شاندار طرز تحریر علامہ شبلی کا ہے۔ سر رضا علی مذہباً شیعہ تھے۔ اگر چہ وہ کہتے ہیں کہ علی گڑھ میں ان کی کایا پلٹ ہوئی مگر خود نوشت کی پوری فضا اس سے بوجھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اودھ میں مرثیہ گوئی، میر انیس، مرزا دبیر اور دوسرے مرثیہ گو شعراء کا نہایت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اسی میں مولانا شبلی اور ان کی مشہور زمانہ کتاب موازنہ انیس و دبیر کا تعارف و تجزیہ بھی سپرد قلم ہوا ہے۔ موازنہ انیس و دبیر کے ذکر سے پہلے لکھا ہے کہ:

> ''دبیر کی طرف ابھی توجہ نہیں ہوئی۔ ملک کے ادبی مذاق کی رفتار کو بھیڑ چال کہنا چاہئے۔ بھیڑوں کے گلہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جدھر ایک یا دو آگے چلنے والی بھیڑ یں جاتی ہیں باقی بھیڑیں بھی وہی راستہ چلتی ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد نے نظیر اکبرآبادی کے ساتھ بدسلوکی کی۔ انجمن شعر و سخن کے دروازہ پر دربان بن کر کھڑے ہو گئے اور غریب نظیر کو نہ گھسنے دیا۔ مولانا شبلی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا عوام پر یہ اثر ہوا کہ دبیر انیس کے ہم پلہ نہ رہے۔''(۲)

اہل علم و ادب کے لئے بھیڑ کا لفظ استعمال کرنا نہایت نامناسب ہے، تاہم اس اقتباس سے ان کے نظریہ کی وضاحت ضرور ہو جاتی ہے۔

سر رضا علی نے واضح کیا ہے کہ لکھنؤ میں انیسیے اور دبیریے دونوں گروہ یکجا نہیں ہو سکتے تھے اور دونوں کے درمیان انتہائی مخالفت تھی۔ اسی بحث سے وہ سامنے آجاتے ہیں کہ وہ دبیریے

ہیں۔اس کے بعد وہ موازنہ پر تبصرہ شروع کرتے ہیں اور اس کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''مولوی شبلی ایسے زبردست ادیب اور ناقد سخن تھے اور میں ان کی جامعیت سے اس درجہ متاثر ہوں کہ جو فیصلہ انہوں نے کیا ہے کہ اس کی صحت کے تسلیم نہ کرنے والوں کو ادبی بدعت سمجھتا ہوں۔''(۳)

پھر وہ اس بدعت کا خود ارتکاب کرتے ہیں۔اس کا سبب بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اگر میں اس بدعت کا ارتکاب کروں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موازنہ کے وقت انیس کا بلند اور بہت بلند اور دبیر کا پست اور بہت پست کلام ان کے پیش نظر تھا۔''(۴)

مذکورہ بالا سبب بیان کرنے کے باوجود وہ اس کو ناکافی خیال کرتے ہیں۔پھر موازنہ کے معیار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موازنہ کا صحیح معیار یہ ہونا چاہئے کہ ایک حریف کے بلند کلام کا دوسرے حریف کے بلند کلام سے اور پست کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے۔مقابلہ ہم مرتبہ اشخاص کا کیا جا سکتا ہے۔شہنشاہ عالمگیر کے بالمقابل قادر روہیلہ کو لا کھڑا کرنا یا شہنشاہ اکبر کا میر جعفر نواب بنگالہ کو حریف قرار دینا کسی حالت میں جائز نہیں ہوسکتا۔نہ مرزا رفیع سودا اور ہدہد کو مقابلہ کے لئے ایک ہی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔''(۵)

ایک اور وجہ بھی ملاحظہ ہو۔لکھتے ہیں:

''کسی شاعر کا سارا کلام ہموار اور ایک وزن نہیں ہوسکتا۔بڑے سے بڑے شاعر کو لے لیجئے اگر خود اس کے بلند کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسماں کا فرق نظر آئے گا۔دو آدمیوں کے کلام کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ شرط اور بھی ضروری ہے کہ مقابلہ ہم وزن چیزوں کے درمیان ہو۔''(٦)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر رضا علی انیس و دبیر کو مد مقابل ہی نہیں خیال کرتے اور دونوں میں عالم گیر اور غلام قادر روہیلہ، اکبر اور میر جعفر وغیرہ جیسا تفاوت بتاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں مرثیہ نگار، دونوں مرثیہ خواں، دونوں کا موضوع ایک اور مراثی کے متعدد یکساں موضوع پر دونوں نے طبع آزمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کے موازنہ سے پہلے بھی دونوں مد مقابل سمجھے جاتے تھے اور دونوں کے مداحوں میں پنجہ آزمائی ہوتی رہتی تھی، دراصل موازنہ کو صحیح نہ ٹھہرا کر وہ پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان موازنہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر یہ الزام لگاتے ہیں کہ دونوں کے ہم رتبہ مراثی سے موازنہ نہیں کیا گیا۔ پھر اسی حیثیت سے موازنہ کا تجزیہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''مولوی شبلی کی کتاب کی بڑی کمی تو یہ ہے کہ انیس کے کلام سے کتاب بھری پڑی ہے۔ کل کتاب ۲۸۴ صفحہ کی ہے۔ شروع میں بیس صفحوں میں عربی، فارسی اور اردو مرثیہ گوئی کا ذکر ہے۔ ۲۱۰ ؍صفحے انیس کی نذر کئے گئے ہیں۔ دبیر کے حصہ میں صرف بیس صفحے آئے ہیں۔ بقیہ صفحوں میں دونوں شاعروں کے کلام پر مولوی شبلی کی تنقید ہے۔ التزام یہ ہے کہ محض تنقید میں ہی نہیں بلکہ جہاں کلام نقل کیا گیا ہے وہاں بھی جگہ جگہ انیس کو سراہا ہے اور ان کی بندشوں کی چستی، روانی، جذبات کے اظہار اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے کے کمال کی جانب جا بہ جا توجہ دلائی ہے۔ دبیر کے بہترین کلام کے ساتھ بھی اگر یہی فیاضی برتی جاتی تو غالباً دبیر کا پلہ ہلکا نہ رہتا۔ اگر انیس کے بہترین کلام کا دبیر سے مقابلہ کیا جائے تو میری ناچیز رائے میں ترجیح کا تاج بلا تامل کسی ایک کے سر پر رکھ دینا دشوار کام ہوگا۔ مولوی شبلی کو رائے قائم کرنے میں آسانی اس لئے ہوئی کہ موصوف نے نابرابر چیزوں کا مقابلہ کیا ہے اور جہاں انیس کا چیدہ کلام موازنہ میں درج کیا ہے، دبیر کا اسی پایہ کا کلام منتخب نہیں کیا۔''(۷)

محض دو باتیں کہنے کے لئے کہ انیس و دبیر کا موازنہ درست نہیں اور شبلی نے انیس کے مقابلہ میں دبیر کا پست کلام پیش کیا ہے کئی صفحہ سیاہ کر ڈالا ہے۔ اس کے بعد بھی بات نہیں بنی تو مراثی دبیر کے بند کے بند بطور ثبوت وشہادت نقل کر ڈالے ہیں۔ پھر ان مراثی کی فنی خوبیوں کی بھی وضاحت کی ہے اور شاعرانہ لحاظ سے دبیر کے کلام کی افضلیت ثابت کی ہے۔

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ شبلی کو مرثیہ نگاری میں جس طرح کی فصاحت و بلاغت پسند ہے اور جس کی انہوں نے کلام انیس سے مثالیں درج کی ہیں، اس طرح کا کلام دبیر کے ہاں بھی موجود ہے۔ آخر میں انہوں نے دبیر کے علم وفضل اور شرافت ومروت اور دلداری پر روشنی ڈالی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دبیر کے متعلق انجانے میں یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ:

> ''جو شخص درخواست کو رد کرنا اپنے شعار کے خلاف سمجھے اور ہر کس و ناکس کی فرمائش پر مرثیہ، سلام، رباعی یا نوحہ کہہ ڈالے، اس کے کلام میں ہمواری کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ مرزا صاحب کے مرثیوں کی دو مطبوعہ جلدیں تو میں نے اپنے لڑکپن میں دیکھی تھیں، غالباً بیس جلدیں اب اور چھپ گئی ہیں۔ کاش غالب کی طرح دبیر کو بھی اپنا بہترین کلام منتخب کرنے اور بقیہ کلام کو تلف کر دینے کا موقع مل جاتا تو پھر ان کی تعقیدوں اور سست بندشوں پر جو آئے دن اعتراض ہوتے رہتے ان سے دبیر کو اور ان قدر دانوں کو جو موصوف کا فن مرثیہ گوئی کے سب سے بڑے صاحبان کمال میں شمار کرتے ہیں نجات مل جاتی۔'' (۸)

گویا ان کے کلام میں تعقید اور سست بندشیں موجود ہیں اور یہی بات علامہ شبلی نے واضح کر کے انیس کی دبیر پر فوقیت ثابت کی تو انہوں نے کیا گناہ کیا؟

سر رضا علی انیس و دبیر کے موازنہ کے قائل نہیں ہیں اور علامہ شبلی کے موازنہ سے متفق نہیں، لیکن شبلی سے پہلے ایک دوسرے کی معرکہ آرائیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ علامہ شبلی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دونوں کا موازنہ کر کے تحریری طور پر اردو ادب میں موازنے کا آغاز

کیا، جس سے اختلاف و اتفاق کی ہمیشہ گنجائش باقی رہے گی، تاہم موازنہ انیس و دبیر نے میر انیس کو جو درجہ عطا کر دیا وہ اب شاید دبیر کے حصہ میں کبھی نہ آ سکے، دراصل یہ شبلی کے قلم کا اعجاز اور انیس کے مقابلہ میں دبیر کی پست مرثیہ نگاری کا نتیجہ ہے۔

حوالے

(۱) اعمال نامہ ص ۴۵۰-۴۵۱

(۲) ایضاً ص ۵۰

(۳) ایضاً ص ۵۰

(۴) ایضاً ص ۵۰-۵۱

(۵) ایضاً ص ۵۱

(۶) ایضاً ص ۵۱

(۷) ایضاً ص ۵۱

(۸) ایضاً ص ۶۱

(تصویر: مولانا ابوالکلام آزاد)

[۱۰]

تذکرہ

• مولانا ابوالکلام آزاد
[ساہتیہ اکادمی دہلی، طبع دہم، ۲۰۱۲ء]

مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے ''تذکرہ'' سے اہل علم وادب بخوبی واقف ہیں۔ یہ ان کی خودنوشت کا پہلا حصہ ہے۔ مصنف کی زندگی ہی میں ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے مرتب فضل الدین احمد مرزا ہیں۔ اس کے دوسرے حصے ان کی تحویل میں تھے، مگر یکا یک ان کے انتقال سے وہ ضائع ہوگئے اور پھر کبھی دستیاب نہیں ہوئے۔ اس حصہ میں مولانا آزاد نے اپنے بزرگ شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ اس میں دوسرے بہت سے موضوعات ضمناً آگئے ہیں۔ چوں کہ علامہ شبلی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، اس لئے ضمناً ان سے متعلق بھی چند باتیں آگئی ہیں۔ یہاں انہیں کا ذکر مقصود ہے۔

[۱]

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ سیرت نبویؐ قرآن مجید کی روشنی میں لکھی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کثرت سے ہے اور سیرت کے ایک پہلو کے لئے دو سے زیادہ آیات ملتی ہیں۔ جس زمانہ میں ان کو یہ خیال پیدا ہوا، علامہ شبلی سیرت النبیؐ کی تالیف میں مصروف تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''جس زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہؐ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے، تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں

نے کہا، آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے ''قرآن اور سیرت محمدیہ'' اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بربط وترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ ﷺ کی شخصیت اور آپ کے وقائع وایام معلوم ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلی علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک وتردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کے لئے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو بھی بہت نقصان پہنچایا اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔ ندوہ کے معاملہ میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعف یقین وعدم جزم وصلابت ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا۔ بہر حال انہوں نے اس خیال پر بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی، مگر وہی اپنی عادت کے مطابق اظہار شک وناامیدی کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے، لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا تم یہ ٹکڑا مرتب کر دو تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔''(۱)

علامہ شبلی سے آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''آخری یکجائی دہلی میں ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے کہا: مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی۔ چنانچہ دہلی سے آ کر میں نے کچھ وقت اس میں صرف کیا اور ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ ومستنبط شروع کر دی۔''(۲)

[۲]

علامہ شبلی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ ان کی تحریک وقف علی الاولاد ہے۔ مولانا سید

سلیمان ندوی نے اس کی پوری تفصیل حیات شبلی میں قلم بند کی ہے۔راقم الحروف نے بھی ''آثار شبلی''اور''مراسلات شبلی''میں اس کا ذکر کیا ہے بلکہ حیات شبلی کے بعد جو نئی معلومات ہاتھ آئیں اس میں ان کا بھی ذکر ہے۔علامہ شبلی نے وقف علی الاولاد کے سلسلے میں حکومت سے ملنے کے لئے ایک وفد تیار کیا تھا۔اس سلسلے میں انہوں نے علامہ اقبال وغیرہ کو خطوط لکھے تھے،مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ آیا وفد تیار ہوا تھا یا نہیں۔مولانا آزاد کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد تیار ہوگیا تھا اور علامہ شبلی کے ساتھ کلکتہ میں مقیم تھا۔وہ لکھتے ہیں:

> ''۱۹۱۱ء میں مولانا شبلی مرحوم وقف علی الاولاد کے لئے علماء کا ایک وفد لے جارہے تھے اور اسی غرض سے کلکتہ میں مقیم تھے۔علمائے وفد میں سے ایک بزرگ کہ درس ونظرِ معقولات کے لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں،ایک دن اسی لب ولہجے میں جوان بزرگوں کے لئے مخصوص ہے، آج کل کے انگریزی خواں تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب بے خبری اور الحادو بے قیدی کی شکایت کرنے لگے۔میں نے کہا:یہ شکایت کم ازکم آپ لوگوں کی زبانی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔میرے خیال میں تو آپ اور وہ دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب ومسلک کے دومختلف مظاہر ہیں۔''(۳)

مولانا آزاد نے وفد کے ان بزرگ کا نام نہیں لیا ورنہ کم ازکم وفد کے ایک رکن سے ضرور آگاہی ہوجاتی۔خدا جانے دوسرے ارکان کون تھے اور آیا وہ وفد حکومت کے ذمہ داروں سے ملا یا نہیں۔

[۳]

علامہ شبلی سے مولانا آزاد ۱۹۰۴ء میں بمبئی میں ملے۔انہوں نے مولانا آزاد کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔وہ حیدرآباد سے مستعفی ہوئے تو لکھنؤ بلایا۔مولانا آزاد لکھنؤ آئے اور کئی ماہ ساتھ رہے اور ماہنامہ الندوہ کی ادارت کی۔پھر وکیل امرتسر چلے گئے۔بعدازاں وہ جہاں بھی رہے علامہ سے ملنے لکھنؤ آتے رہے اور یہ سلسلہ علامہ شبلی کی وفات تک قائم رہا اور یہ تعلق خوردو

بزرگ کا تھا۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ ممکن ہے آڑ میں بے تکلفی رہی ہو مگر سامنے تو وہ ہمیشہ مؤدب ہی رہتے تھے۔علامہ شبلی بھی انہیں آزاد کہہ کر پکارتے تھے۔ممکن ہے علمی مباحث میں اختلاف رائے ہوتا رہا ہو جیسا کہ اہل علم کے درمیان ہوتا ہے مگر بعد میں مولانا آزاد جب سلفیت کے زیراثر آئے اور علامہ دنیا سے جا چکے تو انہوں نے بعض تصانیف شبلی پر سخت تنقیدیں کیں خاص طور سے سیرۃ النعمان ان کا تختۂ مشق رہی۔حواشی ابوالکلام میں انہوں نے جو تنقیدیں کی ہیں وہ تو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔البتہ تذکرہ میں انہوں نے سیرۃ النعمان اور شبلی پر اعتراض کیا ہے۔غالباً اسی اعتراض کی بنیاد پر بعض اہل علم نے یہ رائے قائم کر لی کہ آخری دنوں میں مولانا آزاد علامہ شبلی سے اختلاف رکھتے تھے۔تذکرہ میں علامہ شبلی کا ذکر اسی سلسلہ کا ہے۔مولانا آزاد نے بحث کی ہے کہ علماء فرضی سوالوں کے جواب سے احتراز کرتے اور اسے بدعت قرار دیتے تھے۔ان کے بارے میں مولانا آزاد کا خیال ہے کہ:

''ان بزرگوں کا انکار ان کے کمال علم وحکمت وفہم اسرار شریعت و غوامض ہدایت امم و اجتماعی کا نتیجہ تھا۔ظاہر پرستانہ بے خبری و بے عقلی یا بالفاظ صریح بے وقوفی نہ تھی، جیسا کہ بہت سے لوگوں نے سمجھا اور جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرۃ النعمان میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔''(۴)

یہ الزام دراصل ان کی سلفیت کا نتیجہ ہے۔

حوالے

(۱) تذکرہ ص۲۰۴-۲۰۵ (۲) ایضاً ص۲۰۵

(۳) ایضاً ص۲۳۲ (۴) ایضاً ص۲۴۲

[۱۱]

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی

• مولانا ابوالکلام آزاد
[اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء]

یہ مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کی کہانی ہے، جسے انہوں نے اپنی قید کے دوران جیل میں مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی [۱۸۹۸-۱۹۵۹ء] کو املا کرایا تھا۔ اس کے قلم بند ہونے کا زمانہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء تا ۶ر جنوری ۱۹۲۳ء ہے۔ یہ مولانا آزاد کی وفات [۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء] کے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۵ء میں مکتبہ اشاعت القرآن دہلی سے شائع ہوا۔ اب اسے متعدد پبلشرز نے شائع کیا ہے۔ میرے پیش نظر اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی کی ۲۰۰۸ء کی اشاعت ہے۔ اس کتاب کے بارے میں اس کے ناقل مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب میں بعینہ وہی کچھ ہے جو مولانا [ابوالکلام آزاد] کی زبان سے نکلا۔ میں نے اس میں کسی قسم کا تصرف یا تغیر وتبدل خلاف دیانت سمجھا ہے۔''(۱)

عبدالرزاق ملیح آبادی، ملیح آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۱۰ء میں ندوہ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۱۲ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یقیناً اس دور میں علامہ شبلی سے تحصیل علم کیا ہوگا مگر اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔ ۱۹۱۲ء کے اجلاس ندوہ کی صدارت کے لئے علامہ شبلی نے شیخ رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر کو مدعو کیا تھا۔ ان سے متاثر ہو کر

عبدالرزاق ملیح آبادی مصر چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۵رسال تھی۔ پھر وہاں سے ترکی گئے اور اخبار جہانِ اسلام کی ادارت کی۔ ۱۹۱۷ء میں واپس آئے۔ ۱۹۱۸ء میں مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو پھر وہ انہیں کے ہو رہے۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں کلکتہ سے روز نامہ ہند کا اجرا کیا، جو بعد میں آزاد ہند ہو گیا۔ ان کے لائق فرزند احمد سعید ملیح آبادی ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ۲۴رجون ۱۹۵۹ء کو وفات پائی۔

عبدالرزاق ملیح آبادی بڑے جری اور جرأت مند تھے۔ مولانا آزاد کے ساتھ جد و جہد آزادی میں حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے بڑے عقیدت مندوں میں تھے اور شبلی بھی انہیں بے انتہا چاہتے تھے۔ آزاد نے ان کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، علامہ شبلی کی تحریک وقف علی الاولاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''جی چاہتا ہے کہ مولانا شبلی کی اس سعی و محنت کا شکریہ ادا کریں جو وہ تین، چار سال سے وقف علی الاولاد کے لئے فرما رہے ہیں، لیکن جو ذات یکسر وقف خدمت ملت ہو اس کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کیا جائے؟ وہ ہماری زبان، ہمارے لٹریچر اور ہمارے علوم و فنون کی ایسی گراں قدر اور عدیم النظیر خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے احسان سے تمام عالم اسلامی سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ لے لی ہے جس کی نسبت مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ صرف انہیں کے دم سے قائم ہے۔ ان کے یہی احسانات کیا کم تھے، مگر ان کا دل ملت خواہ جو سر تا سر درد اور محبت ہے، ہمارے دیگر ضروریات کو محسوس کرنے میں بھی اسبق و اقدم رہتا ہے اور جب محسوس کر لیتا ہے تو جوش ملت پرستی کو ضبط نہیں کر سکتا۔''(۲)

علامہ شبلی ایک بڑے خطیب و مقرر تھے۔ ان کی خطابت کے بارے میں آزاد کی رائے ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ قدرت آج صرف انہیں کو حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب و مدون تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ ان کا لکچر بلحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے، جس کو اگر قلم بند کرلیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامل رسائل شبلی میں ایک اضافہ ہو جائے۔''(۳)

یہ شبلی کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات تھے۔ اب آزاد کے بارے میں علامہ شبلی کا قول سنئے۔ وہ فرماتے ہیں:

''تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہئے۔''(۴)

یہاں آزاد کی کہانی خود آزادی کی زبانی کے ان مشمولات کا مطالعہ مقصود ہے جو انہوں نے علامہ شبلی کے متعلق بیان کئے ہیں۔ ان بیانات کی دو نوعیت ہے۔ ایک وہ جو براہ راست شبلی کے متعلق ہیں۔ دوسرے جن کا ذکر ضمناً آ گیا ہے۔

[ا]

علامہ شبلی کی پہلی کتاب غالباً جو مولانا آزاد کے مطالعہ میں آئی وہ المامون تھی اور غلطی سے ناول سمجھ کر انہوں نے منگالی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک ناول کے لوح پر نثار حسین کے قومی پریس کا اشتہار تھا اس میں ایک کتاب المامون بھی تھی۔ میں نے اسے بھی ناول سمجھا اور منگوالی، لیکن جب اسے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ تو کوئی دوسری چیز ہے۔ اردو کی نئی ادبی تصنیفات میں یہ پہلی کتاب ہے جو میں نے دیکھی۔ اس کے کچھ دنوں بعد جب شاعری کا شوق ہوا تو اس سلسلے میں آب حیات دیکھی، پھر حیات سعدی اور یادگار غالب نظر سے گذری۔''(۵)

مذکورہ اقتباس سے قیاس ہوتا ہے کہ ناولوں کے بعد جب مولانا آزاد علمی کتب کی طرف

متوجہ ہوئے تو انہوں نے محمد حسین آزاد اور حالی سے پہلے شبلی کی المامون کا مطالعہ کیا۔ یہ ان کی ابتدائی زندگی کا واقعہ ہے۔اس وقت وہ نو برس کے رہے ہوں گے۔

[۲]

مولانا آزاد نے سنہ ۹۹-۱۸۹۸ء کے اپنے واقعات کا جہاں ذکر کیا ہے اس میں یہ واضح طور پر کہا ہے کہ مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی، عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد وغیرہ نئے مصنفوں کی اکثر کتابیں میری نظر سے گذر چکی تھیں اور بقول خود انہیں کے نئے اردو علم و ادب کا پورا فہم وشوق حاصل ہو گیا تھا۔

[۳]

آزاد کی کہانی میں تیسرا ذکر شبلی کی معرکتہ الآرا کتاب الفاروق کا ہے۔اس کے حصول کے لئے انہوں نے منشی رحمت اللہ رعد [م:۱۹۲۱ء] سے خط و کتابت کی تھی۔(۶)

[۴]

مولانا آزاد کو اوائل عمر ہی میں خطابت کا شوق ہوا گیا تھا، چنانچہ ان میں یہ للک پیدا ہوئی کہ ''ملک کی مشہور کانفرنسوں، پلیٹ فارموں میں کھڑے نظر آئیں۔'' (۷) ایجوکیشنل کانفرنس اور حمایت اسلام لاہور کے جلسوں کی رودادوں سے مہمیز ہوتے، جس میں نامور مقررین مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، مولانا شبلی اور مولانا حالی وغیرہ خطاب کرتے تھے۔ ان خطباء میں ان کے لئے خاص کشش پیدا ہوگئی تھی۔(۸)

[۵]

مولانا آزاد کو جب عربی کتب مصادر کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے مشورہ کے لئے علامہ شبلی کا انتخاب کیا اور ان سے مشورہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون ہیں اور کہاں کہاں ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے جو میں نے مولانا کو لکھا۔انہوں نے دو سطروں میں

یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجئے۔ خیر میں نے پہلے وہاں سے فہرستیں منگوائیں اور پھر کتابیں منگواتا رہا۔''(۹)

اس اقتباس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں، ایک یہ کہ مولانا آزاد کو اوائل عمر یا سنہ بلوغت سے پہلے ہی عربی کتب و رسائل سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور وہ اس کے مطالعے کے لئے بے چین تھے۔ دوسرے یہ کہ اس عہد میں اسلامی علوم و فنون کے طالب علموں کی نگاہیں علامہ شبلی ہی کی ذات پر جا کر ٹھہرتی تھیں۔

مذکورہ اقتباس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کس سنہ کا واقعہ ہے۔ اس سلسلہ میں جن اہل قلم نے قیاس آرائیاں کی ہیں اور سنہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء طے کرنے کی کوشش کی ہے، وہ اس لئے درست نہیں معلوم ہوتیں کہ مولانا آزاد نے علامہ شبلی سے اپنی پہلی ملاقات کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ شبلی سے پانچ برس پہلے سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا، اس لحاظ سے خط و کتابت کے آغاز کا سنہ ۱۹۰۰ء قرار پاتا ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر ۱۲ یا ۱۳/سال کی تھی اور شبلی سے ان کی واقفیت چند سال پہلے المامون کے مطالعہ سے یقینی طور پر ہو چکی تھی۔

[۲]

مولانا آزاد کا بیان ہے کہ:

''سال بھر کے بعد جب ''خدنگ نظر'' میں نثر کا حصہ اور بڑھایا گیا تو اس حصہ کی ایڈیٹری بھی میرے متعلق کر دی گئی اور اب زیادہ اہتمام اور پابندی سے اس کے لئے مضامین مرتب کرنے لگا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس کے ایک مضمون کی بنا پر مجھے خط لکھا تھا جو عکس ریز یعنی ضوء غیر مرئی کی تاریخ انکشاف اور حقیقت پر لکھا تھا۔''(۱۰)

علامہ شبلی طلبہ بالخصوص اہل قلم کی حوصلہ افزائی کے لئے معروف ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی توجہ سے بہت سے اہل قلم پیدا ہوئے۔ مذکورہ بالا اقتباس اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ علامہ شبلی نو جوان اہل قلم کی خطوط کے ذریعہ بھی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

آزاد کا یہ مضمون خدنگ نظر کے مئی و جولائی ۱۹۰۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔

[۷]

مولانا آزاد ایک زمانہ میں سرسید سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ سرسید کے کلامی مباحث میں جو امور تشنہ اور تصریح طلب تھے، انہیں ان کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اس سلسلہ کی معلومات حاصل کرنے کے لئے علامہ شبلی سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''لطف کی بات یہ ہے، اس کے لئے میں نے مولانا شبلی مرحوم کو بھی خط لکھا اور نئی تصنیفات کے بارے میں (معلومات) دریافت کیں، حالاں کہ وہ خود اس زمانے میں اپنی کتاب علم کلام جدید لکھ رہے تھے اور گو اس باب میں ان کا مسلک اصولاً سرسید سے الگ نہ تھا، لیکن وہ تمام نئے مسائل ابن رشد، ابن آمدی، ابن مسکویہ، راغب اصفہانی، امام غزالی اور معتزلہ وحکمائے اسلام کی نسبت سے تسلیم کرنا پسند کرتے تھے۔ سرسید کی نسبت پسند نہ تھی۔ انہو ں نے مجھے لکھا ''مرادروے گفتن نہ شاید۔'' (۱۱)

مولانا آزاد کا یہ خیال ۱۹۰۲ء-۱۹۰۳ء کے درمیانی عرصہ کا ہے۔ اس لئے کہ علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی پہلی کتاب الکلام کا زمانہ تصنیف یہی عرصہ ہے۔

شبلی کو سرسید کے مذہبی افکار سے اتفاق نہیں تھا، اس لئے یہ قطعی ہے کہ وہ سرسید کی نسبت پسند نہیں کرتے تھے اور غالباً اسی لئے ان کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات میں سرسید کا کہیں نام نہیں آیا ہے۔

[۸]

مولانا ابوالکلام آزاد نے نومبر ۱۹۰۳ء میں کلکتہ سے لسان الصدق جاری کیا۔ اس نے علمی وادبی حلقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ مولانا آزاد نے لسان الصدق کے علمی معاونین کی جو فہرست شائع کی ہے، اس میں علامہ شبلی کا نام سرفہرست ہے۔ (۱۲) علامہ شبلی اس زمانہ میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے اور ان کا قیام حیدرآباد میں ناظم سررشتہ علوم وفنون کی حیثیت

سے تھا۔اس کی داستان مولانا آزاد سے سنئے :

''اسی زمانہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مرحوم مولانا شبلی اس کے ناظم تھے۔انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے خط و کتابت کی تھی اور انہوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا۔دوسری شاخ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاح رسوم قائم کی تھی اور عصر جدید نکالا تھا۔اس میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کئے گئے،یعنی ترقی اردو اور اصلاح رسوم۔اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔انجمن ترقی اردو نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا اور مولانا (شبلی) مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید،دلچسپ باتیں ہوتی تھیں انہیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لئے بھیج دیتے تھے اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کر دی تھی کہ اس پرچے کو ضرور منگوائیں۔اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی ۔ دو تین نمبروں کے بعد ہی چھ سات سو خریدار ہو گئے۔''(۱۳)

مولانا آزاد نے جس وقت لسان الصدق جاری کیا تھا،ان کی عمر ۱۵۔۱۶ رسال کے درمیان تھی۔اس عمر میں یہ اٹھان اگر منفرد تھی تو دوسری طرف شبلی جیسا صاحب علم وفضل ایک نوجوان اہل قلم کی تربیت اور حوصلہ افزائی کے لئے کمر بستہ تھا اب یہ مثالیں مفقود ہیں۔

[۹]

اب تک مولانا آزاد کا علامہ شبلی سے خط و کتابت سے رابطہ تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ملاقات کا دلچسپ قصہ ملاحظہ ہو،مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا،

جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک ادھر اودھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں۔ میں نے کہا نہیں میں خود ہوں۔'' (۱۴)

[۱۰]

مولانا آزاد نے ۹۔۱۰ برس کی عمر میں اسلامی علوم وفنون کے مصادر کے مطالعہ کا آغاز کیا۔ اس سلسلہ میں وہ مولانا شبلی سے برابر رابطہ میں رہے۔ جب وہ ۱۶/ برس کی عمر کو پہنچے تو کس درجہ بالغ نظر ہو گئے تھے، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے، جس کا عنوان ہے ''مولانا شبلی کی حیرت''۔ وہ فرماتے ہیں:

''جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے ''محصل'' کا ذکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا۔ اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گذری تھی اور اس کے انطباع کی انہیں خبر نہ تھی، لیکن اس حسن ظن کی وجہ سے جو امام صاحب سے تھا مثل حکمت مشرقیہ شیخ کے اس کا بھی ان کو نہایت اشتیاق تھا۔ پہلے تو انہوں نے عرصہ تک اسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ جس چیز کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ ان ہی کی مطلوبہ محصل ہے، لیکن جب میں نے اس کے مباحث پر بطور تقریر کے بہت سے خطاب بیان کئے اور پھر دوسرے دن انہیں مطبوعہ نسخہ بھی دے دیا تو میری نسبت انہیں بہت اچھا خیال پیدا ہوا اور استغراب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اگرچہ ان کے توقعات محصل سے پورے نہیں ہوئے۔'' (۱۵)

[۱۱]

جس زمانہ میں بمبئی میں مولانا آزاد کی علامہ شبلی سے ملاقات ہوئی اور علامہ ان سے بے حد متاثر ہوئے اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ شبلی نے انہیں الندوہ سے وابستہ ہونے اور حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ علامہ شبلی کا قیام اس وقت

حیدرآباد میں تھا۔اس کی تفصیل مولانا آزاد نے''مولانا شبلی کا اصرار'' کے عنوان سے قلم بند کرائی ہے۔وہ تحریردرج ذیل ہے:

''۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔وہاں سے جب واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔یہ پہلی ملاقات تھی۔اس وقت مولانا مرحوم حیدرآباد میں ناظم علوم وفنون تھے اور تقریباً پانچ سال سے میری خط وکتابت ان سے جاری تھی۔میں ان کی ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں۔میں چوں کہ ان کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا،اس لئے ان کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت وصحبت کا موقع حاصل ہو۔

مولانا تقریباً دو تین ہفتہ رہے اور اکثر اوقات میں ان کے ساتھ رہا۔اسی زمانے میں مولانا مرحوم نے الندوہ جاری کیا تھا۔شاید ایک یا دو نمبر نکل چکے تھے۔جب چند دنوں میں گفتگو وصحبت سے انہیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہوگیا تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔تم اگر کسی طرح حیدرآباد آسکو تو الندوہ اپنے متعلق کرلو اور وہاں مزید مطالعہ وترقی کا موقع ملے گا۔

ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کے دیکھ رہے تھے،اس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا،اس میں میرے مضامین بھی تھے۔پڑھ کر انہوں نے بہت اصرار کیا۔اسی میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد وحقیقت پر تھا۔انہوں نے کہا جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بغیر کسی مشغلے کے ہو؟ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لئے لکھ دیا کرو۔

سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوق مطالعہ اور وسعت مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس وقت تک میرا مطالعہ اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور نئی تصنیفات تقریباً میری نظر سے گذر چکی تھیں اور بہتیری کتابیں ایسی تھیں کہ مولانا ان کے شائق تھے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں، مثلاً محصل امام رازی جس کا ذکر آ چکا ہے۔'' (۱۶)

[۱۲]

مولانا ابوالکلام آزاد کا مطالعہ کس قدر وسیع و عمیق تھا اس کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباس سے ہوا ہوگا۔ ان کا ایک اور بیان جو کتاب میں شامل ہے، اس سے بھی ان کے علم و فضل کے ساتھ ان کے جوہر خطابت اور علامہ شبلی سے گہرے شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''پٹنہ کے ایک شخص علی محمود جن کا انتقال ہو چکا ہے، اس وقت بمبئی میں تھے اور وہ بھی برابر مولانا سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں اس ہوٹل میں گیا جہاں مولانا (شبلی) ٹھہرے ہوئے تھے تو دیکھا کہ ایک بحث بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ علی محمود سے شاید مولانا نے کہا تھا کہ فن مناظرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کی گفتگو کس قدر بے اسلوب ہوتی ہے اور انہوں نے بتلایا تھا کہ رشیدیہ اس میں اچھا متن ہے، جسے وہ لے کر آئے تھے۔ ایک اور مولوی نظام الدین پنجاب کے تھے، وہ بھی پہنچ گئے تھے اور اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جب میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ رشیدیہ کے بعض مطالب مولانا علی محمود کو سمجھانا چاہتے ہیں لیکن مولوی مذکور بار بار الجھ پڑتا ہے اور ہر چند وہ سمجھاتے ہیں لیکن کج بحثی بڑھتی جاتی ہے۔ میں بھی ایک دو موقع پر بول اٹھا اور پھر مولوی نظام الدین کو مخاطب کر کے میں نے بعض باتیں جو مابہ النزاع ہو رہی تھی کہیں۔ اس پر مولانا شبلی میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو۔ میں نے اس حصہ کتاب پر

ایک اچھی خاصی بسیط تقریر کر ڈالی۔ اس وقت مجھے درسیات خوب مستحضر تھیں۔ نیا نیا پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوا تھا۔ اعتراضات اوران کی بحثیں بھی بار بار منجھ چکی تھیں۔ میں نے بڑی زوردار تقریر کی اور اگر چہ بات کچھ بھی نہ تھی لیکن مولانا شبلی مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے کہ بار بار تعریف کرتے اور کہتے کہ تمہارا ذہن ودماغ عجائب روزگار میں سے ہیں۔ تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہئے۔'' (۱۷)

اس اقتباس میں جس علی محمود صاحب کا ذکر آیا ہے باوجود تلاش بسیار کےان کے بارے میں تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ رشید یہ دیوان محمد رشید جونپوری جن کا مزار اور خانقاہ جونپور شہر میں ہے، کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔

[۱۳]

علامہ شبلی مولانا آزاد کی خداداد صلاحیتوں سے متاثر ہوتے چلے گئے اور ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں اپنے قریب رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے مولانا آزاد کو خطوط لکھے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا (شبلی) مرحوم کی رائے میری نسبت اچھی قائم ہوئی اور پھر ان کی شفقت اور بزرگی کی وجہ سے بڑھتی ہی گئی۔ دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں۔ اس زمانے میں جیسا کہ کسی دوسرے موقع پر کہوں گا، میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہورہے تھے کہ گھر کی زندگی سے جو کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی اور اس لئے خیال ہوتا تھا کہ اچھا موقع ہے، ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آئی ہے، چلا جانا چاہئے ،لیکن بعض اور وابستگیاں اس وقت کی زندگی کی ہوس پرستیوں سے ایسی پیدا ہوگئی تھیں کہ قدم روک لیتی تھیں۔'' (۱۸)

[۱۴]

بالآخر علامہ شبلی کا اصرار غالب آیا اور مولانا آزاد نے ندوہ میں قیام اور ماہنامہ الندوہ کی ادارت قبول کر لی۔ اس کی داستان انہیں سے سنئے:

''اس اثنا میں مولانا مرحوم نے [حیدرآباد سے] استعفیٰ دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر ندوہ کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں اور اعظم گڑھ ہو کر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے انہوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے لکھنؤ میں آ کر رہو تو حیدرآباد سے بھی بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔

اس مرتبہ میں نے قطعی ارداہ کر لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا، لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سن کر پھر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور ان کا تار آ چکا ہے کہ اگر ہو سکے تو خود اعظم گڑھ جاؤ۔ چنانچہ میں اعظم گڑھ گیا۔ عجیب اتفاق، جس دن پہنچا اسی دن ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا اور الندوہ کی ایڈیٹری انہوں نے میرے متعلق کر دی، تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔''(۱۹)

[۱۵]

شبلی و آزاد کے ربط و تعلق کی یہ داستان مولانا آزاد کی زبانی ہے اور اب مولانا آزاد شبلی کی خواہش اور اصرار پر ندوہ آ چکے تو عبقریوں کی یکجائی کی داستان سنئے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

''ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ صبح سویرے اٹھنے کے

عادی تھے اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر۔ جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا، اسی وقت چائے کا دور چلتا، طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص ٹون میں ترنم کرتے، ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے، شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی و ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتاً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی ۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا ۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہو گئے وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پرلطف صحبت تھی جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی ۔ ان کا علمی ذوق، جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ان کے ساتھ ہی مدفون ہو چکا ہے۔'' (۲۰)

مولانا آزاد کی یہ ناقابل فراموش یادیں اس ندوہ سے وابستہ تھیں جو گولہ گنج لکھنؤ کی خاتون منزل میں قائم تھا۔ علامہ شبلی کا قیام اس کے بالائی حصے میں تھا۔

[۱۶]

مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک الندوہ کی ادارت سے وابستہ رہے، مگر پھر کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ انہیں الندوہ کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس واقعہ کی انہوں نے صراحت نہیں کی ہے اور نہ کسی اور ذرائع سے معلوم ہو سکا۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر وہاں کے حالات رہے ہوں، اس لئے کہ مولانا آزاد ندوے کے روشن خیال علماء سے بیزار نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جو لوگ ندوے کے لئے سرگرم تھے، ان کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی ۔ چوں کہ پانچ چھ مہینے تک ان سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اس لئے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔

میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیاداروں کی سی کارروائیاں کی

جارہی ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لئے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں اور عوام پر اثر کرنے کے لئے خصوصی حالتیں اختیار کی جاتی تھیں۔''(۲۱)

[۱۷]

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کی یہ آخری تحریر جو شبلی اور الندوہ کی داستان کا حصہ ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''الندوہ میں ان (شبلی) کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ ایک دو نمبر ایسے بھی نکلے کہ تمام تر مجھی کو بھرنا پڑا، لیکن اس کے بعد بمبئی میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا کہ میں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوا اور بمبئی آیا......لیکن میں مولانا شبلی سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔''(۲۲)

مولانا آزاد کی ماہنامہ الندوہ کی ادارت کے زمانہ کی تمام کوششوں اور کاوشوں کی تفصیل اور ان کے مضامین وغیرہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے ''مضامین الندوہ'' کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دئے ہیں، جسے پورب اکادمی اسلام آباد نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر آ چکا ہے مولانا آزاد کو علامہ شبلی سے علاحدہ ہونا پسند نہ تھا اور واقعی وہ شبلی کی آخری سانس تک ان سے علاحدہ نہ ہوئے۔ مولانا شبلی کی ان کے تئیں شفقتوں اور آزاد کے اعترافات شبلی کی ایک طویل داستان ہے، جس کے مطالعہ و جائزہ کا کام اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ یہاں ان گوشوں کی وضاحت کی جاتی ہے جن کا مطالعہ ضروری ہے:

[۱]

دونوں کے آغاز تعلقات سے مولانا آزاد کے وکیل امرتسر جانے تک کا ذکر آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی میں بڑی حد تک آ گیا ہے، جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس دوران شبلی و آزاد کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، گر چہ مولانا آزاد کے خطوط دستیاب

نہیں اور نہ وہ ہمارے مطالعہ کا حصہ ہیں لیکن ان کے مطالعہ کے بغیر داستان کے مکمل نقوش سامنے نہیں آسکتے۔آزاد کی شبلی سے پہلی ملاقات [۱۹۰۴ء] سے پہلے لسان الصدق جاری ہوا اور ملاقات کے بعد محض ایک شمارہ شائع ہوا اس کے صفحات میں ان نادرہ روزگاروں کے تعلقات کے روشن نقوش ثبت ہیں۔راقم نے اپنے ایک مقالہ میں قدرے تفصیل سے ان کا جائزہ لیا ہے جو میری کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں شامل ہے۔

[۲]

وکیل امرتسر کے زمانہ سے الہلال کے خاتمہ تک کے درمیان بھی شبلی و آزاد کے روابط اسی طرح استوار رہے۔اس دور کے دونوں کے چند خطوط دستیاب ہیں جو مکاتیب شبلی [اول مرتبہ سید سلیمان ندوی، ۴۰رخطوط] اور مکتوبات شبلی [مرتبہ: راقم الحروف ۱۹رخطوط] میں شامل ہیں، ان سے ان کے تعلقات کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس موضوع پر محمد حسنین کی کتاب ''خطوط شبلی بنام آزاد'' بہت اہمیت کی حامل ہے اور بہت ہی قابل قدر کام ہے۔اس میں خطوط کے عکس بھی دئے گئے ہیں۔اسے بہار اردو اکادمی پٹنہ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔یہ منفرد کام دراصل اس سلسلہ کا آغاز تھا کہ علامہ شبلی کے تمام مکتوب الیہ اوران کے نام کے خطوط کا بالتفصیل جائزہ لیا جائے، مگر اس کی طرف پھر کسی نے توجہ نہ دی، اب بھی اردو ادب کا یہ ایک اہم موضوع ہے۔

[۳]

الہلال سے شبلی کا انتہائی گہرا رشتہ رہا، اس کا مفصل مطالعہ و تجزیہ راقم کی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں پیش کیا جا چکا ہے۔الہلال کا آخری شمارہ ۱۸رنومبر ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا اور یہی تاریخ علامہ شبلی کی وفات کی بھی ہے گویا دونوں ہلال ایک ہی دن غروب ہوئے۔

[۴]

البلاغ میں بھی ذکر شبلی ہے۔راقم اس پر بھی ایک مستقل مضمون لکھ چکا ہے اور وہ بھی ''شبلی اور جہان شبلی'' میں شامل ہے۔

[۵]

تذکرہ، غبار خاطر اور کاروان خیال کے صفحات بھی ذکر شبلی سے روشن ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کا تعارف و تجزیہ قلم بند کیا جائے۔

[٦]

مولانا آزاد نے تصانیف شبلی پر جو حواشی لکھے ہیں اور جسے سید مسیح الحسن نے حواشی ابوالکلام کے نام سے مرتب کر دیا ہے، اس کا مطالعہ و تجزیہ بھی ایک ضروری علمی کام باقی ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر آزاد نے شبلی کو یاد رکھا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ شبلی کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ ربط و تعلق اور فکر و نظر کی ہم آہنگی کی یہ طویل اور منفرد داستان ایک مفصل مطالعہ چاہتی ہے۔ خاص طور پر سیاسی نقطہ نظر کی ہم آہنگی کا تجزیہ بہر حال باقی ہے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ملک میں اہل علم و دانش کا ایک طبقہ انہیں شبلی کے سیاسی خیالات کا نمائندہ خیال کرتا ہے۔

حوالے

(۱) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۸

(۲) ماہنامہ الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء ص ۱۳

(۳) ایضاً ص ۱۱

(۴) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۹۶

(۵) ایضاً ص ۱۵۳

(٦) ایضاً ص ۱۵۷

(۷) ایضاً ص ۲۰۸

(۸) ایضاً ص ۲۰۸

(۹) ایضاً ص ۱۵۹

(۱۰) ایضاً ص۱۷۴

(۱۱) ایضاً ص۲۵۲

(۱۲) لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء ص۱۴

(۱۳) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص۱۹۰-۱۹۱

(۱۴) ایضاً ص۱۲۹

(۱۵) ایضاً ص۱۳۹-۱۴۰

(۱۶) ایضاً ص۱۹۴-۱۹۵

(۱۷) ایضاً ص۱۹۵-۱۹۶

(۱۸) ایضاً ص۱۹۶

(۱۹) ایضاً ص۱۹۶-۱۹۷

(۲۰) ایضاً ص۱۹۷

(۲۱) ایضاً ص۱۳۲

(۲۲) ایضاً ص۱۹۷-۱۹۸

(تصویر: ملاواحدی)

[۱۲]

میراافسانہ

• ملاواحدی

[آکسفورڈیونیورسٹی پریس کراچی،طبع اول ۲۰۱۵ء]

محمدارتضیٰ معروف بہ ملاواحدی[۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] دہلی کے رہنے والے اردو کے ممتاز اہل قلم تھے۔دہلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے۔۸۸سال عمر پائی اور۷۰سال تک لکھتے رہے یہی وجہ ہے کہ تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۸ - ۱۹۵۵ء] سے عقیدت مندانہ مراسم قائم ہوئے تو ان کے اشتراک سے ۱۹۰۹ء میں دہلی سے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا جسے وہ پچاس برس تک نکالتے رہے۔دہلی میں ۱۹۴۷ء کے فسادات سے دل برداشتہ ہوکر ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان کی راہ لی،جس وقت انہوں نے ہجرت کی اس وقت وہ آٹھ رسائل اور ایک اخبار کے مدیر تھے۔اسی پر دیوان سنگھ مفتون [۱۸۹۰ - ۱۹۷۵ء] نے کہا تھا کہ واحدی کو چہ چیلان کو رسالوں اور اخباروں کا قبرستان بنا کر گئے۔(۱) حالانکہ ان کی زبان پر یہ نوحہ تھا کہ:

تذکرہ دہلی مرحوم کا نہ چھیڑ اے دوست
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

ان کے لکھنے پڑھنے کا آغاز نو جوانی اور طالب علمی میں ہوا۔بے شمار مضامین ومقالات، انشاییٔ اور خاکے لکھے ان کے علاوہ ان کی متعدد کتابیں میرے زمانے کی دلی، دلی کا پھیرا، دلی جوایک شہر تھا، میرا افسانہ، سوانح خواجہ حسن نظامی، حیات سرور کائنات، تاثرات وغیرہ شائع

ہوئیں، ان میں میرے زمانے کی دلی بہت مشہور ہوئی، ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ تاثرات بھی قابل ذکر ہے جسے حکیم محمد سعید دہلوی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ ملا واحدی نے دلی اور دلی والوں پر بائیس تئیس برس تک لکھا۔ دہلی سے متعلق ان کی کتاب ''نا قابل فراموش لوگ اور نا قابل فراموش باتیں'' خدا جانے شائع ہوئی یا نہیں۔ اسی طرح ''تاثرات'' کا ایک اور ضخیم مجموعہ مرتب کیا تھا غالباً اس کی اشاعت کی بھی نوبت نہیں آئی۔ اخیر دور میں اپنی خودنوشت میرا افسانہ اپنے بچوں کے لئے لکھی جو نامکمل رہی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بچوں نے اسے سائیکلو اسٹائل کرا کے تقسیم کیا، جسے مشہور محقق مالک رام [۱۹۰۶-۱۹۹۳ء] نے اپنے رسالہ تحریر دہلی [جولائی ستمبر ۱۸۷۸ء] میں شائع کیا۔ ۲۰۱۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے اس کا ایک خوب صورت ایڈیشن شائع کیا ہے۔ راقم کے پیش نظر یہی اخیر اشاعت ہے۔

ملا واحدی کے بارے میں گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل ان کی آپ بیتی ''میرا افسانہ'' سے ماخوذ ہے۔ البتہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ میرا افسانہ میں انہوں نے ان بزرگوں اور احباب کا بھی ذکر کیا ہے جن سے رسالہ نظام المشائخ کے توسط سے روابط قائم ہوئے، ان میں ایک اہم نام علامہ شبلی کا بھی ہے۔

دور طالب علمی میں ملا واحدی کی نصابی کتابوں سے طبیعت اچاٹ ہوئی تو غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے اور پھر اس کی ایسی چاٹ لگی کہ تعلیم ادھوری رہ گئی، اس دور میں انہوں نے جن اساطین علم وادب کا مطالعہ کیا، اس میں ایک اہم نام علامہ شبلی کا نعمانی کا بھی ہے۔ (۲)

۱۹۰۸ء میں علامہ شبلی نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا کہ میں تھک گیا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں چنانچہ خواجہ صاحب نے انہیں دہلی بلا لیا۔ اس پوری مدت میں ملا واحدی ان کے ساتھ مقیم رہے۔ (۳) ملا واحدی نے اس واقعہ کا ذکر اپنی آپ بیتی میں اس طرح کیا ہے:

> ''نظام المشائخ کے اجرا کے بعد سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی ہمارے ہاں تشریف لائے اور تقریباً مہینہ بھر ٹھہرے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو مولانا شبلی نے کسی خط میں لکھا تھا کہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور سوچ

رہا ہوں کہ مہینہ بھر کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں۔خواجہ صاحب نے جواب دیا
کہ کہیں نہ جایئے یہاں تشریف لے آیئے، سکون کا پورا بندوبست کر دیا
جائے گا۔مولانا نے یہ تجویز اس شرط پر منظور فرمائی کہ آپ صرف قیام کا
انتظام کریں، طعام کا انتظام میرا باورچی کرے گا، باورچی کو لاؤں گا۔''(۴)

واحدی صاحب نے تاثرات میں بھی ''علامہ شبلی کی یاد'' کے عنوان سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی نعمانی ایک دفعہ دلی تشریف لائے اور خواجہ حسن نظامی کے
ہاں مہینہ بھر ٹھہرے۔خواجہ صاحب اس زمانے میں نواب بڈھن کے کمرے
میں رہتے تھے جو [دہلی میں] اعظم خاں کی حویلی کے سامنے تھا، کمرہ کیا پورا
دیوان خانہ تھا۔ کمرے سے متصل نواب بڈھن کی محل سرا تھی۔نواب غلام
نصیرالدین عرف نواب بڈھن رئیس شیخوپورہ برناوہ ضلع میرٹھ نے کمرہ اور محل
سرا دونوں خواجہ صاحب کے سپرد کر کے رکھے تھے۔رسالہ نظام المشائخ کی
ابتدا اسی کمرے سے ہوئی تھی، جو میں نے اور خواجہ صاحب جاری کیا تھا۔''
خیر یہ ۱۹۰۸ء کی بات ہے، نظام المشائخ کے اجراء سے سوا سال پہلے
کی، مگر میں اس کمرے اور محل سرا میں آنے جانے لگا تھا۔''(۵)

ملا واحدی نے علامہ شبلی کا سفر دہلی کا سال ۱۹۰۸ء اور ضیاء الدین احمد برنی [۱۸۹۰-۱۹۶۹ء] نے عظمت رفتہ میں ۱۹۰۹ء لکھا ہے، (۶) اور مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۴ء (۷) چونکہ کسی اور مقام مکاتیب شبلی وغیرہ میں اس سفر کا ذکر نہیں ملتا اس لئے صحیح سنہ طے نہیں کیا جا سکا۔

علامہ شبلی نے ۱۹۱۴ء میں بھی دہلی کا ایک سفر کیا تھا۔ممکن ہے اس سفر میں بھی خواجہ حسن نظامی سے ملاقات ہوئی ہو لیکن تصوف پر تقریر کا واقعہ ۱۹۰۸ء ہی کا ہے جیسا کہ ملا واحدی نے صراحت سے لکھا ہے۔

ملا واحدی چونکہ علامہ شبلی کے قیام دہلی میں ان کی مجالس کے حاضر باشوں میں تھے اس

لئے انہوں نے علامہ کو قریب سے دیکھا تھا، ان کے معمولات تصنیف و تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ علامہ شبلی صرف آٹھ بجے سے دس بجے تک لکھنے کا کام کرتے ہیں اور دس بجے کے بعد یا اخبار رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں، یا لوگوں سے ملتے جلتے ہیں، آٹھ سے دس بجے تک کے لئے ہدایت تھی کوئی آئے، مت آنے دو، اور کچھ ہو جائے مت خبر کرو۔''(۸)

علامہ شبلی کے دوسرے سفر دہلی میں بھی جو ۱۹۱۳ء میں ہوا تھا ان کا یہی معمول رہا، ملا واحدی لکھتے ہیں:

''دوسری دفعہ غالباً ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی دلی تشریف لائے اور حکیم اجمل خاں کے ہاں قیام فرمایا، وہاں بھی آٹھ سے دس [بجے] تک وہ تخلیہ کرتے تھے اور ان کے قریب پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

علامہ شبلی کی تمام معرکتہ الآرا تصانیف دو گھنٹے روزانہ لکھنے کی کرامات ہیں۔ دو گھنٹے سے زیادہ لکھنا ان کے نزدیک حرام تھا اور دو گھنٹہ پابندی سے لکھنا فرض۔ اسے وہ سفر و حضر میں نباہتے تھے۔ باقی اوقات میں کبھی کھانا بھی پکا لیتے تھے۔ پکانے کا غالباً شوق تھا اور کھانا کھانا بھی جانتے تھے۔''(۹)

علامہ شبلی نے خواجہ صاحب سے یہ شرط رکھی تھی کہ طعام کا انتظام وہ خود کریں گے۔ اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب نے نواب بڈھن کی پوری محل سرا مولانا کے سپرد کر دی جہاں وہ باورچی سے آگ ضرور سلگواتے تھے اور چپاتیاں پکواتے تھے، باقی سالن اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔''(۱۰)

نواب بڈھن کی محل سرا میں خواجہ حسن نظامی کی خواہش پر علامہ شبلی نے تصوف کے موضوع پر تقریر کی جسے چند لوگوں نے مل کر نقل کیا اور جسے نظام المشائخ دہلی کے ۱۹۰۹ء کے کسی

شمارے میں شائع کیا گیا۔ نظام المشائخ کا یہ شمارہ راقم کو اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے اس لئے تصدیق نہیں کی جاسکی کہ وہ خطبہ خطباتِ شبلی میں شامل ہے یا نہیں؟

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خطبہ سے خواجہ حسن نظامی کے متاثر ہونے کا ذکر کیا حیاتِ شبلی میں مولوی اکرام اللہ خاں [م: ۱۶/جنوری ۱۹۵۲ء] ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ کے حوالہ سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر تصوف قالی چیز ہوتی تو میں آج آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔'' (۱۱)

ضیاء الدین احمد برنی جو اس خطبہ کے سامعین میں تھے اپنی کتاب ''عظمت رفتہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''تقریر سے قبل ہم میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ چونکہ علامہ صوفی منش بزرگ نہیں اس لئے تصوف جیسے موضوع پر ان کی تقریر بالکل خشک ہوگی، لیکن جب انہوں نے تقریر ختم کی تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے کم سے کم یہ محسوس کیا کہ علامہ تو چھپے رستم ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنید یا بایزید بسطامی کے پایہ کا کوئی درویش ہے جو تصوف کے رموز و نکات کے دریا بہائے چلا جا رہا ہے۔ تقریر کے بعد جس عقیدت مندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔'' (۱۲)

تاثرات میں ایک جگہ ملا واحدی نے منصف مزاج مستشرقین کا ذکر کیا ہے، اس میں علامہ شبلی کا ایک قول نقل کیا ہے:

> ''بعض منصف مزاج مستشرقین یورپ حضورؐ کی زندگی کے وہ محاسن اور کمالات کے بیان کر جاتے ہیں کہ بڑے بڑے ذی علم مسلمانوں کی نظر ان تک کم جاتی ہے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی راکھ کے ڈھیر میں سونے کے ذرے

نکال لیتے ہیں، منصف مزاج ہی نہیں متعصب مستشرقین نے بھی صف انبیاء کا ہیرو حضورؐ ہی کو قرار دیا ہے۔'' (۱۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملا واحدی نے شبلی کی تحریروں کو بڑے غور سے پڑھا تھا، مگر انہوں نے حوالہ نہیں دیا ہے کہ یہ قول کہاں سے نقل کیا گیا ہے۔

تاثرات کا ایک عنوان ''مولانا ابوالکلام کی یاد'' ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان سے پہلی ملاقات کان پور ریلوے اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ دوسری ملاقات کی تفصیل میں علامہ شبلی کا بھی ذکر ہے۔ لکھتے ہیں:

''ندوۃ العلماء کا دلی میں اجلاس تھا جس کی صدارت کرنے مصر سے علامہ رشید رضا آئے تھے۔ مولانا شبلی، مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اور خدا معلوم کتنے بڑے بڑے علما مطبع مجتبائی میں مقیم تھے۔ مولانا ابوالکلام کا کمرہ مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن کے کمروں کے درمیان تھا۔ ایک طرف مولانا شبلی دوسری طرف مولوی حبیب الرحمٰن شروانی، صرف دو ہی شخص ایسے تھے جن سے شاید ابوالکلام متاثر رہے ہوں، لیکن میں اور خواجہ حسن نظامی کئی مرتبہ مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے پاس گئے۔ مولانا ابوالکلام کو ایک مرتبہ بھی ان دونوں کے کمروں میں قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ شام کے وقت سب علما ٹکڑیاں بنا کر صحن میں بیٹھا کرتے تھے۔ اس وقت مولانا ابوالکلام بھی باہر نکلتے تھے اور مولانا شبلی اور مولوی حبیب الرحمٰن کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ میری دوسری ملاقات مولانا ابوالکلام سے اسی شام کی مجلس میں ہوئی۔'' (۱۴)

ندوۃ العلماء کا وہ اجلاس جس کی صدارت علامہ رشید رضا نے کی تھی وہ تو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور مطبع مجتبائی دہلی میں تھا۔ راقم یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ملا واحدی جو خود اس اجلاس میں شریک تھے انہیں کیسے التباس ہوا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ ندوہ کا ۱۹۱۰ء کا اجلاس دہلی میں ہوا

تھا غالباً ملا واحدی اور خواجہ حسن نظامی اس میں شریک ہوئے ہوں اور ۱۹۱۲ء کے لکھنؤ اجلاس میں بھی شریک رہے ہوں اس وجہ سے دونوں کی روداد بیان کرنے میں لکھنؤ اور دہلی میں شبہہ ہو گیا ہو۔ البتہ ملا واحدی نے اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی دانی اور خطابت کا جوذکر کیا ہے اسے سید صاحب نے بھی حیات شبلی میں قلم بند کیا ہے۔ ملا واحدی لکھتے ہیں:

''علامہ رشید رضا نے خطبہ لکھا نہیں تھا، علامہ برجستہ بولے تھے۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی [استاد مولانا شبلی] کے ذمہ تھا کہ ترجمہ کریں گے، مگر ترجمہ کرنے لگے تو متبحر عالم ہونے کے باوجود سٹ پٹا گئے، مولانا شبلی نے فوراً مولانا ابوالکلام کو اشارہ کیا۔ مولانا اگلی صف سے اٹھے اور اسٹیج پر پہنچے اور حاضرین سے کہا کہ الگ الگ فقروں کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ صاحب صدر کی تقریر ختم ہونے دیجئے پوری تقریر کا ترجمہ ایک ساتھ کردوں گا۔ چنانچہ تیئیس سالہ ابوالکلام نے ایسا مربوط ترجمہ سنایا کہ بوڑھے اور متبحر علما کو متحیر کر دیا۔'' (۱۵)

ملا واحدی کے اس اقتباس سے جہاں مولانا آزاد کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں پہلی بار یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ رشید رضا کی تقریر کے ترجمہ کی ذمہ داری مولانا فاروق چریا کوٹی کے ذمہ تھی۔

ملا واحدی کے ان چند اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف علامہ شبلی سے ملے تھے، ان کی تحریروں کو بغور پڑھا تھا بلکہ ان سے متاثر بھی تھے۔

حوالے

(۱) تاثرات ص ۲۲

(۲) ایضاً ص ۲۱

(۳) عظمت رفتہ ص ۲۶۵

(۴) میرا افسانہ ص ۶۸

(۵) تاثرات ص ۴۶

(۶) عظمت رفتہ ص ۲۶۱

(۷) حیات شبلی ص ۴۸۷

(۸) تاثرات ص ۴۶

(۹) ایضاً ص ۴۷

(۱۰) میرا افسانہ ص ۶۸

(۱۱) حیات شبلی ص ۴۸۷

(۱۲) عظمت رفتہ ص ۲۶۶

(۱۳) تاثرات ص ۱۰۲-۱۰۳

(۱۴) ایضاً ص ۲۵۸

(۱۵) ایضاً ص ۲۵۹

---

[۱۴]

سرگذشت

• مولانا عبدالباری ندوی

[مشمولہ ''مذہب اور سائنس''، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، طبع سوم ۱۹۹۱ء]

علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں مولانا عبدالباری ندوی فلسفی [۱۸۸۹-۱۹۷٦ء] کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ ان کی تربیت کا ایک اعلیٰ نمونہ اور ان کے عزیز ترین شاگرد تھے، سرگذشت ان کی مستقل خودنوشت نہیں بلکہ ان کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ ہے جو انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''مذہب اور سائنس'' کے آغاز میں قلم بند کیا ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی ۱۸۸۹ء میں گدیہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے، ان کے والد حکیم عبدالخالق، مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے مرید تھے، انہوں نے اپنے بیٹے کی بسم اللہ اپنے شیخ سے کرائی، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۲ء میں وہ ندوہ میں داخل ہوئے، کچھ دنوں بعد ان کے والد نے ندوہ کی تعلیم غیر اطمینان بخش ہونے کی بنا پر وہاں سے نکال کر مولانا محمد ادریس صاحب کے پاس قصبہ نگرام بھیج دیا۔ جب علامہ شبلی معتمد تعلیم ہو کر ندوہ آئے تو ان کے والد نے دوبارہ داخل کیا اور پھر تمام تعلیم یہیں مکمل کی اور اپنی محنت اور ذہانت کی وجہ سے علامہ شبلی کی خصوصی شفقتوں کے مستحق ٹھہرے۔

درسیات کی تکمیل کے بعد ندوہ ہی میں انہوں نے انگریزی تعلیم کا آغاز کیا، نیز فلسفہ و کلام کا بھی مطالعہ شروع کیا اور پھر اپنی محنت وصلاحیت سے اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ یگانہ روزگار قرار پائے، بغیر کسی کالج اور یونیورسٹی کی سند کے دکن کالج پونہ، گجرات کالج احمد آباد اور

آخر میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے استاد اور صدر شعبہ ہوئے اور بڑی نیک نامی اور شہرت وعزت پائی۔

مولانا علوم جدیدہ وقدیمہ دونوں میں کمال دست رس رکھتے تھے، درس وتدریس میں مثالی مہارت کے ساتھ تصنیف وتالیف میں بھی یدطولیٰ حاصل تھا، ندوی فاضل ہونے کے باوجود جدید فلسفہ وکلام پر انہوں نے جتنا کچھ لکھا ہے اس کی علماء میں مثال ملنی مشکل ہے، دوسرے موضوعات پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ ان کی درج ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

''مبادی علم انسانی [۱۹۱۸ء]، مذہب وعقلیات [۱۹۱۹ء]، برکلے [۱۹۱۹ء]، علم اخلاق [۱۹۲۳ء]، حدیقہ نفسیات [۱۹۲۸ء]، مقدمہ مابعد الطبیات [۱۹۳۱ء]، اخلاقیات [۱۹۳۲ء]، طریق اور تفکرات [۱۹۳۲ء]، فلسفہ نتائجیت [۱۹۳۷ء]، فہم انسانی [۱۹۳۸ء]، علمی نباتیات [۱۹۳۸ء]، تجدید تصوف وسلوک [۱۹۴۹ء]، جامع المجدد دین [۱۹۵۰ء]، تجدید تعلیم وتبلیغ [۱۹۵۱ء]، تجدید معاشیات [۱۹۵۵ء]، تفسیر صلاح وفلاح [۱۹۶۴ء]، مذہب اور سائنس [۱۹۸۰ء] وغیرہ۔

ان تصنیفات، تالیفات اور تراجم سے ان کی فلسفیانہ بصیرت، تصنیف وتالیف میں مہارت اور عظیم الشان علمی ودینی خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالباری صاحب ایک دین دار خانوادہ کے چشم وچراغ تھے، ان کے والد کو فرنگی محل سے بیعت واجازت حاصل تھی، ان کا دینی ذوق غالب ہوا تو وہ مولانا سید حسین احمد مدنی [م: ۵/دسمبر ۱۹۵۷ء] سے بیعت ہو گئے، پھر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [م: ۲۳/جولائی ۱۹۴۳ء] کے زیر سایہ آگئے۔ اس طرح وہ علم وعمل کے مجمع البحرین قرار پائے اور کمال احتیاط سے دونوں کو نبھایا بلکہ اپنے طرز عمل سے دونوں کو ترقی دی، اس لحاظ سے علماء میں ان کی کوئی نظیر نہیں ہے اور واقعی وہ ندوہ اور فکر ندوہ کے گوہر شب چراغ تھے۔

وہ دوبارہ ندوہ میں جب آئے اس وقت سے لے کر علامہ شبلی کی وفات تک ان کی زیر تربیت اور زیر سرپرستی ہی نہیں رہے بلکہ ان کے معتمد رہے، اس کا ذکر انہوں نے سرگذشت میں

تفصیل سے کیا ہے، ان کے نام علامہ شبلی کے آٹھ خطوط مکا تیب شبلی حصہ دوم [ص ۱۳۳ - ۱۳۸] میں شامل ہیں۔ ان سے بھی گہرے شغف کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکیم الامت کے خلفاء پر جو کتاب ''بزم اشرف کے چراغ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے اس میں بھی ان کے قلم سے ان کے حالات شامل ہیں، وہ بھی ذکر شبلی سے خالی نہیں، لیکن سرگذشت میں انہوں نے قدرے تفصیل سے اپنے احوال قلم بند کئے ہیں اس میں علامہ شبلی اور ندوہ کا خصوصیت سے ذکر ہے بلکہ یہ سرگذشت علامہ شبلی کے حوالہ سے بڑے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ بعض باتیں اور بعض واقعات حیات شبلی میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جن سے علامہ شبلی پر عائد بعض الزامات کی بھی تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالباری ندوی عہد شبلی کے ندوہ کے چشم دید مورخ ہیں یہاں سرگذشت کے انہی مباحث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی جب ندوہ میں داخل ہوئے، علامہ شبلی ابھی ندوہ نہیں آئے تھے اور نہ معتمد تعلیم مقرر ہوئے تھے اور نہ ان کے تبدیلی نصاب کا غلغلہ بلند ہوا تھا، بلکہ اس وقت مولانا محمد علی مونگیری ناظم، مولانا سید عبدالحی حسنی نائب ناظم اور مولانا حفیظ اللہ اعظم گڑھی [م: ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ] مہتمم تھے۔ اس وقت کے ندوہ کی تصویر مولانا عبدالباری ندوی نے اس طرح کھینچی ہے:

> ''ندوہ کا یہ زمانہ ابھی اپنے نصاب اور رنگ تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے پرانے درس نظامی والے ہی مدارس کا سا تھا، مجھ کو خود کافیہ وشرح جامی اور مقامات حریری وغیرہ تک پڑھنا پڑا تھا۔ جہاں تک یاد ہے کہ درس نظامی میں کوئی تبدیلی بھی نہ ہوئی تھی۔ نظم وضبط کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا، طلبہ آزاد تھے، دن اور کبھی رات کو بھی بلا اجازت نکل جاتے، بڑی رغبت کا مشغلہ بنگالی مٹھائی خرید کر کھانا ہوتا، پھر گپ شپ کے بعد پھاٹک پھاند کر اپنے اپنے بستر میں واپس آ جاتے۔............
>
> بہر حال قیام وطعام کا نظام تو بندھا ہوا تھا باقی عام طور پر طلبہ پر علمی و دینی ذوق ورغبت کا کوئی اثر شاذ ونادر ہی رہا ہوگا۔ کھیل کود کے معاملہ میں

آج کل کے کرکٹ، فٹ بال کا نام نہ تھا، بس کبڈی کھیل لیا کرتے تھے، درسی کتابوں اور امتحانی تیاریوں کے سوا غیر درسی کتابوں کا ذوق نہ تھا۔ نہ کتب خانہ میں طلبہ ایک آدھ کے سوا دکھائی دیتے۔ خود اپنا یہ حال رہا کہ درسی اور کتابی امتحانوں سے اتنا بے پروا رہتا کہ امتحان میں اکثر فیل ہی رہتا، البتہ رعایتاً ترقی مل جاتی، باقی وقت یار باشی یا امین آباد کی نذر ہو جاتا۔(۱)

ندوہ کی ان خرابیوں کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے نہ صرف عہد شبلی بلکہ علامہ شبلی سے منسوب کر دیا ہے۔(۲) حالانکہ علامہ شبلی ابھی ندوہ آئے بھی نہیں تھے۔

علامہ شبلی جب معتمد تعلیم ہو کر ندوہ آئے اور یہاں قیام کیا تو ندوہ میں ایک انقلاب برپا ہو گیا، مولانا عبدالباری صاحب لکھتے ہیں:

''عہد شبلی کا اثر: عام طور پر ندوہ کے طلبہ پر یہ پڑا کہ ان میں نہ صرف درسی کتابوں کے پڑھنے کا شوق بڑھ گیا بلکہ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا بھی عام شوق ہو گیا، ساتھ ہی مضمون نگاری وغیرہ کا بھی۔ کتب خانہ جس میں پہلے شاذ و نادر ہی دو ایک طالب علم نظر آتے تھے، اب قریب قریب بھرا رہتا، نیز مولانا کے اثر سے تاریخ و ادب کے مطالعہ، تحریر و تقریر کا شوق و ذوق عام ہو گیا تھا۔''(۳)

علامہ شبلی میں طلبہ کی تعلیم و تربیت بلکہ ذہن سازی کا خداداد ملکہ تھا۔ یہی نہیں وہ بڑے جوہر شناس تھے۔ ان کی جوہر شناس طبیعت کا ایک دلچسپ واقعہ مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے کہ:

''اعظم گڑھ کے ایک طالب علم عبدالعزیز نام کے تھے۔ ماشاء اللہ اب بھی موجود ہیں اور اپنے گھر پر کاشت کاری کا کام کرتے ہیں، انہوں نے نخاس سے ایک پرانی کرسی میز خرید کر اس پر علامہ کی نقالی میں بیٹھ کر مضمون نگاری کیا کرتے مگر جب مولانا کو اپنا کوئی مضمون دکھاتے تو مولانا فرماتے کہ

تم اس کی کوشش نہ کرو، مضمون نگاری نہ فرض ہے نہ ضروری، نہ تم کو اس سے مناسبت ہے۔ آخر کار وہ مایوس ہو کر بیٹھ ہی گئے اور اب جا کر اندازہ ہوتا ہے کہ جس اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام [ندوی] نے اپنی یادگار میں درجنوں کتابیں چھوڑیں اسی اعظم گڑھ کے میاں عبدالعزیز ایک مضمون بھی شاید نہ لکھ سکے، اصل میں مولانا شبلی میں جوہر شناسی کا ملکہ بہت غیر معمولی تھا۔ ان کے دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی حضرت سید صاحب کا ذکر ہی کیا مولوی عبدالسلام، مولوی ضیاء الحسن وغیرہ کئی طالب علم دیکھتے دیکھتے اچھے خاصے مضمون نگار ہو گئے، جن میں سے بعض کے مضامین الندوہ میں بھی شائع ہوتے اور قدر کی نگاہ سے پڑھے جاتے۔''(۴)

زمانہ چال قیامت کی چل گیا اور علامہ شبلی کی ندوہ کی مجالس کی روداد صفحہ قرطاس پر نہ آسکیں، جس میں اس عہد کے نامی اہل علم، علماء، فضلا اور ادبا و شعراء شریک ہوتے تھے اور جس میں علم وادب، دین ودنیا اور تاریخ وسیاست کے تذکرے رہتے تھے۔ متعدد اہل قلم نے انفرادی طور پر ان مجالس اور ان کے شرکا کا ذکر کیا ہے۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام خصوصیت سے نمایاں ہے، البتہ یہ کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اس میں ان کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید بھی شریک ہوتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی نے اپنی سرگذشت میں ان کا ذکر کیا ہے اور علامہ کی مجلس کا عام وقت عصر اور مغرب کا بتایا ہے۔(۵)

علامہ شبلی ندوہ آئے تو انہوں نے تبدیلی نصاب کے ساتھ اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا اور یہ کام وہ ہمیشہ کرتے رہے اور بڑے نامور مدرسین کو منتخب کر کے ندوہ لاتے۔ آخر میں تو انہوں نے اپنے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کو بھی ندوہ کے لئے راضی کر لیا تھا جو تدریسی مہارت میں یگانہ روزگار تھے، مولانا عبدالباری ندوی نے علامہ شبلی کی تبدیلی نصاب کی کوشش کے ساتھ اس خصوصیت کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''خدا بھلا کرے علامہ ممدوح کا کہ انہوں نے اپنے زمانہ میں نصاب

میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جنہوں نے میری دلچسپی قدیم معقولات سے بھی کچھ بڑھا دی، مثلاً شرح حکمۃ العین، شرح حکمۃ الاشراق جیسی کتابوں، بالخصوص شرح حکمۃ الاشراق پڑھانے والے استاد مولانا شیر علی حیدرآبادی تھے جنہوں نے اپنے خاص طرز تعلیم سے میری رغبت اور بڑھا دی، اچھے اور لائق اساتذہ کے لانے میں حضرت علامہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، کہاں کہاں سے ڈھونڈھ کر استاد لاتے تھے، خود اپنے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کو بھی دوبارہ بلالیا، یہ دونوں حضرات مولانا شیر علی اور مولانا چریا کوٹی حقیقت میں پرانے قسم کے اساتذہ کی جیتی جاگتی مثال تھے۔''(۶)

علامہ شبلی طلبائے ندوہ سے بے حد پیار کرتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی نے علامہ شبلی کی ایک مجلس کے حوالہ سے اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی لکھا ہے کہ:

''ندوہ کے طلبہ کے ساتھ حضرت ممدوح کا معاملہ بالکل اولاد کا سا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اولاد سے بھی بڑھ کر۔ ایک لطیفہ یاد آ گیا، غالباً مجلس میں کسی نے یہ خبر سنائی کہ میاں حامد [مولانا کے اکلوتے صاحبزادے] نے فٹ بال میں کوئی کپ یا انعام حاصل کیا ہے۔ مولانا نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو شبلی کے لڑکے کی نہیں کسی نٹ کے لڑکے کی تعریف ہوئی، اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا اپنی اولاد کس کو سمجھتے تھے اور اس کے حق میں دامے، درمے، سخنے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے، اس کی سب سے بڑی شہادت خود راقم ہذا کی آپ بیتی ہے۔''(۷)

علامہ شبلی ندوہ میں رہتے تو طلبہ کی علمی تشنگی بجھاتے ہی تھے، ندوہ سے باہر رہتے تب بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے، مفید مشورے دیتے، مکاتیب شبلی میں تلامذہ کے نام ان کے جو خطوط شامل ہیں، اس میں اس طرح کے ڈھیروں واقعات ہیں، مولانا عبدالباری ندوی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ندوہ کے زمانہ میں جب لکھنؤ سے باہر ہوتے مثلاً بمبئی میں اور اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کے سلسلہ میں کچھ لکھتا تو بڑی ہمت افزائی فرماتے، ایک کارڈ میں تحریر فرمایا کہ:

ہمت بلند دار کہ عزیز جہاں شوی

بہت سے والا ناموں میں اس طرح کی ہمت افزائی اور مدد فرمائی کی باتیں ہوتیں، کسی خط میں تحریر فرمایا کہ بس تم بقدر ضرورت انگریزی اور جدید فلسفہ سے مناسبت پیدا کرلوں تو میں تم کو آغا خاں سے ولایت کا وظیفہ دلاؤں گا۔''(۸)

علامہ شبلی طلبہ کی تصنیف و تالیف اور خطابت وغیرہ کی تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے تصنیف و تالیف کی تربیت کا کوئی خاص واقعہ تو نہیں لکھا ہے، البتہ خطابت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''جن طلبہ میں اردو یا عربی تقریر کی کچھ صلاحیت دیکھتے ان کو تنہائی میں بلا کر اور کوئی موضوع دے کر اپنے سامنے تقریر کراتے، خود اس راقم عاجز کو باوجود معذرت کے کم از کم ایک مرتبہ اپنے سامنے ہی تقریر کا حکم دیا، ساتھیوں کی دیکھا دیکھی الٹی سیدھی جیسی بن پڑی استاد کے حکم کو بجالایا، تقریر تو جیسی تھی میں ہی جانتا ہوں لیکن استاد کی شفقت نہ بھلائی جانے والی ہے۔ فرمایا کہ تم میں صلاحیت ہے، لیکن ذرا مشق بڑھانے کی ضرورت ہے جس سے خامیاں اور جھجک دور ہوجائے گی، آہ! کیسی دولت ندوے نے کھوئی اپنے ہاتھ سے۔''(۹)

علامہ شبلی کے عہد معتمدی پر بعض لوگوں نے طنز کیا ہے کہ انہوں نے طلبائے ندوہ کی ساری توجہ علم و ادب کی طرف مبذول کرادی تھی، حالانکہ یہ واقعہ نہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی نے طلبہ کی ذہنی تربیت کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

''ندوہ کے زمانہ تعلق میں بارہا خود دارالعلوم تشریف لاکر ہم طلبہ کی مجلس میں تقریر فرماتے، ایک تقریر کی یاد آج بھی ذہن میں نقش کالحجر ہے، فرمایا کہ یورپ کا تو کوئی ماضی نہیں، اس لئے وہ مستقبل کے اندھیروں میں جدھر چاہے ٹھوکریں کھاتا پھرے، لیکن اسلام کا ماضی اتنا شاندار ہے کہ مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے میں ہے، یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے خیر القرون عہد صحابہ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک جا پہونچیں، یہی ہماری ترقی کا اصل راز ہے۔''(۱۰)

مولانا عبدالباری ندوی نے آپ بیتی میں تین ایسے واقعات لکھے ہیں جن میں وہ علامہ شبلی کے پاس پہونچے، مسئلہ بتایا، چنانچہ اس کے لئے علامہ جو کچھ کر سکتے تھے اسے فوراً ہی کر دیا، انہوں نے جو کچھ کیا وہ ایک طالب علم کے لحاظ سے بڑی بات تھی۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ مولانا عبدالباری صاحب ندوہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنا چاہتے تھے، انہوں نے اپنے والد سے ذکر کیا جو انگریزی تعلیم کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے نہ صرف منع کیا بلکہ اخراجات بھی بند کر دئے، پھر کیا ہوا، مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں:

''میں یہ فریاد لے کر حضرت استاذ علامہ کی خدمت میں پہنچا، بڑی تسلی فرمائی اور فرمایا تمہارے لئے انگریزی تعلیم کا انتظام ندوہ ہی سے ہو جائے گا، چنانچہ قاضی تلمذ حسین صاحب ہیڈ ماسٹر اور دین محمد صاحب ماسٹر کو باقاعدہ طور پر ایک ایک سبق پڑھانے کا حکم دے دیا اور کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ندوہ سے فرما دیا، اس طرح پوری بے فکری سے صرف انگریزی پڑھنے میں مصروف ہو گیا اور الحمدللہ کوئی دو برس کے بعد ہی اس قابل ہو گیا کہ انگریزی کی فلسفہ کی آسان کتابوں سے لغت کی مدد سے بقدر ضرورت مطلب نکال لینے لگا۔''(۱۱)

انگریزی کی تعلیم اور فلسفہ کی کتابوں کی ورق گردانی نے یہ جذبہ بیدار کیا کہ اگر کسی کالج میں فلسفہ کے لکچرز سماعت کا سال دو سال موقع مل جائے تو پھر کسی امتحان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، آگے کا حال انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''یہ خیال بھی حضرت استاد علامہ کی خدمت میں پیش کیا، ممدوح نے علی گڑھ کے لئے تین خط لکھ کر دئے، ایک صاحبزادہ آفتاب احمد کے نام، جس میں یہ تھا کہ حامل ہذا کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے، موصوف نے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو، عرض کیا پندرہ روپیہ ماہوار، انہوں نے اسی وقت اپنے دفتر سے باقاعدہ حکم لکھوا کر پندرہ روپیہ کی پہلی قسط بھی دلوادی اور فرمایا کہ اب جہاں بھی رہو اپنے پتہ سے دفتر کو مطلع رکھو، انشاء اللہ ماہ بماہ وظیفہ تم کو پہنچتا رہے گا۔ دوسرا خط حضرت علامہ نے اپنے بھتیجے اقبال احمد کو لکھا تھا جو اس وقت علی گڑھ میں وکالت کرتے کہ حامل ہذا ندوہ کے طالب علم ہیں، علی گڑھ میں فلسفہ کے لکچر سننے کے لئے آرہے ہیں، امید ہے ان کے قیام کا انتظام اپنے ساتھ کرو گے۔ موصوف نے فرمایا: ''اپنا گھر سمجھ کر بے تکلف آجایئے۔'' تیسرا خط نواب وقار الملک کے نام تھا کہ حامل ہذا ندوہ کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں، بعد کو ان کو جدید فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا تو اس کے لئے نجی طور پر انگریزی اتنی پڑھ لی ہے کہ فلسفہ کی معمولی کتابیں مطالعہ کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں، اب چاہتے ہیں کہ کم از کم ایک سال ان کو فلسفہ کے لکچروں میں شرکت کی اجازت مل جائے، نواب صاحب نے اس خط کو پڑھ کر مولانا کا لحاظ اتنا تو فرمایا کہ جب میں ان کی خدمت سے واپس لوٹا تو دروازہ تک پہونچانے آئے لیکن آدمی وہ قانون اور ضابطہ کے مشہور ہی تھے، فرمایا کہ اس کا تعلق براہ راست پرنسپل سے ہے، میں مشورہ کے بعد جواب دوں گا، دوبارہ جب میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ پرنسپل نے مجھ

سے خود ایسا سوال کیا جس کا جواب نہ بن پڑا، اگر اس طرح صرف لکچروں کے سننے کے لئے دروازہ کھولا گیا تو پھر بند کس طرح کیا جائے گا اور کالج کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ غالبًا ایسا ہی جواب مولانا شبلی کے خط کا بھی تحریر فرمادیا۔''(۱۲)

کلاس کی اجازت نہ ملنے سے مولانا عبدالباری صاحب علی گڑھ سے واپس چلے آئے اور جب علامہ شبلی کو یہ اطلاع ملی کہ وہ علی گڑھ میں نہیں ہیں تو انہیں خط لکھا کہ:

''ہاں مجھ کو تعجب ہوا کہ تم آئے اور بغیر ملے چلے گئے، میں نے دوبارہ دریافت کیا تھا، اقبال بہت خوشی سے تم کو اپنے گھر پر رکھتے، افسوس کہ تم علی گڑھ سے چلے گئے، خیر اب استقلال سے ایک جگہ جم کر رہو۔ آئندہ مراحل کے لئے مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ موجود ہوں۔''(۱۳)

علامہ شبلی صرف ندوہ ہی میں طلبہ کا تعاون نہیں کرتے تھے جیسا کہ اوپر کے واقعات سے اندازہ ہوگا، وہ اپنے طلبہ کا ہر طرح سے تعاون کرتے تھے بلکہ طلبہ کے معمولی معمولی کاموں کے لئے بڑے بڑے لوگوں سے سفارش کر دیتے اور ان کی ضروریات کو بہرحال تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کرتے، ایسے شفیق استاد ہی کو طلبہ ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ کے لئے انہوں نے جو کچھ کیا اس سے اہل علم واقف ہیں۔ اس عہد کے دوسرے تلامذہ شبلی نے علامہ شبلی کی تعلیم و تربیت اور طلبہ سے ہمدردی اور تعاون کے جو واقعات لکھے ہیں وہ حیات شبلی کا ایک اہم باب ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی نے علی گڑھ میں کلاس میں شمولیت کی خواہش کی عدم تکمیل کے بعد انٹرنس کا پروگرام بنایا، اس زمانہ میں اس میں شمولیت کے لئے تدریسی اسناد ضروری تھیں، شاگرد پھر استاد کے دربار میں حاضر ہوا، وہ لکھتے ہیں:

''اس مشکل کے لئے بھی حضرت استاد کی خدمت میں عرض کیا، حسن اتفاق سے اس زمانہ میں فیض آباد ڈویژن کے انسپکٹر آف اسکول عبدالعزیز

صاحب تھے، جو علی گڑھ میں حضرت استاد کے شاگرد رہے تھے، استاد محترم نے حسب سابق عرض کرتے ہی ایک سفارش نامہ موصوف کے نام لکھ دیا، میں اس کو لے کر فیض آباد پہنچا، انسپکٹر صاحب موصوف نے جیسے ہی مولانا کا والا نامہ پڑھا، مجھ کو جواب دئے بغیر دفتر سے ایک حکم نامہ لکھوا دیا کہ ہیڈ مولوی کی جو جگہ سلطان پور ہائی اسکول میں خالی ہے، حامل ہذا مولوی عبدالباری کا اس پر تقرر کیا جاتا ہے، اس طرح سلطان پور ہائی اسکول پہنچا اور وہاں اپنے رفیق اساتذہ کی مدد سے انگریزی اور دیگر مضامین کی تیاری میں لگ گیا۔'' (۱۴)

ابھی چند دن پہلے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ندوہ میں شعبہ انگریزی قائم کیا گیا ہے۔ خدا جانے یہ کیسی خبر تھی، ندوے میں تو تقریباً سوا سو سال پہلے علامہ شبلی نے شعبہ انگریزی قائم کیا تھا، اس میں ایک نہیں تین تین استاد تھے، قاضی تلمذ حسین گورکھپوری اس شعبہ کے ہیڈ تھے، مولانا عبدالباری ندوی نے بھی اس شعبہ کا ذکر کیا ہے۔ (۱۵)

مولانا سید سلیمان ندوی نے انگریزی شعبہ کے علاوہ ہندی اور سنسکرت شعبہ کے قائم کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاید ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کے ندوے سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے اثرات مٹانے کی غرض سے ان شعبہ ہائے علوم کو بھی ختم کر دیا، خیال کیجئے کی ندوے سے نو سالہ وابستگی نے مولانا سید سلیمان ندوی جیسا سیرت نگار، مولانا عبدالسلام ندوی جیسا ادیب و انشا پرداز، مولانا عبدالباری ندوی جیسا فلسفی، نجیب اشرف ندوی جیسا مورخ اور ضیاء الحسن علوی جیسا ماہر تعلیم پیدا کیا جنہوں نے اپنی کاوشوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے قالب میں نئی جان ڈال دی، اگر شبلی کے تعلیمی افکار کو پورے طور پر تسلیم اور نافذ کیا جاتا اور ان کے نقوش راہ مٹانے کے بجائے روشن کئے جاتے تو شاید ہمارا موجودہ تعلیمی منظر نامہ کچھ اور ہوتا۔

۱۹۱۳ء: یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی یاران ندوہ کے پے در پے حملوں سے تنگ آ کر اس سے مستعفی ہوئے اور دارالمصنّفین اور تکمیل سیرت میں مصروف ہوئے، مولانا عبدالباری ندوی کی استاد کی زیارت کی خواہش ہوئی، اس کے لئے انہوں نے علامہ شبلی کو خط لکھا، اس کے جواب

میں علامہ شبلی نے جو خط لکھا ہے اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا عبدالباری ندوی کو بے حد عزیز رکھتے تھے، لکھتے ہیں:

''عزیزی! میں اب تک یہیں اعظم گڑھ میں رہا اور گھر [بندول] جو تین چار کوس ہے نہ جا سکا، ارادہ جانے کا تھا لیکن اتوار یا دوشنبہ تک تمہارا انتظار کروں گا، فرضاً اگر گھر گیا بھی تو اس وقت آجاؤں گا۔''(۱۶)

اس کے چند ہی دنوں بعد مولانا عبدالباری ندوی اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں تین دن قیام کیا، دارالمصنّفین کے قیام کے سلسلے میں مولانا مسعود علی ندوی اعظم گڑھ آکر جا چکے تھے اور سید صاحب ابھی نہیں آئے تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے قیام اعظم گڑھ کی تفصیل ان الفاظ میں قلم بند کی ہے:

''حضرت استاذ علامہ اس دوران میں ندوہ سے بالکل علاحدہ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ جا کر اپنے بنگلہ اور باغ میں عزلت نشین ہو چکے تھے، ایک طرف اس بنگلہ اور باغ کو وقف فرما کر دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز میں لگے ہوئے تھے، دوسری طرف ہر قسم کی تصنیف و تالیف سے قطع نظر فرما کر صرف سیرۃ النبیؐ میں مشغول تھے، احقر کا جی چاہا کہ ایسے عمر بھر کے محسن و محترم استاد کی خدمت میں دو چار دن کے لئے اعظم گڑھ جا کر حاضری دوں، اعظم گڑھ پہنچا اور کم از کم تین دن سراپا شفقت استاد ہی کا مہمان رہا اور کم و بیش حضرت کے آرام اور تصنیف کے کام کے علاوہ قریب ہی حاضر رہتا، گفتگو دو ہی چیزوں پر فرماتے، دارالمصنّفین کے قیام اور سیرۃ النبیؐ کی تکمیل، ان دو کے سوا تیسری بات مشکل ہی سے فرماتے، بس اس طرح مولانا کو اپنے خاتمہ ہی کی فکر معلوم ہوتی تھی، جس کے لئے اب شفیع المذنبین کی سیرت کی تکمیل ہو رہی تھے، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی

مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

تین دن رات کی حاضری میں استاد ممدوح کا معاملہ استاد سے زیادہ شفیق کا باپ کا سا رہا، باتیں ایسی بے تکلفی اور محبت سے فرماتے جیسے کسی معمولی طالب علم سے نہیں بلکہ کسی بے تکلف دوست سے ہو رہی ہوں۔'' (۱۷)

علامہ شبلی ندوہ کے لئے کشتیاں جلا کے آئے تھے، علی گڑھ کی پروفیسری، بیگم سلطان جہاں بھوپال [۱۸۵۴-۱۹۳۰ء] کی پیش کش اور نہ جانے کیا کیا عزتیں اور منصب ٹھکرا کر آئے تھے۔ نواب محسن الملک [۱۸۳۷-۱۹۰۷ء] نے کہا تھا ''ابھی ندوہ کسمپرسی میں ہے کوئی مزاحم نہ ہوگا مگر جیسے ہی استحکام آئے گا مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے''، بقول مولانا سید سلیمان ندوی بالآخر ان کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ (۱۸) مولانا عبدالباری ندوی نے یہ تفصیلات تو سرگذشت میں نہیں لکھی ہیں، البتہ ان کی بے وقت موت کا ایک سبب ندوہ سے علاحدگی کو ضرور قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اعظم گڑھ کی آخری زیارت میں یہ بھی محسوس ہوا کہ محترم و مرحوم استاد کو ندوہ سے جدائی کا بہت قلق تھا، راقم الحروف کے نزدیک یوں تو اجل مسمی کا وقت آچکا تھا لیکن ظاہری اسباب میں ایک سبب کم از کم ندوہ سے علاحدگی بھی رہی ہوگی، اس لئے کہ جس وقت میں حاضر ہوا ہوں مولانا فریش بالکل نہ تھے، اچھی طرح حسب عادت گفتگو فرماتے اور چلتے پھرتے، اصل یہ ہے کہ ندوہ نے ان کے ساتھ عام انسانی حیثیت سے بھی نامناسب سلوک ہی کیا تھا، حالانکہ جس ندوہ کا آج عرب و عجم میں چرچا ہے اور جس کا سب سے بڑا نشان برادر عالی مولانا علی میاں سلمہم ہیں، یہ سو فیصدی عہد شبلی ہی کی دین ہے، اس سے پہلے نہ تقریر و تحریر کا کوئی خاص ذوق طلبہ میں تھا اور نہ مضمون

نگاری وتصنیف کا، نہ اردو عربی ادب وانشا کا، نہ تاریخ کا، یہ سب چیزیں بالکلیہ دورِ شبلی کی یادگار ہیں۔'' (۱۹)

بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ جب ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری'' شائع ہوئی تو مولانا عبدالباری ندوی نے اسے ناپسند کیا اور اس میں علامہ شبلی کو نظر انداز کئے جانے پر ناراضی ظاہر کی، حالانکہ اس کتاب کے مصنف کو بھی وہ عہد شبلی کے ندوہ کی دین خیال کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''آہ! کیسی دولت کھوئی ندوہ نے اپنے ہاتھ سے۔ بہرحال ندوہ جو آج عرب وعجم میں شہرت رکھتا ہے خصوصاً مولانا علی میاں سلمہم اور میرے مخدوم بزرگ اور علی میاں کے برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم کے صاحبزادے محمد میاں سلمہم جو البعث وغیرہ نکالتے ہیں اس کو یہ عاجز دیانتہً عہد شبلی کی دین جانتا ہے، کیونکہ ان سب کی بنیاد پڑی شبلی ہی کے دور میں تھی۔'' (۲۰)

مولانا عبدالباری ندوی نے اپنی سرگذشت میں ندوہ کی فصل بہار کا بار بار تذکرہ کیا ہے، یہی نہیں ان کے نزدیک ندوہ مولانا محمد علی مونگیری کے بجائے مولانا شبلی کی یادگار ہے۔ مولانا علی میاں نے لکھا ہے کہ:

''سبکدوشی اور خانہ نشینی کے آخری ایام میں مولانا شبلی کی یاد بھی ان کو بہت آنے لگی تھی، ان کے احسانات، ان کی تعلیم وتربیت کے گہرے اثرات کا وہ اپنی تحریر وتقریر میں بار بار تذکرہ فرماتے اور موجودہ دارالعلوم کو وہ بانی ندوۃ العلما مولانا محمد علی مونگیری کے بجائے مولانا شبلی کا ساختہ پرداختہ سمجھتے تھے۔'' (۲۱)

تعجب ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سے تمام تر شیفتگی کے باوجود انہوں نے اپنی سرگذشت میں اختلافات ندوہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ علامہ شبلی کے ندوہ سے مستعفی ہو جانے پر وہ سخت رنجیدہ ہیں، تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ ندوہ نے علامہ شبلی کے ساتھ عام انسانوں

جیسا بھی سلوک نہیں کیا، حالانکہ اس موضوع پر ان سے علامہ شبلی کی خط و کتابت بھی رہی تھی۔ علامہ شبلی ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے خلاف اس قدر طوفان برپا رہا لیکن لکھنے کی طاقت نہ تھی اور اب تک کوئی مفصل تحریر نہ لکھ سکا۔............کو بہت دنوں سے جانتا ہوں، ان کی سفلہ پن تو ہمیشہ سے معلوم ہے لیکن اس قدر بدنفسی کا خیال نہ تھا، سخت حیرت ہے کہ اب تک میری طرف سے ان کی نسبت کوئی بات وجود میں نہیں آئی۔ میں نے کسی کی شکایت تک نہیں کی۔

ابتدا یوں ہوئی کہ.......وغیرہ نے ان کو یقین دلا دیا کہ اس سے آپ کی آزادگوئی ثابت ہوگی، اس بھڑی میں آئے اور پھر یہ لوگ اور بڑھاتے چلے گئے یا شاید کوئی اور وجہ ہو، بھائی بات یہ ہے کہ:

خاطر یک دو کس ارشاد شوداز بس است

زندگی بہ مراد وہمہ کس نتواں کرد'' (۲۲)

مولانا سید سلیمان ندوی نے مکاتیب میں جہاں نقوط لگا دئے ہیں اکثر جگہ علامہ شبلی کے مخالفین کے نام تھے۔ مذکورہ خط میں بھی جہاں نقوط ہیں وہاں مخالفین کے نام تھے، اس لئے یہ نشاندہی نہیں ہوسکی کہ کون لوگ مخالفت میں پیش پیش تھے۔

مولانا عبدالباری ندوی کا یہ خیال ہے کہ ندوہ نے ان کے ساتھ عام انسانوں جیسا بھی سلوک نہیں کیا مگر اس کی انہوں نے پوری سرگذشت میں کسی قسم کی تفصیل نہیں لکھی ہے، البتہ ان کے نام علامہ شبلی کے ایک خط میں اس کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کے ندوے سے مستعفی ہوکر آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو چکے ہیں اور حال یہ ہے کہ:

''یاروں نے میرا صندوق جس میں ۲۰۰/روپئے کے نوٹ اور ضروری کاغذات تھے، میرے نوکر کو ملا کر سرقہ کرا دیا، پولیس نے بھی یونہی تحقیقات کر کے اغماض برتا، دارالعلوم میں اندھیر مچا ہوا ہے۔ مولود تک روکا گیا، تین

دن کے سخت مطارقہ کے بعد بہت سے شرائط پر اجازت ملی۔''(۲۳)

یہ حال روحانیت کے علم برداروں کا تھا۔

مولانا عبدالباری مرحوم نے ان واقعات سے اغماض برتا ہے، غالبًا اختصار پیش نظر رہا ہوگا، یا پھر ان کے عہد کے ذمہ داران ندوہ کا خیال، یہ کتاب بھی تو وہیں سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا عبدالباری ندوی ایک طرف ندوہ کو علامہ شبلی کی یادگار بتاتے ہیں تو دوسری طرف علامہ کی آخری یادگار دارالمصنّفین کو بعض اہل قلم نے ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی سے منسوب کر دیا، مولانا عبدالباری ندوی نے ان کا ذکر کئے بغیر لکھا ہے کہ:

''دارالمصنّفین تو مجسم صرف مولانا ممدوح کی ذات واحد کی یادگار ہے۔ اس میں کام کرنے والے طلبہ بھی زیادہ تر شبلی کی روایات کے پروردہ رہے ہیں۔''(۲۴)

علامہ شبلی کی وفات کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے دکن کالج پونہ کی پروفیسری کو خیر باد کہہ کر علامہ کی وصیت کے مطابق آستانہ شبلی پر آ گئے۔ دکن کالج میں ان کے استعفے سے جو جگہ خالی ہوئی اس کے لئے انہوں نے مولانا عبدالباری ندوی کے لئے سفارش کی اور علامہ شبلی کے ایک دوست شیخ عبدالقادر سرفراز نے بغیر کسی سند کے ان کا تقرر دکن کالج میں کر دیا۔ چند سال بعد وہ گجرات منتقل ہو گئے، پھر بوجوہ ملازمت چھوڑ دی اور دسمبر ۱۹۲۰ء میں دارالمصنّفین میں بحیثیت رفیق آ گئے۔ یہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ معارف کے وہ ایک بڑے مقالہ نگار تھے۔ دو برس بعد وہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد شعبہ فلسفہ کے استاد ہو کر چلے گئے۔ وہاں سے سبکدوشی کے بعد وہ لکھنؤ آ گئے اور پھر آخر دم تک یہیں رہے اور یہیں ۳۰ر جنوری ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔

انہیں ندوہ کے دور طالب علمی میں علامہ شبلی سے جو شیفتگی قائم ہوئی وہ مدۃ العمر قائم رہی۔ مولانا حسین احمد مدنی اور حکیم الامت حضرت تھانوی سے بیعت و اجازت اور تصوف و سلوک سے انتہائی گہرے شغف کے باوجود علامہ شبلی کا مرتبہ ان کی نظروں میں کبھی کم نہیں ہوا اور

بقول مولانا علی میاں آخری وقتوں میں وہ علامہ شبلی کو کثرت سے یاد کرتے رہے۔

حوالے

(۱) سرگذشت مشمولہ مذہب اور سائنس ص ۱۱-۱۲
(۲) کاروان زندگی ج ۱ ص ۱۵۲
(۳) سرگذشت ص ۱۳
(۴) ایضاً ص ۱۳-۱۴
(۵) ایضاً ص ۱۴
(۶) ایضاً ص ۱۵
(۷) ایضاً
(۸) ایضاً ص ۱۹
(۹) ایضاً ص ۲۰
(۱۰) ایضاً ص ۱۹-۲۰
(۱۱) ایضاً ص ۱۶
(۱۲) ایضاً ص ۱۷
(۱۳) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۳۳-۱۳۴
(۱۴) سرگذشت ص ۱۸
(۱۵) ایضاً ص ۱۶
(۱۶) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۳۸
(۱۷) سرگذشت ص ۱۸-۱۹
(۱۸) حیات شبلی ص
(۱۹) سرگذشت ص ۱۹

(۲۰) ایضاً ص۲۰

(۲۱) پرانے چراغ حصہ دوم ص۱۲۸

(۲۲) مکاتیب شبلی ج۲ ص۱۳۶

(۲۳) ایضاً ص۱۳۷

(۲۴) سرگذشت ص۲۰

[۱۴]

یادایام

• مولانا ضیاءالحسن علوی

[ادارہ انیس اردو، الہ آباد، ۱۹۵۹ء]

یادایام مولانا ضیاءالحسن علوی [۱۸۹۱-۱۹۴۵ء] کی نامکمل آپ بیتی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ادارت میں ۱۹۴۰ء میں ماہنامہ الندوہ تیسری بار جاری ہوا تو اس میں یہ خودنوشت یادایام قسط وار شائع ہونا شروع ہوئی۔ آٹھ قسطوں کے بعد مصنف کی بیماری کے سبب یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پھر ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو علوی صاحب نے وفات پائی اور یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ ۱۹۵۹ء میں ادارہ انیس اردو الہ آباد نے تمام اقساط کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس میں مرتب کا نام درج نہیں ہے اور نہ دیباچہ لکھا گیا ہے۔ البتہ دیباچہ کی جگہ مولانا سید سلیمان ندوی کا وہ وفیاتی مضمون جو انہوں نے اپنے دیرینہ رفیق کی جدائی پر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ [جولائی ۱۹۴۵ء] میں لکھا تھا اسے شامل کیا گیا ہے۔

مولانا ضیاءالحسن علوی کاکوری کے علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی شد بد کے بعد ندوہ میں داخل ہوئے اور تمام تر تعلیم ندوہ میں حاصل کی۔ یہ ندوہ کے بالکل ابتدائی طلبہ میں سے ہیں۔ غالباً ان کا ندوہ میں دوسرا داخلہ تھا۔ انہوں نے مولانا حفیظ اللہ، مولانا عبدالشکور، مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ انہیں مولانا فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی سے زیادہ شیفتگی تھی۔ یہ ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی سے ایک سال آگے زیر تعلیم تھے۔

ندوے سے فراغت کے بعد علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۱۶ء میں عربی سے ایم اے کیا۔ یہاں پروفیسر ہارویز سے خصوصی طور پر استفادہ کیا۔ تحصیل علم کے بعد عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانات کے رجسٹرار مقرر ہوئے اور اس شعبہ کو بڑی ترقی دی۔ خاص طور پر اس کے نصاب کی اصلاح اور اسے مفید و کارآمد بنانے کے لئے بڑی جد وجہد کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:

> ''مرحوم نے عربی نصاب اور اردو و فارسی اور عربی کے سرکاری امتحانات کی اصلاح اور ترقی میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ جب وہ اس عہدہ پر فائز ہوئے تھے تو نام کے سوا اس صیغہ میں کچھ اور نہ تھا، لیکن انہوں نے چند برس کے اندر اپنی محنت، لیاقت، اخلاق اور محبت سے چالیس پینتالیس مدرسوں کو اپنا ہم نوا بنالیا اور اصلاح نصاب کا وہ خاکہ جو استاذ مرحوم [شبلی] صرف ندوہ کی حد تک کھینچ سکے تھے، ان کے لائق شاگرد کے ہاتھوں وہ پورے صوبہ کے دائرہ میں وسیع ہوگیا۔''(۱)

ضیاء الحسن علوی علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں علامہ شبلی سے خصوصی لگاؤ تھا اور یہی سبب ہے کہ یادِ ایام میں ان کا کثرت سے ذکر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بڑے وفا شعار شاگرد اور ان کی نجی محفلوں کے راز دار تھے۔ ان کی ہر ادا پر جان چھڑکتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس خصوصی تعلق کا ذکر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یادِ ایام ان کی آپ بیتی سے زیادہ ذکرِ شبلی پر مشتمل ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسے ''شبلی اور ندوہ'' کا عنوان دیا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی معرکۃ الآرا کتاب ''حیات شبلی'' اور ضیاء الحسن علوی کی یادِ ایام کا زمانہ تصنیف تقریباً ایک ہی ہے۔ چوں کہ دونوں شبلی کے خاص شاگرد تھے، دونوں کو شبلی سے بے پناہ محبت تھی، اس لئے دونوں کے معلومات اور خیالات میں بڑی حد تک یکسانیت اور ہم آہنگی ہے۔ تاہم یادِ ایام میں بہت سے ایسے پہلو آ گئے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں سید محمد الحسنی [۱۹۳۵-۱۹۷۹ء] کی کتاب ''سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوہ'' شائع ہوئی تو اس پر مولانا مجیب اللہ ندوی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں تبصرہ کیا۔ (۲) مولانا وحیدالدین خاں [پ: یکم جنوری ۱۹۲۵ء] نے بھی ہفتہ وار الجمیعۃ دہلی [۱۹/جنوری ۱۹۶۸-۱۲/جولائی ۱۹۶۸ء] آٹھ قسطوں میں ''شبلی کی فریاد'' کے عنوان سے تنقید وتبصرہ لکھا اسے شورش کاشمیری [۱۹۱۷-۱۹۷۵ء] نے چٹان لاہور میں ''تاریخ ندوہ سے علامہ شبلی کا اخراج'' کے عنوان سے قسط وار نقل کیا۔ اس میں ایک بحث بانی ندوہ کی بھی تھی۔ ان کو اعتراض تھا کہ جب ندوہ کا تخیل علماء کی ایک جماعت کا تھا تو مولانا محمد علی مونگیری کو بانی ندوہ کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے۔ مولانا ضیاء الحسن علوی جو ندوہ کے قدیم ترین طالب علم تھے، انہوں نے یاد ایام میں کئی مقامات پر انہیں بانی ندوہ ہی لکھا ہے۔ (۳)

مولانا ضیاء الحسن علوی جنہیں علامہ شبلی کی نجی محفلوں میں بار حاصل تھا، یاد ایام میں ان کی کئی محفلوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ان کی باغ و بہار شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مثنوی کے سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آ گیا، سن لیجئے۔ ایک صاحب جو مراتب تصنیف میں قزاقی کے منصب پر فائز تھے، حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی کی صحبت میں سہ پہر کو بیٹھے تھے۔ شرر صاحب بھی تھے۔ نہ جانے مولوی ابوالکلام تھے یا نہیں مگر مولوی عمادی ایڈیٹر البیان ضرور تھے۔ فرمانے لگے، مولانا آپ نے جتنے کام کئے خوب کئے، مگر اس سائیں کی سوانح عمری [یعنی سوانح مولانا روم] لکھ کر اس کی تو عزت بڑھائی مگر اپنا وقت خراب کیا۔ حاضرین بہت محظوظ ہوئے، پھر لطائف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرۃ الاستاذ کے علمی مذاکروں میں اکثر اس قسم کے لطائف نمک کا کام دیتے تھے اور ہمیشہ ان کی صحبت باغ و بہار رہتی۔'' (۴)

علامہ شبلی جس وقت ندوہ کے معتمد تعلیم منتخب ہوئے، اس وقت ان کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی ندوہ کے صدر مدرس تھے۔ چنانچہ انہوں نے ندوہ کو خیر باد کہہ دیا۔ مولانا ضیاء الحسن

علوی لکھتے ہیں:

''ہمارے مولانا کو جب اس انقلاب کی خبر ہوئی تو وہ اب یہاں ٹھہرتے ہوئے گھبرائے اور آخر کار اپنے خیر اندیشوں کے مشورہ سے خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ استاد شاگرد کی ماتحتی نہیں کر سکتا۔ علامہ نے جب سنا تو ان کو اس کا بے حد قلق ہوا، مگر میری رائے میں بہتر ہی ہوا، ورنہ نظم میں فتور آتا۔''(۵)

مولانا فاروق چریا کوٹی، مولانا ضیاء الحسن علوی کے بھی محبوب استاذ تھے۔ ان کا ذکر یاد ایام میں متعدد جگہ آیا ہے اور ایک جگہ ''دور فاروقی'' کے عنوان سے ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ جیسا کہ متعدد اہل قلم نے لکھا ہے، علوی صاحب نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ وہ سخت حنفی تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ غازی پور میں ایک غیر مقلد عیادت کو آئے تو منہ پھیر لیا اور کہا لاحول و لاقوۃ، آخر وقت میں کس کی صورت نظر آئی۔

علوی صاحب نے علامہ شبلی کی زمانہ طالب علمی کی تصنیف اسکات المعتدی اور بعد میں لکھی جانے والی سیرۃ النعمان کو اسی غالی حنفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔(۶) نعمانی لقب کی نسبت لکھا ہے کہ یہ انہیں مولانا فاروق چریا کوٹی کا دیا ہوا ہے۔(۷)

۱۹۰۹ء میں مولانا فاروق چریا کوٹی نے وفات پائی۔ علامہ شبلی اس وقت ماہنامہ الندوہ لکھنؤ [اجراء جولائی ۱۹۰۴ء] کے ایڈیٹر تھے۔ وفیات لکھ کر اپنے استاذ کے غم میں آنسو بہائے اور یہ اعتراف کیا کہ میری تمام تر کائنات انہیں کے افادات ہیں۔ علوی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''علامہ فرماتے تھے کہ میری فارسیت جو کچھ ہے وہ انہیں کی جوتیوں کا طفیل ہے۔ نرے کھرے مولوی نہ تھے۔ قانون اور زمینداری خوب سمجھتے تھے۔ وکالت بھی کر چکے تھے۔''(۸)

مولانا فاروق چریا کوٹی علم و فضل کے بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نے اپنے وفیاتی مضمون میں لکھا ہے۔ علوی صاحب نے ان کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ استاذ سے شبلی کی شیفتگی کا بھی ذکر کیا ہے۔

گذشتہ دنوں ہمارے کرم فرما مولانا افروز قادری نے اپنی کتاب ''علامہ محمد فاروق چریاکوٹی اوران کے تین عظیم بیٹے'' عنایت کی۔انہوں نے ان تینوں اہل علم کے قدرے تفصیل سے حالات وسوانح اور علمی وتعلیمی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ چریاکوٹ کو یونان وشیراز سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہاں بڑے باکمال پیدا ہوئے،مگر افسوس ہے کہ ہمارے اہل قلم نے ان کے حالات اور کارناموں سے بہت کم سروکار رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے عظیم الشان کارناموں سے دنیا کو کم واقفیت ہے۔ مذکورہ کتاب میں مولانا فاروق چریاکوٹی کی پوتی کا یہ شکوہ درج ہے کہ کاش علامہ شبلی نے ایک اورالفاروق لکھ کر اپنے استاذ کے حالات وسوانح قلم بند کئے ہوتے تو آج مولانا فاروق کے علم وفضل سے دنیا بخوبی واقف ہوتی۔میرا خیال ہے کہ ان کا یہ شکوہ بجا ہے۔مولانا فاروق چریاکوٹی جس قدر علامہ شبلی کوعزیز رکھتے تھے اور جس قدر ان سے سروکار رہا،شاید ہی کوئی ان سے اس قدر واقف رہا ہو۔

ضیاءالحسن علوی صاحب نے جہاں مولانا فاروق چریاکوٹی کا ذکر کیا ہے،دوسطروں میں ان کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول عباسی چریاکوٹی کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے،جن سے سرسید نے خطبات احمدیہ اورشروح صحائف میں استفادہ کیا تھا۔ وہ عبرانی پر بھی عبور رکھتے تھے۔ان کی تصنیف ''بشریٰ'' کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کی عدم اشاعت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ (۹) حالاں کہ وہ ۱۹۳۸ء ہی میں علی گڑھ سے شائع ہوگئی تھی ۔ یہ کتاب جس میں انہوں نے تورات وانجیل سے بشارت کی تفصیل لکھی ہے، واقعی بہت اہم علمی کتاب ہے۔ یہ کتاب مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے تیس سالہ مطالعہ وتحقیق کا ثمرہ ہے۔

ضیاء الحسن علوی نے ایک مقام پر علامہ شبلی کا مستقل تذکرہ لکھا ہے ۔ اب تک جو تفصیلات دی گئی ہیں وہ مختلف مقامات پر ضمناً آئے ذکر شبلی پر مشتمل ہیں۔علامہ شبلی کے تذکرہ سے پہلے انہوں نے ندوہ کی ایک سرسری تاریخ قلم بند کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ:

> ''سب کچھ لکھ گیا مگر اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذ علامہ کا ذکر کہیں براہ راست نہیں آیا۔ یہ ذکر تو خیر بعد کو اپنی جگہ پورا پورا ہوگا مگر اتنا تو سن ہی لیجئے،

علامہ کوندوہ سے دلچسپی تھی، مگر علماء کو ان سے دلچسپی کم تھی۔ ان کے نزدیک وہ علی گڑھ رہ کر ساقط الاعتبار ہو چکے تھے۔ تاہم حضرت مولانا محمد علی صاحب ان سے برابر مشورے کرتے رہتے۔'' (۱۰)

علامہ شبلی سے اپنی ابتدائی واقفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ تو کیسے کہوں کہ علامہ کے نام سے واقف کم سنی سے نہ تھا۔ اول تو میرے گھر میں ان کا چرچا رہتا تھا۔ سب سے پہلی کتاب ان کی المامون پڑھی تھی۔ اب تو نہیں مگر اس ایڈیشن میں سرسید کا لکھا ہوا دیباچہ بھی تھا۔'' (۱۱)

سرسید احمد خاں نے المامون طبع دوم پر دیباچہ لکھا تھا جو اب تک کتاب میں شامل ہے۔ سچ ہے کہ شبلی کے اس دور شباب میں سرسید نے ان کی جتنی تعریف و تحسین کی ہے، شبلیات میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

علوی صاحب نے اپنی کم سنی کی ایک شام کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''علامہ ایک مرتبہ میری کم سنی میں ندوہ میں چند روز آ کر ٹھہرے۔ میں شام کو عم محترم (منشی احتشام علی کاکوروی) کے ساتھ ندوہ گیا تو وہ دفتر کے اوپر والے کمرے میں تھے۔ ان کے لئے میز کرسی کی نشست کا انتظام تھا۔ داڑھی کھچڑی تھی۔ سامنے میز پر چند مطبوعہ البم رکھے تھے اور کچھ کتابیں بھی بے ترتیب پڑی تھیں۔ عم محترم سے باتیں ہوتی رہیں۔ مجھ کو انہوں نے وہ البم دیکھنے کو دے دیئے۔ اس میں عمائدین مصر و شام کی تصویریں تھیں جو میں دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مصر و شام و روم کے سفر سے مراجعت کے بعد کا ہے۔'' (۱۲)

اس اقتباس سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ علامہ شبلی نے اپنے سفر روم و مصر و شام کے دوران البم تیار کرائے تھے اور اس میں عمائدین مصر و شام کی تصویریں تھیں۔ ممکن ہے یہ البم ندوہ یا علی گڑھ کے کتب خانوں میں مل جائیں۔ کاش ایسا ہوتا تو سفرنامہ روم و مصر و شام کے حوالہ

سے بعض نئی باتیں سامنے آتیں۔

ایک امریکی اسکالر میکس بروس نے سفرنامہ پر کام کیا ہے بلکہ اب تک کر رہے ہیں، انہوں نے اس سے متعلق بہت سی نئی معلومات جمع کی ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی ترکی میں کن لوگوں سے ملے، ان کی علمی، تعلیمی اور سیاسی حیثیت کیا تھی، وغیرہ وغیرہ۔ ضیاء الحسن علوی صاحب نے بھی سفرنامے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے، کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ شبلی نے سفرنامے کے آخری صفحات میں جدید عربی الفاظ کی جو فہرست درج کی ہے، وہ ہندوستان میں جدید عربی زبان کے حوالہ سے پہلا کام تھا۔ علوی صاحب نے اس فہرست کی نہ صرف افادیت بتائی ہے بلکہ اس سے طلبہ کے استفادے کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۱۳)

ایک زمانہ میں مرزا ہادی رسوا کے ناولوں کی ہر طرف دھوم تھی۔ علوی صاحب نے علامہ شبلی سے امراؤ جان ادا کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:

> ''بھائی میں نے ناول کبھی نہیں پڑھا، لاؤ ذرا دیکھوں تو، تعریف بہت سنی ہے، کتاب لا کر دے دی، صبح کو جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ آج شب کی نیند گئی، اس کم بخت نے سونے نہ دیا، جب تک پورا نہ کرالیا۔'' (۱۴)

علوی صاحب نے مرزا ہادی رسوا اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے میری زبان کی اصلاح کی اور ان کے حکم پر ان کے رسالہ الحکم میں مضامین لکھے۔ علوی صاحب پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جن لوگوں نے لکھا ہے انہوں نے الحکم میں ان کی مضمون نگاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔

علامہ شبلی تھے تو ندوہ کے معتمد تعلیم، مگر اصلاً اور عملاً سب کچھ وہی تھے۔ علوی صاحب اس کے شاہد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''معتمد تعلیم کا اصلی کام تو تعلیم کی نگرانی تھی مگر کام چلانے کے لئے بڑی چیز روپیہ ہے۔ اس کی فراہمی، چلت پھرت والے شخص پر پڑ جاتی ہے۔ ہمارے علامہ کی شخصیت نے خود ان سب کاموں کا ذمہ لے لیا، لہذا ایک

سر ہزار سودا ہو گیا۔ دار العلوم کی نگرانی، ملک میں اس کی تبلیغ، روپیہ فراہم کرنا،
رسالہ الندوہ جو خود ان کی ایجاد تھا، چلانا اور ابتداء میں اس کو خود ہی بھرنا،
طباعت کی فکر اور نگرانی، شعر العجم کی تصنیف یہ کیا کچھ کم مشاغل تھے۔'' (۱۵)

یاد ایام کی ضخامت ۸۴ صفحے ہے، جس میں مختلف مقامات پر ذکر شبلی کے علاوہ یکجا ۲۸ صفحات پر ان کا مسلسل ذکر ہے۔ نہ صرف ان کی سیرت و شخصیت، کردار، اخلاق، تصنیفات و تالیفات، ندوہ، الندوہ، احباب و معاصرین متنوع موضوعات سپرد قلم ہوئے ہیں۔ اس کی تمام تفصیلات نہیں پیش کی جا سکتیں، البتہ چند اہم پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ضیاء الحسن علوی علامہ شبلی کے دور ندوہ کے سب سے زیادہ واقف کار تھے، حتیٰ کہ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی زیادہ۔ خود سید صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ (۱۶) اس حوالہ اپنے بارے میں خود علوی صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ کو میرے ساتھ بڑی محبت اور خصوصیت تھی۔ ان کی نجی صحبتوں
سے بہت کم جدا ہوتا، خواہ علماء کا مجمع ہوتا یا بے تکلف احباب اور طلبہ کا
جمگھٹ۔ اسی وجہ سے ان کے ہر قسم کے حالات پر میری نظر رہی، جیسے وہ
آئے تھے پھر آزاد ہو کر ندوہ کا پبلک کام کر کے، اس کے مشکلات دیکھ کر،
رفتار زمانہ پیمان کر ان کے اگلے خیالات میں جو جو انقلاب اور جن وجوہ سے
وہ پیدا ہوئے سب آئینے کی طرح میرے سامنے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ان کی
جھلک آتی جائے گی اور جو کچھ لکھوں گا وہ صاف صاف بلا رورعایت۔ انسان
ایک تغیر پذیر مخلوق ہے اور تغیرات عالم سے جو کچھ متغیر ہو وہی کامل انسان
ہے۔ ہوا سے لڑنا سرہنگی ہے انسانیت یا شجاعت نہیں۔'' (۱۷)

علامہ شبلی کے معمولات اور ان کی پسند و ناپسند کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ کا یہ معمول تھا کہ شب میں ۹ بجتے بجتے سو جاتے۔ کھانا عموماً

بعد مغرب تناول فرما لیتے ۔ کھانے میں گوشت وہ بھی بھنے ہوئے، تار پر مصالحہ دار کا شوق تھا۔خود بھی کھانا پکا لیتے ۔ چار بجے صبح سے اٹھ بیٹھتے ۔ لیمپ کے چولہے پر چائے کی کیتلی رکھ دیتے ۔شب کو خدمت گار سب سامان قرینہ سے رکھ کر چلا جاتا۔آپ ہی چائے بنا کر پیتے ۔شاعری کا وہی وقت تھا۔اول نماز سے فراغت کرتے ، کچھ تلاوت بھی کر لیتے ، پھر میز پر اور کبھی فرش پر بیٹھ کر تصنیف شروع ہو جاتی اور یہ مشغلہ صبح ۸ بجے تک ختم ہو جاتا۔فرماتے تھے کہ بھائی یہ وقت اپنا ہوتا ہے ، بلا مداخلت غیرے جو چاہو کرو۔ پھر تو جناب دنیا بھر کے مشغلے چھڑ جاتے ۔لوگ آنے والے کیا کم تھے۔ میرے لئے کوئی پابندی نہ تھی ، کیوں کہ اگر بے وقت بھی چلا جاتا تو چپ چاپ ایک کونے میں ان کو مشغول پا کر بیٹھا رہتا۔ جب وہ خود مخاطب ہوتے تو چونکتا۔ مجھ کو اس علم کے دیوتا کے ساتھ محویت تھی ۔ اگر کوئی فکر کلام کرتے یا کوئی نئی تحقیق ہوتی تو سب سے پہلے میں ہی سن لیتا تھا۔جس زمانے میں کسی تصنیف کو تیز رفتاری سے ختم کرنا ہوتا یا الندوہ بھرنا ہوتا تو اس زمانے میں اس وقت میں توسیع ہو جاتی ۔دس بجے تک ۔ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا یہ بات نوٹس چاہتی ہے، لہٰذا دروازہ پر لکھ کر کہہ دیتے کہ احباب معاف فرمائیں ، میں دس بجے تک مصروف ہوں ۔ دس گیارہ بجے کے درمیان کھانا کھاتے ، اس وقت بھی وہی ایک مرغوب غذا ہوتی ۔ دو قسم کے کھانے کم ہوتے ، اس کے بعد اگر کوئی بے وقت آنے والا نہ آ دھمکا تو دارالعلوم میں اتر کر آتے اور تعلیم کی نگرانی فرماتے یا مدرسین کے خالی اوقات مدرسہ میں خود ان کے پاس چلے جاتے ، ہر فن کی تعلیم کی بابت ان کو ہدایتیں فرماتے اور کبھی کتاب منگا کر خود پڑھ کر ان کو پڑھانا بتاتے ۔'' (۱۸)

علامہ شبلی تصنیف و تالیف کے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ چاہے وہ سفر

میں ہوں یا حضر میں، اپنے معمولات پر سختی سے کاربند رہتے۔ بیماری کے زمانہ میں بھی اس میں فرق نہیں آتا۔ دہلی کے زمانہ قیام کے اہتمام کا ذکر ملا واحدی اور ضیاء الدین احمد برنی نے بھی کیا ہے۔ مگر ضیاء الحسن علوی نے کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ بھی ان پر خدا کی رحمت تھی کہ باوجود صحت کی اتنی خرابی کے دماغ صاف رہتا کہ سخت سے سخت بخار کی حالت میں بھی وہ ساہی الفواد کبھی نہ ہوتے۔ فرماتے تھے کہ اس قدر سخت قبض اور باسوری تکالیف کے اثرات حلق تک رہتے ہیں، دماغ کی طرف صعود نہیں کرتے ہیں۔ لہذا ابخار میں اور بخار تو کشمیری تحفہ تھا، اکثر آ جاتا، تصنیف کا کام نہ رکتا۔ البتہ کتب بنی بند ہو جاتی، مگر باتیں کرنے کا شوق تھا، اس میں کوئی کمی نہ ہوتی۔ شدت تکلیف میں چند منٹ کراہ لیتے پھر ہلکے ہو جاتے۔ ملیریا کا بخار تھا، سردی بھی لگتی تھی، اس لئے لحاف یا کمبل بستر ے سے کم ہٹتا۔ الکلام تو ساری کی ساری شدت بخاری میں تصنیف کی مگر اس کی ڈھنڈک تو دیکھئے کہ کسی پر بھی بخار نہ نکالا، حتی کہ ملاحدہ سے اعتراضات کے جواب میں بھی ان کا وہی اعتدال قائم رہا اور کہیں قلم تیز نہ ہوا۔ ۱۲-۴ تک کا وقت عموماً مطالعہ اور فراہمی مواد میں صرف فرماتے۔ اس کے بعد اگر احباب آ جاتے تو خیر نہیں تو ٹہلنے کو نکل جاتے اور دور دور تک چلے جاتے، میں اکثر ساتھ ہوتا، دنیا بھر کے اگلے پچھلے عام دلچسپی کے واقعات کا ذکر رہتا۔''(۱۹)

علامہ شبلی حقہ پان وغیرہ کے تکلف سے بری تھے۔ البتہ شکر دان سامنے رہا کرتا تھا اور اس سے شغل کیا کرتے تھے، حتی کہ تگنی کے چاولوں میں شکر ملا کر کھاتے۔ اس کی تفصیل بھی علوی صاحب نے لکھی ہے۔ ایک ڈاڑھ کے گر جانے اور ڈاکٹر اکرم حسین، امین آباد سے ڈاڑھ لگوانے اور پھر اسے استعمال نہ کرنے کی بھی تفصیل لکھی ہے۔ مزاج میں اضطراب اور لکھتے وقت اعضا و جوارح کے متحرک ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنوعی پاؤں کے استعمال اور اس کی تکالیف

کے برداشت کرنے کی بھی بات لکھی ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

''مگر اس شخص کی ہمت کی داد دیجئے، پاؤں کٹا تو مصنوعی پاؤں اور اس کی بندشوں کو برداشت کرتے ۔تمام قومی تحریکوں میں حصہ لیتے۔ دور دراز کے سفر کرتے اور گھنٹوں کھڑے کھڑے تقریریں فرماتے۔''(۲۰)

اس کے بعد علوی صاحب نے دارالعلوم کے قدیم رنگ اور اس کی کمیوں کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے اسے بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی کی ندوہ آمد اور اس میں انقلاب پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اب جب ہمارے علامہ دارالعلوم میں قدم رنجہ فرما چکے تو میری تکلیف جو ہمارے مولانا [محمد فاروق چریا کوٹی] کے تشریف لے جانے سے تھی رفع ہونے لگی اور نعم البدل پا کر یہ پژمردہ دل شباب علم کے ولولے سے لبریز ہو کر چھلکنے لگا۔ ہر مشکل کا حل سامنے تھا۔ ہر گتھی سلجھانے والی انگلیاں چلنے لگتی تھیں۔ بندھے ہوئے عقدے ایک ادنی سا اشارہ میں کھل کھل جاتے۔ اس منزل علم کے لئے ایسے ہی رہبر کی ضرورت تھی۔''(۲۱)

اس کے بعد علوی صاحب نے علامہ شبلی کے طریقہ تعلیم و تربیت، اصلاح نصاب اور قدیم نصاب کے نقصانات وغیرہ کی تفصیل لکھی ہے اور پھر ہر موضوع کی تعلیمی کیفیت اور اس میں علامہ شبلی کی آمد سے رونما انقلابات کو بیان کیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے طریقہ تفہیم قرآن اور ان کے ماموزاد بھائی ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہی [۱۸۶۳-۱۹۳۰ء] کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارے علامہ کو کسی آیت قرآنی کی بلاغت پر دائمی وجد آجاتا تھا اور پھر اس کے حسن کو بیان کرتے ۔بعض مرتبہ ہندی دوہے پڑھ پڑھ کر اس کی مثالوں کو ذہن نشین کر کے اس کے حسن کی توضیح کرتے تھے، مگر اپنے شاگرد اور عزیز علامہ فراہی کی تحقیق اور عمیق نظر کے ہمیشہ معترف رہتے۔ ان دونوں

بھائیوں کے مکالمے جن کو سننے کا اتفاق ہوا ہے بڑے علم آموز اور وسعت نظر پیدا کرنے والے ہوتے، مگر فرق یہ تھا کہ علامہ ارسطو کی بوطیقا اور قواعد معانی و بلاغت سے گھرے تھے اور علامہ فراہی ان گرفتوں سے نکل چکے تھے۔ ان میں قرآن فہمی کا ایک حسن باطنی پیدا ہو گیا تھا۔ انہیں مکالموں کا نتیجہ ہے کہ شعر العجم میں شعر کی حقیقت پر جو بحث ہے وہ اس صدی میں شاعری پر بہترین مقالہ ہے۔'' (۲۲)

شعر العجم کی تصنیف کو علامہ شبلی اپنے بچپن کا شوق بتاتے تھے۔ چنانچہ علوی صاحب نے ان سے عرض کیا کہ آپ اپنے پیش نامے سے باہر کیوں جا رہے ہیں، ابھی تو وہ کام باقی ہیں، فرمایا:

''اب تم لوگ کر لینا، مگر یہ تو میرا بچپن کا شوق ہے، اس کو تو پورا ہی ہو جانے دو، ورنہ رہ جائے گا۔'' (۲۳)

شعر العجم اور براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا زمانہ تصنیف تقریباً ایک ہی ہے۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ شبلی نے شعر العجم کا خیال براؤن سے لیا ہے۔ مولوی عبدالرزاق کان پوری نے صراحت سے لکھا ہے کہ شعر العجم کی بنیاد براؤن کی کتاب پر رکھی گئی ہے۔ علوی صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''براؤن کی ادبیات ایران شائع ہوئی، ادھر شعر العجم کا بھی اشتہار ہو چکا۔ لوگ سمجھے کہ علامہ نے یہ خیال اسی سے لے لیا ہے۔ مگر اس سے پہلے شعر العجم بہت کچھ ہو چکی تھی، تاہم بے چین مصنف نے براؤن کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھوا کر اس کا ترجمہ سن لیا، پھر کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ اس نے میرا کام نہیں کیا، حالاں کہ براؤن نے بعد کی جلدوں میں خود علامہ سے بڑے شکر و امتنان کے ساتھ بہت کچھ نقل کیا۔ یہ جواب تھا ان لوگوں کا جنہوں نے بدظنی کو دخل دیا۔ **ان بعض الظن اثم**. اس کے بعد شعر العجم کی تنقیدیں میرے نزدیک وہی مرتبہ رکھتی ہیں جو الفرق اور الفاروق میں ہے۔'' (۲۴)

الفرق علامہ شبلی کی کتاب الفاروق کے جواب میں ایک شیعہ عالم عابد علی بیگ قزلباش نے دو جلدوں میں لکھی ہے اور جو مراد آباد سے شائع ہوئی ہے، مگر اہل علم نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ الفاروق علامہ شبلی کو اپنی تصنیفات میں سب سے زیادہ پسند تھی۔ علوی صاحب نے یاد ایام میں الفاروق کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے ایک مرتبہ حضرۃ الاستاذ سے سوال کیا کہ آپ کو اپنی تصانیف میں سب سے پیاری کون سی تصنیف ہے؟ فرمایا، الفاروق۔ یہ حق بھی ہے۔ وہ اولاد بہت پیاری ہو جاتی ہے جس کی پرورش میں زیادہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ اسی ایک تصنیف کے لئے لمبے لمبے سفر کئے۔ طویل علالت جس کے جراثیم عمر بھر ستایا کئے، اسی ایک کتاب کی بدولت اٹھائی۔ چھپن ستاون برس کی عمر میں مولانا ایک پیر فرتوت معلوم ہوتے تھے، حالاں کہ وہ اکھاڑے میں اترنے والے کسرتی جوان تھے۔ مولانا حالی سے سچے نقاد سیرت نے ان کی شان میں خوب کہا ہے:

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں (۲۵)

کلامی اور فلسفیانہ مسائل اور ان کی الجھی ہوئی گتھیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے،
''علامہ کی رہبری اور علامہ فراہی کی توضیحات کی بدولت سمجھ میں آ گئی، جو الحمد للہ ہمیشہ قائم رہی۔'' (۲۶) بعد میں علوی صاحب جب جدید فکر و فلسفہ اور یورپ کے فلاسفہ اور ان کے افکار سے واقف ہوئے، تو انہیں کسی طرح کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ (۲۷)

علامہ حمید الدین فراہی نے کئی سال تعطیلات میں ندوۃ العلما میں درس دیا۔ ویسے بھی علامہ شبلی سے ملنے ندوہ جایا کرتے تھے۔ وہاں قرآنی دروس کے علاوہ الدروس الاولیہ بھی پڑھائی۔ ضیاء الحسن علوی صاحب کی یاد ایام سے ندوہ سے متعلق ان کی خدمات اور ندوہ پر ان کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ حمید الدین فراہی کی شخصیت کے اس گوشے یعنی ''علامہ فراہی اور ندوہ'' کے

مستقل مطالعہ کی ضرورت باقی ہے۔علوی صاحب ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ فراہی تعطیل کلاں میں ہمارے علامہ کے پاس آجاتے اور ہم لوگوں کو کچھ نہ کچھ پڑھاتے۔انہوں نے ایلن جیکسن کی مابعد الطبیعات عربی میں پڑھائی تھی۔اگرچہ کتاب سمجھتا تھا مگر کچھ شوق سے نہ پڑھتا تھا کیوں کہ مجھ کو پوری مغربی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔لہذا سمجھتا تھا کہ آگے چل کر دیکھا جائے گا۔میں ان سے قرآن پاک اور ادب کے نکات اخذ کرتا تھا۔کسی نہ کسی آیت کو لے کر مکالمہ چھیڑ دیتا تھا۔وہ خاموش آدمی تھے،مگر طالب علم کے لئے ایسے نہ تھے۔دل ہی میں یہ تھا کہ ان کی غیر مختتم تصانیف کے احوال اور تفسیر کا لب لباب ذہن نشین کرلوں۔علاوہ تھوڑی بہت تفصیلی معلومات کے ان کی تفسیر کا پورا مرقع ذہن میں آ گیا تھا، چنانچہ جب بعض بعض ٹکڑے ان کی تفسیر کے شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ان کی کتابوں کا سمجھنا خاص کر جب وہ ٹکڑوں میں شائع ہوتی ہیں کچھ آسان نہیں ہے۔شاگردانہ تعلی پر ناظرین محمول نہ کریں،مگر میں صدق دل سے کہتا ہوں کہ ادب،قرآن اور قرآن فہمی میں وہ اپنی آپ مثال تھے۔''(۲۸)

حالی وشبلی کے حوالہ سے متعدد اہل قلم نے مضامین و مقالات لکھے ہیں۔مہدی افادی نے دونوں کے درمیان معاصرانہ چشمک کا شوشہ چھوڑا اور بعض اہل قلم نے حد سے متجاوز ہوکر حالی وشبلی کو پہلے مدمقابل قرار دیا، پھر حالی کو شریف النفس کہہ کر ساری تان علامہ شبلی پر توڑی۔مگر اصل معاملہ کیا تھا،مولانا ضیاءالحسن علوی کی زبانی سنئے:

''علامہ کو ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے سنا ہے مگر حالی صاحب کی جب کی تو تعریف ہی کی۔اگرچہ بعض عالمانہ اختلاف مقدمہ [شعروشاعری] سے ان کو بھی تھے۔''(۲۹)

ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] علامہ شبلی کے بڑے مداح تھے۔تفصیل کے لئے ملاحظہ

ہوراقم کی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں''۔ ڈپٹی نذیر احمد نے نہ صرف شبلی کی تحسین وستائش کی بلکہ ان کے ندوہ آنے کو بھی پسند کیا اور ماہنامہ الندوہ کی تحسین میں عربی میں چند اشعار بھی کہے۔ اس کا ذکر بھی یادایام میں ہے۔ البتہ یادایام سے ایک نئی بات کا علم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد علامہ شبلی سے علمی مواد حاصل کرتے اور استفسارات کرتے تھے۔ علوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نذیر احمد بڑے مصنف اور نثار تھے، مگر مواد کے لئے اپنی تصنیفات میں ان سے مستفید ہوتے۔ علامہ کی علالت کے زمانہ میں میں نے اس قسم کے استفسارات کے جواب لکھے ہیں۔''(۳۰)

علامہ شبلی اپنے عہد میں مختلف حیثیتوں سے معروف تھے۔ لوگوں کو علمی کاموں کا مشورہ دینا، تصنیفی منصوبہ بنانا، مواد فراہم کرنا یا ان کی نشاندہی کرنا بھی ان کی زندگی کا ایک کام تھا۔ مکاتیب شبلی میں اس طرح کی باتیں بھری پڑی ہیں، لیکن ڈپٹی نذیر کے حوالہ سے یہ باتیں یادایام کے سوا کہیں اور نظر سے نہیں گذریں۔ اس سے دونوں کی عظمت اور بڑوں کے طریقہ کار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یادایام میں ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں تمام اہل علم اور ارباب کمال جمع ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی تشریف لائے تھے۔ علامہ شبلی اس وقت علاج کے لئے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ملاقات نہ ہونے پر دکھ کا اظہار کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد سے شبلی کی پہلی ملاقات ۷۶-۱۸۷۵ء میں اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ وہ برسوں اعظم گڑھ کی ایک تحصیل سکندر پور کے تحصیل دار رہے۔ [یہ سکندر پور اب ضلع بلیا کا حصہ ہے] علامہ شبلی لاہور سے مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے واپس آئے تو ڈپٹی نذیر احمد نے کہا ''اجی تم تو بڑے تگڑے نکلے، میرے استاذ سے بھی پڑھ آئے۔'' (۳۱) اس سے ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی کی پہلی ملاقات کی تعیین ہوتی ہے، جو اس سے پہلے نہیں کی جاسکی تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یسین آہ دہلوی سے علوی صاحب کی ملاقات ہوئی۔ مولانا آزاد اور ان کے بھائی کا علوی صاحب نے

بڑے دلکش انداز میں ذکر کیا ہے:

''شام کو حسام الملک نواب علی حسن خاں صاحب کی طرف سے قیصر باغ میں بارہ دری کے جنوبی لان پر پارٹی [بقول حیدرآبادیوں کے عصرانہ] تھی۔ لوگ رخصتی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر شمس العلما نذیر احمد صاحب سے کھڑے ایک صاحبزادے گورے گورے سے سیاہ ٹرکش کوٹ اور ایرانی ٹوپی پہنے، چہرہ بڑا سا مگر قد موزوں، بظاہر برس پندرہ یا سولہ کا سن قطف الذہور ہاتھ میں لئے، نہایت طراری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔.......ان کے پاس قاری میران شاہ ندوہ والے کھڑے تھے۔ وہ بڑے جہانیاں جہاں گشت اور جہاں دیدہ تھے۔ ان سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ انہوں نے ان کی پوری تاریخ بتادی۔ اب تو اور شوق ملاقات بڑھ گیا۔ ان کے مضامین رسائل میں دیکھے تھے۔ چند ہی منٹ میں وہ کھینچ کر میری جانب آ نکلے۔ قاری صاحب نے تعارف کرایا۔ انہوں نے کہا میں علامہ [شبلی] سے مل کر بمبئی سے آرہا ہوں۔ لیجئے دو دل مل گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب [ابوالنصر غلام یسین آہ دہلوی] بھی تھے۔.......کانفرنس کے خیال سے بمبئی سے چلے تھے، راہ میں نہ جانے کہاں اٹک گئے، سیلانی تو تھے ہی کانفرنس کی حالت نزع میں لکھنؤ پہنچے۔ خیر صورت دیکھ لی۔ تھوڑی دیر تک ہم لوگ بیٹھ کر ایک خیمہ میں باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور عزیز آ گئے۔ غرض وہ اٹھ کر جناب منشی احتشام علی قبلہ کی کوٹھی پر آ گئے، اب اطمینان سے ہم تینوں میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ مجھ پر اپنا علمی رعب جمانے لگے۔ بھلا میں کہاں پٹھے پر ہاتھ رکھنے دینے والا تھا۔ اس میں تو وہ کچھ ٹھہرے نہیں، لیکن ہاں فن قومیات اور عام معلومات اور سرسید اور ان کے حواریوں کے لٹریچر کے وہ حافظ ضرور تھے، مگر بلا کے ذہین تھے۔ اشہب زبان اور اشہب قلم

دونوں فراٹے بھرتا تھا، بڑے بھائی کا نام ابوالنصر غلام یسین آہ دہلوی تھا اور چھوٹے کا ابوالکلام محی الدین آزاد تھا۔ ناظرین اس طوالت رسمی کو طوالت ریش پر قیاس نہ کرلیں، نہیں وہ بڑے فہمیدہ اور ہوش مند تھے۔ ہمارے دوست مولانا ابوالکلام تو اس وقت ہندوستان کے سرتاج ہیں۔'' (۳۲)

یہ طویل اقتباس اس لئے درج کیا گیا کہ مولانا آزاد اپنے دور شباب میں کیسے تھے اور ان کے ہم عصر کیا محسوس کرتے تھے واضح ہو جائے۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ بعض اشخاص نے شبلی سے ابوالکلام کی پہلی ملاقات پر بڑی خامہ فرسائی کی ہے اور بڑے دلائل سے سنہ ملاقات ۱۹۰۴ء قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں ارباب کمال کی ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی اور چوں کہ یہ ایک قابل ذکر واقعہ ہے، اس لئے مولانا آزاد نے ان کے شاگرد رشید مولانا ضیاءالحسن علوی سے خاص طور پر اس کا ذکر کیا اور یہی سنہ ملاقات خود مولانا آزاد نے'' آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں بھی املا کرایا تھا۔ مالک رام نے بھی تحقیق کر کے یہی سنہ لکھا ہے۔ تعجب ہے کہ اس قدر صراحت کے باوجود سید صاحب نے ۱۹۰۵ء اور بعض دوسرے اہل نے دوسری تاریخیں قلم بند کردیں اور بعض لوگوں نے بزعم خود اس کی تحقیق میں صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالے ہیں۔

مولانا ضیاءالحسن علوی نے ماہنامہ الندوہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ الندوہ کے دو ایڈیٹر تھے۔ علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی۔ انہوں نے شروانی صاحب کی شخصیت اور علم و ادب پر ان کی گہری نظر، ذوق کتب بینی، کتب خانہ اور اس کے عجائبات کی فراہمی، زمیندارانہ مصروفیات وغیرہ کی تفصیل سپرد قلم کرنے کے بعد الندوہ سے ان کی بے توجہی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''علامہ اکثر جز بز ہوتے، ایک مرتبہ تو لکھ دیا کہ ان کو اپنے رئیسانہ مشاغل سے فرصت نہیں ملتی۔ بعد کو اس لفظ پر ندامت اور معافی چاہی۔ یہ ان کی خاص خصوصیت تھی۔ اپنی غلطی پر سخت انزجار ہوتا تھا، مگر علامہ کو علم کے سوا

اور کام ہی کہاں تھا۔ ان کو تو بہت کام تھے، خانگی امور کا سرانجام، ایک شاہانہ طبیعت کے بزرگ چچا کی اطاعت اور خدمت یہ کوئی معمولی کام نہیں ہوتا ہے۔ اس کو جو جانتے ہیں وہی جانتے ہیں۔ اس لئے الندوہ کا بوجھ بہت کچھ علامہ پر پڑتا۔ اس رسالہ کی اہمیت اس سے زیادہ کیا بیان کی جاسکتی ہے کہ اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا اسلامی مصنف اس کا ایڈیٹر تھا۔''(۳۳)

یادایام میں علامہ شبلی اور ان کے کارناموں کا ذکر تو ہے ہی مستقبل کے لئے ان کی فکر مندی کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک دن شرر صاحب اور ہمارے علامہ بیٹھے تھے۔ دونوں نے اپنے اپنے پرداز پر اسلامی ادبیات کی خدمت کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ آپ لوگوں نے اتنا کرلیا ہے کہ ہمارے لئے کیا رہ گیا؟ علامہ نے فرمایا ابھی ہوا کیا ہے۔ شرر صاحب جو ہمیشہ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے تھے بولے ہم نے داغ بیل ڈالی ہے، اب کیاریاں تم لوگ بھرنا۔''(۳۴)

علوی صاحب نے ایک جگہ اردو کے نامور انشاپردازوں کے طریقہ تصنیف وتحریر کا موازنہ کیا ہے اور واقعی بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

'' اگلے اردو انشاپردازوں میں سرسید اور نذیر احمد کو چھوڑ کر علمی انشاپرداز آزاد، حالی اور شبلی ہیں۔ آزاد کا طریقہ تصنیف یہ کہ سادہ کاری پر نقش بھرتے ہیں۔ یعنی پہلے مضمون لکھتے پھر اس کے پر کترتے، کاٹ کاٹ کر اور نئے چیپتے لگا کر سارا صفحہ منبت کار بنادیتے۔ لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ عبارت میں آمد ہے، معلوم تو ہوتی ہے مگر کس قدر پوشیدہ آورد کے بعد۔ حالی اپنا لکھا خود صاف کرتے اور صفائی کے وقت اس پر اصلاح دیتے جاتے۔ شبلی برجستہ لکھتے کہیں کہیں حاشیہ پر گھٹاتے بڑھاتے، طبیعتوں کا اختلاف تو دیکھو، حالی صاحب کے مزاج میں جو سکون تھا وہ ان سے اپنا مسودہ صاف کرالیتا،

مگر علامہ کی طبیعت میں اضطراب تھا ،اس لئے مسودہ کسی منشی کے سپرد ہوجاتا۔''(۳۵)

ندوہ میں علامہ شبلی کا مسودہ منشی عارف الزماں صاف کرتے تھے۔ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ یہ کون بزرگ تھے۔اس کے بعد علوی صاحب نے اپنی مضمون نگاری اور شبلی کی تربیت کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح موضوعات بتاتے ، پھراس کے متعلق معلومات و مواد کی نشاندہی کرتے۔اس سے وہ پورا منظر سامنے آجاتا ہے جو شبلی اپنے تلامذہ کی تصنیف و تالیف کی تربیت کے لئے اختیار کرتے تھے۔

علامہ شبلی مردم سازی کے لئے معروف ہیں۔انہوں نے اپنی تربیت سے اردو کو متعدد نامور اہل قلم دیئے۔مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری فلسفی اور خود مولانا ضیاءالحسن علوی وغیرہ کی انہوں نے اسی طرح تصنیفی تربیت کی تھی۔

زبان کے سلسلے میں علوی صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی اپنی زبان کو مستند کبھی نہ سمجھتے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ الفاروق کا نیا ایڈیشن شائع ہونا تھا، انہوں نے منشی واحد علی صاحب کے پاس بھیجا اور کہا کہ وہ اس کی زبان درست کردیں۔ چنانچہ منشی واحد علی نے کئی دن اس کو غور سے پڑھا اور چند مقامات پر کچھ بنا کر الفاروق کو واپس کیا اور کہا کہ شبلی خود صاحب طرز ہیں۔علوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ منشی واحد علی نے جو اصلاحیں کی تھیں، علامہ شبلی نے وہ سب منظور کرلیں۔

راقم کو یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ منشی واحد علی کون بزرگ تھے؟ ہاں یادایام سے یہ ضرور واضح ہے کہ وہ اہل زبان تھے، مگر اب واقعہ یہ ہے کہ شبلی اور الفاروق کو ساری دنیا جانتی ہے اور منشی واحد علی سے کوئی واقف نہیں۔شاید کام کرنے اور نہ کرنے کا یہی فرق ہے۔

علوی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے ساری عمر دہلی والوں کے درمیان گذاری۔لکھنؤ آئے تو یہاں کی زبان کا چٹخارہ لینے لگے۔ایک مرتبہ کہا کہ یہ چاٹ پرانی ہے۔ علی گڑھ سے بہت پہلے کی۔(۳۶) علامہ شبلی کی زبان دانی کے ذکر میں علوی صاحب لکھتے ہیں:

''انگریزی کے حرف شناس تھے۔کبھی کبھی الفاظ پوچھ کر صحیح جملے ادا کر لیتے۔فرانسیسی پروفیسر آرنلڈ سے سیکھی تھی اور اس کا اپنے مضمون اور موضوع کے مطابق کچھ مطلب حل کر لیتے تھے۔ان کی فارسیت ان کی عربیت سے بلند تھی،مگر عربیت بھی بہت اچھی تھی۔''(۳۷)

علامہ شبلی نے نسبتاً اردو ادب پر کم کام کیا ہے،لیکن انہوں نے اردو شعراء کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔اس کا اظہار تذکرہ گلشن ہند کی تصحیح سے بھی ہوتا ہے۔ضیاءالحسن علوی نے لکھا ہے کہ''اردو شعرا میں کون تھا جس کے کلام کا ذکر ہوا اور علامہ کو کچھ نہ کچھ یاد نہ ہو۔''(۳۸)

علامہ شبلی کو عام طور پر حامی کانگریس خیال کیا جاتا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی اور متعدد اہل قلم نے اس کی صراحت کی ہے اور خود علامہ کی تحریروں میں اعتراف ہے کہ وہ ہمیشہ کانگریس کو دل سے پسند کرتے رہے،مگر علوی صاحب نے اس کے برعکس لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''علامہ کے سیاسی خیالات میں انقلاب ہو چکا تھا۔یہ تو محض غلط ہے کہ وہ ہندوؤں کے دوش بدوش چل کر کوئی کام کرنا چاہتے تھے، بلکہ ان کا سیاسی منتہائے خیال ڈاکٹر سر اقبال مرحوم کے نکتہ خیال سے کبھی نہیں متجاوز ہوا۔دوسری قوم کی کوشش دیکھ کر متاثر ہوتے اور ان کو اپنے یہاں کر کے دیکھنا چاہتے۔گروکل دیکھا تو سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح قائم کیا،ان کا خیال پہلے اپنے میں اہلیت پیدا کرنے کا تھا۔''(۳۹)

یہاں علوی صاحب سے سہو ہوا ہے۔مدرسۃ الاصلاح علامہ شبلی نے نہیں،ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے والد مولوی محمد شفیع صاحب نے قائم کیا تھا۔ہاں شبلی چاہتے تھے کہ مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ میں گروکل جیسی انکساری پیدا ہو۔آخر میں انہوں نے جو جامعہ اسلامیہ کا تصور پیش کیا تھا اس میں شبلی کالج اور دارالمصنّفین کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح بھی شامل تھا۔چوں کہ ان کی وفات کے بعد ان اداروں میں اشتراک عمل قائم نہ ہو سکا اور تینوں نے علاحدہ علاحدہ

خدمات انجام دیں۔اس لئے علامہ شبلی کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔تاہم ان تینوں اداروں نے بڑی عظیم الشان خدمات انجام دیں،جنہیں کبھی بھلایا نہ کیا جا سکے گا۔

سرسید اور شبلی کے ربط وتعلقات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔مضامین ومقالات کے علاوہ فاروق دیوانے ایک کتاب بھی سپردقلم کی ہے۔ایک طبقہ شبلی کو سرسید کا مخالف اور حریف قرار دیتا ہے اور دوسرا انہیں سرسید کا پروردہ۔دونوں اپنی اپنی انتہاؤں پر ہیں۔علوی صاحب نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔وہ علامہ شبلی کے سیاسی رجحانات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''سرسید کی کوششوں کا نتیجہ ان کے نزدیک ''وضع الشی فی غیر محلّہ'' ہوکر رہ گیا تھا،اسی وجہ سے ان کو رغبت ایجوکیشنل کانفرنس سے نہیں باقی رہی۔نکتہ چینوں نے کہا کہ سرسید کے بنائے شبلی اب سرسید کے خلاف ہوگئے۔اس میں جرم کیا تھا؟ کتنے سرسید کے پیدا کئے ان کے خلاف ہو چکے تھے۔وہ ایک تجربہ کو کامیاب نہ پاکر مسلمانوں کے لائحہ عمل کو ضرور بدلنا چاہتے تھے۔کسی وقتی سیاسی ضرورت سے اتحاد عمل دوسری قوم کے ساتھ جیسا کہ محمد علی اور شوکت علی مرحومین نے کیا اور پھر تائب ہوگئے۔اس سے زیادہ پسند نہ فرماتے،وہ کانگریسی کبھی نہیں ہوئے۔''(۴۰)

یادایام کے آخری صفحات میں علوی صاحب پھر ایک ذیلی عنوان ''حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی'' قائم کرتے ہیں اور اس میں علامہ شبلی کی تعلیم،ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کا طریقہ، ان کا بے مثل حافظہ اور قوت آخذہ وغیرہ کی ایک ایک چھوٹی بڑی باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے ایک سے زاید بار یہ لکھا ہے کہ انہیں مولوی پسند نہیں کرتے تھے۔ندوہ میں بھی ایک طبقہ تھا جو ان کے خلاف ہیجان برپا کیا کرتا تھا۔پھر انہوں نے ندوہ کی اسٹرائک کا ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل سید صاحب نے بھی حیات شبلی میں لکھی ہے۔اس کی کسی قدر تفصیل علوی صاحب کے دلچسپ انداز تحریر میں ملاحظہ ہو:

''علی گڑھ میں تھا،بی.اے کا امتحان دے چکا تھا کہ شب کو خواب میں

دیکھا کہ ایک بہت بڑی محفل میلاد منعقد ہے۔ عیدگاہ میں حضرت علامہ وہاں کھڑے بیان فرمارہے ہیں۔ دوسرے روز خبر وفات کی ملی، **انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.**

اس خواب کی مناسبت سنئے علی گڑھ سے چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ندوہ میں اسٹرائک ہوچکی ہے۔ مولویوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ علامہ کنارہ کش ایک حد تک ہوچکے ہیں۔ ایک آنکھ میں نزول ماء شروع ہوگیا ہے، میں حاضر ہوتا ہوں، اسٹرائک کا قضیہ سنتا ہوں۔ قلق ہوتا ہے۔ ان کی معذوری پیش نظر ہوجاتی ہے۔ اب وقت اس قسم کے برداشت کرنے کا نہیں ہے۔ عقیدت مند شاگرد مشورہ یکسوئی کا دیتا ہے۔.........اب **مخلصین له الدین** کا وقت ہے، **الامر بابخواتیم** ، استاد علامہ بے چین ہوجاتے ہیں۔ استاذ شاگرد آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ استاذ فرط محبت سے شاگرد کو لپٹا لیتا ہے۔"(۴۱)

ندوہ میں علامہ شبلی کے خلاف ایک اور ہیجان انگیز منظر ملاحظہ فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ بعض علما میں اس سے پہلے علامہ کے خلاف ہیجان پیدا ہوا، جس کی تحقیق اور تفتیش کے لئے ایک جماعت اراکین ندوہ کی آ گئی۔ صبح کو حضرۃ الاستاذ کی قیام گاہ پر چند علماء بیٹھے ہیں۔ الکلام شائع ہوچکی ہے۔ پروف کی جلد، نواب محسن الملک مرحوم آئے۔ وہ نہ مانے۔ کسی طرح اپنے ساتھ لے گئے۔ وہی جلد میں نے بھی پڑھی تھی مگر اس کے بعد والی مجلد رکھی تھی۔ جناب مولانا مسیح الزماں خاں صاحب نے اس کو اٹھالیا۔ اتفاق دیکھئے صفحہ وہی کھلتا ہے جہاں علامہ نے ملاحدوں کے اعتراض نقل کئے ہیں۔ اس وقت علامہ نے بعجلت بے چین ہوکر فوراً ان سے کہا کہ حضرت بس ملاحدہ کے اعتراض نقل کئے ہیں۔ خوف ہوا کہ یہ عصبیت کی رو میں کہیں ان اقوال کو انہیں کے اقوال نہ سمجھ لیں تو سونے پر سہاگہ ہو، اگرچہ نقل کفر کفر نہ باشد۔"(۴۲)

علوی صاحب نے علامہ شبلی کی سادہ طبیعت اور سادگی پسندی اوراس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔سادگی اور قناعت سے متعلق ان کے خیالات بھی نقل کئے ہیں۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ بڑے سخی اور داتا تھے، باوجود اس کے وہ مولانا شبلی کو دور طالب علمی میں اخراجات کے لئے محض پانچ روپئے دیتے تھے۔ (۴۳) بعد ازاں علوی صاحب نے علامہ شبلی کے اضطراب اور سیماجی کیفیت کا ذکر کیا ہے اور ذکی الشعور لکھا ہے اوران کی ایک ایک ادا جوانہوں نے دیکھی بیان کی ہے۔علامہ کی دلی کیفیت کا حال ملاحظہ ہو:

> ''ان کی طبیعت میں لوچ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور دل اس قدر نرم تھا کہ بعض واقعات حیرت انگیز دیکھے، گرمیوں میں پنکھا نہ کھنچواتے، ایک مرتبہ کسی علالت کے موقع پر میں نے عرض کیا تو فرمایا کہ بھائی کسی دوسرے کا پنکھا کھینچنا اور غلامی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خیالات میں سیاسی انقلاب ذہنی وجوہات سے زیادہ قلبی نزاکتوں پر مبنی تھا۔'' (۴۴)

ندوہ کے حالات کے پیش نظر علوی صاحب نے انہیں سیرت کے لئے یکسو ہو جانے کا مشورہ دیا، جسے علامہ نے قبول کرلیا۔سیرت کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''مولوی کچھ سمجھیں ''**انما الاعمال بالنیات**'' یہ میرا ایمان ہے کہ خلوص کی کوئی کمی نہ تھی۔علم وفہم میں کیا کسر تھی۔قبولیت کیوں نہ حاصل ہوتی۔ عشق رسولؐ سے ہر رگ پھڑکی ہوئی تھی۔'' (۴۵)

یادایام اگرچہ مولانا ضیاء الحسن علوی کی خودنوشت ہے لیکن دراصل یہ شبلی اور جہان شبلی کا ایک مرقع ہے اور تفہیم شبلی کے لئے اس کا مطالعہ ازحد ضروری ہے۔کاش یہ مکمل ہوگئی ہوتی۔

حوالے

(۱) یادرفتگاں ص ۳۲۶

(۲) معارف جولائی ۱۹۶۵ء

(۳) یادایام ص۱۳ وغیرہ

(۴) ایضاً ص۱۴۔۱۵

(۵) ایضاً ص۴۱

(۶) ایضاً ص۲۳

(۷) ایضاً

(۸) ایضاً ص۲۳

(۹) ایضاً ص۲۳

(۱۰) ایضاً ص۳۱

(۱۱) ایضاً ص۳۱

(۱۲) ایضاً ص۳۱

(۱۳) یادایام ص۳۰

(۱۴) ایضاً ص۴۳

(۱۵) ایضاً ص۴۵

(۱۶) یادرفتگاں ص۳۲۳-۳۲۴

(۱۷) یادایام ص۴۸۔۴۹

(۱۸) ایضاً ص۴۵-۴۶

(۱۹) ایضاً ص۴۷

(۲۰) ایضاً ص۴۸

(۲۱) ایضاً۴۹-۵۰

(۲۲) ایضاً ص۵۳-۵۴

(۲۳) ایضاً ص۷۱

(۲۴) ایضاً ص۷۱-۷۲

(۲۵) ایضاً ص۲۷

(۲۶) ایضاً ص۵۵

(۲۷) ایضاً

(۲۸) ایضاً ص۸۲

(۲۹) ایضاً ص۵۷

(۳۰) ایضاً ص۷۰

(۳۱) ایضاً ص۷۸

(۳۲) ایضاً ص۸۰-۸۲

(۳۳) ایضاً ص۵۹-۶۰

(۳۴) ایضاً ص۶۰-۶۱

(۳۵) ایضاً ص۶۱

(۳۶) ایضاً ص۶۴

(۳۷) ایضاً ص۷۱

(۳۸) ایضاً ص۶۳

(۳۹) ایضاً ص۶۵

(۴۰) ایضاً ص۶۵-۶۶

(۴۱) ایضاً ص۶۷-۶۸

(۴۲) ایضاً ص۶۸-۶۹

(۴۳) ایضاً ص۷۰

(۴۴) ایضاً ص۶۸

(۴۵) ایضاً ص۶۸

(تصویر: مولانا عبدالماجد دریابادی)

[۱۵]

آپ بیتی

• مولانا عبدالماجد دریابادی

[مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنو، طبع دوم، ۱۹۸۹ء]

یہ مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲–۱۹۷۷ء] کی آپ بیتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ۱۹۷۸ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۱۳–۱۹۹۹ء] کے مقدمہ کے ساتھ مکتبہ فردوس لکھنو سے شائع ہوئی۔ راقم کے پیش نظر اس کا طبع دوم ۱۹۸۹ء ہے۔

مولانا دریابادی کی عظیم الشان شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ عالم، مفکر، مفسر، فلسفی اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز تھے۔ بے شمار مقالات ان کے قلم سے نکلے جن کے مجموعے شائع ہوئے وہ متعدد بلند پایہ علمی، ادبی، تاریخی اور سوانحی کتابوں کے مصنف ہیں۔ صحافت کے میدان میں ان کے رسائل سچ، صدق اور صدق جدید تاریخ صحافت میں بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تحریروں کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی علمی زندگی میں علامہ شبلی کو بڑا دخل ہے۔ انہوں نے اپنی اسلامیت اور ادبیت کا سرچشمہ شبلی کی ذات کو قرار دیا ہے اور واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تصنیف پر شبلی کی شخصیت سایہ فگن رہی۔ وہ اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی متعدد کتب، مکاتیب، مقالات، خطبات اور رسائل وغیرہ میں علامہ شبلی کا بڑے والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان کا وہ خطبہ جو انہوں نے دارالمصنّفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر ''شبلی انسان، مصنف، مصنف گر'' کے عنوان سے پیش کیا تھا، شبلی سے ان کی بے پناہ عقیدت کا نمونہ ہے۔ وہ شبلی کو اپنا معنوی استاذ قرار دیتے ہیں۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی

نے اپنے مضمون ''مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ شبلی'' [مشمولہ مولانا عبدالماجد دریابادی خدمات وآثار، دہلی ۲۰۰۶ء] میں دونوں کے باہمی تعلقات، خلوص ومحبت اور فکر ونظر کی ہم آہنگی کے متعدد پہلوؤں پر بڑے خوب صورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی متعدد تحریروں میں علامہ شبلی کا کثرت سے ذکر ہے، ان سے قطع نظر یہاں محض آپ بیتی کے ان مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق شبلی اور جہان شبلی سے ہے۔

[۱]

مولانا عبدالماجد دریابادی علامہ شبلی سے اپنے ابتدائی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سنہ ۶ء تھا یا سنہ ۷ء کہ زیارت پہلے ماہنامہ الندوہ کی ہوئی اور پھر اس کے بعد صاحب الندوہ مولانا شبلی کی۔ اور الندوہ نے دل ودماغ کو اتنا متاثر کیا کہ اور سارے، رسالے جریدے نظر سے گر گئے اور دل وجان سے شبلی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مولانا شبلی کا علم وفضل، اسلوب زبان وطرز بیان سب دماغ پر چھا گئے اور کہنا چاہئے کہ علمی وقلمی زندگی کا ایک نیا دور اسی وقت شروع ہوگیا۔ عملاً اب بھی میدان وہی ''اودھ اخبار'' وغیرہ کا قائم رہا، لیکن نظر کا معیار اب اس سے کہیں بلند ہوگیا تھا۔''(۱)

[۲]

آپ بیتی میں مولانا دریابادی نے جہاں اپنی کالج کی زندگی کا ذکر کیا ہے، وہاں اس زمانہ کے ان بیس اشخاص کے نام اور ان کا مختصر تذکرہ قلم بند کیا ہے جن سے ان کے روابط قائم ہوئے اور ان کی زندگی پر جن کے اثرات مرتب ہوئے، اس فہرست میں علامہ شبلی کا نام سر فہرست ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی کہنا چاہئے کہ میری تحریری وتصنیفی زندگی کی جان مولانا شبلی ہی تھے۔ عقیدت مند اسکول ہی کے زمانے سے ان کی کتابوں اور مضامین

پڑھ چکا تھا۔کالج کے زمانے میں ان کے ہاں حاضری کثرت سے دیتا رہا اور اخیر میں تو ان کے ہاں کے حاضر باشوں میں ہو گیا تھا۔جو علمی و ادبی فیض ان کی صحبت سے حاصل رہا اس کا اب اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔نومبر۱۹۱۴ء میں وفات پائی اور اس سے کوئی ایک سال قبل لکھنو چھوڑ دیا تھا۔'' (۲)

اس زمانہ میں مولانا دریابادی علامہ شبلی سے کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ ان کے اس اعتراف سے لگایا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ملاقات کا عام وقت سہ پہر کا تھا۔ادھر سہ پہر ہوا اور ادھر قدم خود بخود آستانہ شبلی کی طرف اٹھ گئے۔اس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر و مرشد کی تھی۔سیاست ہو یا مذہب، شاعری ہو یا ادب، تاریخ ہو یا فلسفہ، علم و فن کے ہر شعبہ، ہر شاخ میں مرجعیت انہیں کو حاصل۔وہ امام میں مقلد، وہ رہنما میں مسافر، وہ طبیب میں مریض۔'' (۳)

علامہ شبلی کی مجالس علمی و ادبی پر فریفتہ ہونے والوں کی فہرست طویل ہے۔مولانا آزاد کے ذکر میں آ چکا ہے کہ وہ بھی اس کے بڑے دلدادہ تھے اور شبلی سے کسی وقت جدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ان مجالس کا ذکر مولانا ضیاء الحسن علوی کی آپ بیتی میں بھی آ چکا ہے اور انہوں نے علامہ شبلی کو علم کا دیوتا لکھا ہے۔

[۳]

مولانا دریابادی علامہ شبلی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں کے انداز میں مضمون نگاری کرنے لگے۔خود لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں مولانا شبلی کے رنگ اور ان ہی کے تتبع میں محمود غزنوی پر مضمون لکھا جو وکیل امرتسر میں شائع ہوا۔(۴)

[۴]

مولانا عبدالماجد دریابادی کے والد مولوی عبدالقادر نے ۱۶/نومبر ۱۹۱۲ء کو مکہ معظّمہ میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں صحابی رسولؐ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے پائیں دفن ہوئے۔

کئی ماہ بعد مولانا دریابادی نے وفیاتی مضمون لکھا جو ہفتہ وار مشرق گورکھپور میں شائع ہوا۔ مولانا شبلی نے اس کی داد دی، (۵) ہونہار نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور رہبری شبلی کا گویا ایک مشن تھا ۔کبھی مجلس میں داد دیتے اور کبھی خطوط کے ذریعہ حوصلہ بڑھاتے ۔

[۵]

مولانا دریابادی اگرچہ شبلی کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے لیکن وہ کننگ کالج لکھنؤ میں زیرتعلیم تھے ۔فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی کتاب الکلام پر ایک طالب علم کے فرضی نام سے ماہنامہ الناظر لکھنؤ [مارچ، اپریل، جون، اگست، اکتوبر،۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۱ء] میں تنقید لکھی ۔اس کی تفصیل ان ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> ''مولانا شبلی کی علمیت و قابلیت کا سکہ ۱۹۰۶ء و ۱۹۰۷ء میں دل پر بہت گہرا بیٹھا تھا لیکن کالج میں آکر **لاادریت تشکیک ولادینی** کے سیلاب میں وہ زیادہ نہ ٹک سکا۔ الٹی خود انہیں پر تنقید شروع کردی ۔ ۱۹۱۰ء کا زمانہ کہ ان کی کتاب الکلام پر ایک زبردست تنقید سوا سو صفحہ کی ضخامت کی ماہنامہ الناظر کے لئے ''ایک طالب'' کے نام سے لکھی اور اس میں ۶-۷ قسطوں میں نکلی ۔تنقید دراصل اسلامی بنیادی عقائد وجود باری ، رسالت وغیرہ پر تھی ۔صرف آڑ مولانا کے نام کی تھی ۔انداز چوں کہ شبلی ہی کا تھا یعنی بجائے مناظرانہ و مجادلانہ کے علمی وادبی ،اس لئے شہرت بھی بہت ہوئی اور نفس بھی خوب موٹا ہوا۔ الناظر کے ایڈیٹر صاحب خود بڑے دیندار و عبادت گذار تھے، لیکن مولانا شبلی سے سخت ناخوش رہتے، اس لئے ایسے ملحدانہ مضمون کو بھی خوشی خوشی چھاپ دیا۔ رازداری اس مضمون کے لئے خاص طور پر رہی اور لوگ برابر اسی کھوج میں لگے رہے کہ لکھنے والا ہے کون۔'' (۶)

اس مضمون کی اشاعت پر خود علامہ شبلی کا ذہن مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کی طرف منتقل ہوا۔ وہ مہدی افادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''الناظر کا مضمون [مولوی عبدالحق] کا ہے جو کالج کے بی اے اور میرے شاگرد ہیں۔ ان کی مدت سے مجھ پر عنایت ہے، تاہم شاگردی کا اتنا پاس ہے کہ جب کچھ لکھتے ہیں تو نام بدل دیتے ہیں۔ پہلے نقاد تھے، اب طالب علم بن گئے ہیں۔'' (۷)

مگر جلد ہی یہ راز، راز نہ رہا اور علامہ شبلی کو معلوم ہو گیا کہ یہ طالب علم عبدالماجد دریابادی ہیں، تاہم ان کی بزرگانہ شفقت جو انہیں کو حاصل تھی اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ (۸)

[۶]

۱۹۱۰ء میں کننگ کالج لکھنؤ سے بی.اے کرنے کے بعد مولانا دریابادی ایم.اے او کالج علی گڑھ گئے اور وہاں سے ایم اے کیا۔ آخری سال میں علامہ شبلی علی گڑھ آئے اور اپنے بھتیجے اقبال احمد جو بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ کے پہلے مسلمان چیف جسٹس ہوئے، کے یہاں ٹھہرے۔ مولانا دریابادی نے لکھا ہے کہ قدرۃً سلام کے لئے حاضر ہوا۔ (۹)

[۷]

علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تصنیف کا کام شروع کیا جس میں مستشرقین کے اعتراضات کا سدباب بھی شامل تھا چنانچہ ان کی کتابوں کے قابل نقد مواد کی معلومات حاصل کرنے کے لئے چند لوگوں سے ان حصوں کے ترجمے کرائے۔ انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی اس کام سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس کا ایک مقصد ان کی اعانت بھی تھا۔ مولانا دریابادی رقمطراز ہیں:

'' ۱۲ء میں مولانا شبلی سیرۃ النبی کا کام بڑی کاوش و اہتمام سے کر رہے تھے۔ شاید میری بے شغلی پر نظر کر کے انگریزی معلومات کے لئے مجھے اپنے اسٹاف میں لے لیا۔ بعض کتابوں کے نام ان ہی نے بتائے۔ بعض میں نے تجویز کئے۔ پچاس روپئے کا ماہوار معاوضہ طے پایا اور ان کی تاکید رہتی تھی کہ ''لائبریریوں میں آنا جانا لکھنا لکھانا سب ملا کر دو گھنٹہ روز سے زیادہ وقت نہ صرف کیا کرو۔'' سنہ ۱۲ء کے پچاس روپئے آج کے تین سو بلکہ

ساڑھے تین سو کے مساوی تھے۔ گھر بیٹھے اتنی بڑی رقم اس وقت ایک نعمت معلوم ہوئی۔......... یہ سیرۃ النبی کے لئے موادفراہم کرنا ظاہر ہے کوئی تصنیفی کام نہ تھا، لیکن اس کی طرف ایک اہم اقدام ضرور تھا اور مولانا شبلی کے سے اہل قلم کا فیض صحبت بجائے خود ایک نعمت تھا۔''(۱۰)

سیرت نبوی علامہ شبلی کے قلم سے ہو، علماء کا ایک طبقہ اس کے خلاف تھا اور وہ تاک میں تھا کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو اعتراضات کی بوچھار کر دی جائے۔ چنانچہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی سیرت نبوی کی تالیف میں علامہ شبلی کی اعانت کر رہے ہیں تو اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور مولانا دریابادی کا یہ عارضی تعلق جو علامہ شبلی نے ان کی دستگیری کے خیال سے قائم کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ مولانا دریابادی نے اس کی تفصیل بھی آپ بیتی میں لکھی ہے:

''مولانا شبلی نے عارضی دستگیری کی سیرۃ النبیؐ کے اسٹاف میں انگریزی ماخذوں سے موادفراہم کرنے کے لئے ڈیڑھ دو گھنٹہ روزانہ کام پر پچاس روپیہ ماہوار پر رکھ لیا۔ کام سے وہ بہت خوش تھے کہ کسی مولوی صاحب نے علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کو لکھ بھیجا کہ مولوی شبلی تو ایک ملحد کی اعانت سے کتاب تیار کر رہے ہیں۔ میرا الحاد اس وقت کھلا ہوا تھا اور اس پر وہ تعلق بھی ختم ہو گیا۔''(۱۱)

[۸]

مولانا دریابادی جس الحاد میں فلسفہ کے زیر اثر مبتلا ہوئے تھے، اس سے شبلی ہی کے فیض صحبت نے خاص طور پر سیرۃ النبی کے مطالعہ نے باہر نکالا، اس کی داستان خود ان ہی سے سنئے، لکھتے ہیں:

''اس دور کی ابھی ابتداء ہی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی جلد اول پریس سے باہر آ گئی۔ کتاب شبلی کے قلم سے تھی۔ موضوع کچھ بھی سہی، کیسے نہ

اس کوشوق کے ہاتھوں کھولتا اور اشتیاق کی آنکھوں سے پڑھتا، کھولی اور جب تک اول سے آخر تک پڑھ نہ لی دم نہ لیا۔ دل کا اصلی چور تو یہیں تھا اور نفس شوم کو سب سے بڑی ٹھوکر جو لگی تھی وہ اسی سیرت اقدس ہی کے متعلق تو تھی۔ مستشرقین و محققین فرنگ کے حملوں کا اصل ہدف تو ذات رسالت ہی تھی، خصوصاً غزوات محاربات، ظالموں نے بھی تو طرح طرح سے دل میں بٹھا دیا تھا کہ ذات مبارک نعوذ باللہ بالکل ایک ظالم فاتح کی تھی۔ شبلی نے [اللہ ان کی تربت ٹھنڈی رکھے] اصل دوا اسی درد کی کی۔ مرہم اسی زخم پر رکھا اور کتاب جب بند کی تو چشم تصور کے سامنے رسول عربی کی تصویر ایک بڑے مصلح ملک و قوم اور ایک رحم دل و فیاض حاکم کی تھی۔ جس کو اگر جدال وقتال سے کام لینا پڑا تھا تو پھر بالکل آخر درجہ میں، ہر طرح سے مجبور ہوکر، یہ مرتبہ یقیناً آج ہر مسلمان کو رسول و نبی کے درجہ سے کہیں فروتر نظر آئے گا اور شبلی کی کوئی قدر و قیمت نظر میں نہ آئے گی، لیکن اس کا حال ذرا اس کے دل سے پوچھئے جس کے دل میں نعوذ باللہ بغض وعناد اس ذات اقدس کی طرف سے جما ہوا تھا۔ شبلی کی کتاب کا یہ احسان میں کبھی بھولنے والا نہیں۔'' (۱۲)

[۹]

مولانا دریابادی نے تصنیف وتالیف کا ہنر نہ کسی سے سیکھا اور نہ کوئی ان کا استاد ہے، نہ کسی سے شاگردی اختیار کی اور نہ کسی سے اصلاح لی۔ (۱۳) مگر وہ علامہ شبلی کو اپنا استاذ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر کسی کے لئے لفظ استاذ کا اطلاق کرسکتا ہوں تو وہ بلا شک وشبہہ مولانا شبلی تھے۔ ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں۔ لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اتارتا رہا ہوں۔ ان کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں۔ اللہ انہیں کروٹ

کروٹ جنت نصیب کرے۔حسن ترتیب، صفائی بیان، ان کا حصہ تھا۔اب بھی میرا مشورہ مبتدیوں کے لئے یہی ہے کہ علمی وسنجیدہ مضمون نگاری اگر سلیس انداز میں سیکھنا ہےتو مولا نا ہی کی کتابوں سے سیکھئے۔'' (۱۴)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''علمی وتصنیفی دنیا میں محسن اول مولا ناشبلی ہیں۔لکھنا پڑھنا جو کچھ بھی آیا کہنا چاہئے کہ انہیں کی ذات سے آیا۔ پہلے ان کی تحریریں پڑھ پڑھ کر اور پھر ان کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ لیا اور بہت کچھ سیکھا۔ان کے قلم سے بھی، ان کی زبان سے بھی۔ تصنیفی زندگی میں اگر کسی کو استاد کہہ سکتا ہوں تو انہیں مرحوم کو۔'' (۱۵)

[۱۰]

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے تصنیفی ذوق کو تو شبلی کا مرہون منت بتاتے ہی ہیں۔ ادبی وشعری ذوق کو بھی ان ہی کی دین قرار دیتے ہیں۔ان کی نظر میں علامہ شبلی کی شعرفہمی کا ذوق بہت بلند تھا۔وہ لکھتے ہیں:

''ذہن کو پہلے تو کلام اکبر نے اپنی طرف ملتفت کیا، پھر سال ڈیڑھ سال بعد رسائی مولا ناشبلی کی مجلس میں ہوگئی اور حاضری اس دربار میں پابندی سے ہونے لگی۔اس صحبت نے بڑا کام کیا۔مولا نا کے اور کمالات جو تھے وہ تو تھے ہی میری نظر میں شاید ان کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعر کے مبصر اعلی درجہ کے تھے۔ میں یہ کیا کرتا کہ جو شعر ادھر ادھر سے کان میں پڑ جاتا، اسے کسی طرح مولانا کو ضرور سنا دیتا۔انہوں نے اگر اسے پسند فرمالیا تو بس مجھے سند ہاتھ آ جاتی اور اگر انہوں نے داد نہ دی تو وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا۔غرض جس طرح نثر نویسی میں میں نے مولانا کے مقالوں اور کتابوں سے جی بھر کر استفادہ کیا، اسی طرح سخن فہمی میں تھوڑی بہت جو تمیز حاصل ہوئی

وہ مصنف شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر کی حاشیہ نشینی سے ۔مولانا کی عادت کبھی اس موضوع پر طویل گفتگو کی نہ تھی ۔کوئی شعر پڑھ کر بس اس کی مختصر سی تشریح کر دیتے اور یہی بالکل کافی ہو جاتی ۔سارا مغز ان چند لفظوں کے اندر آجاتا۔''(۱٦)

[۱۱]

علامہ شبلی کے اردو شعر و ادب کے ساتھ فارسی شاعری کے بھی مولانا دریابادی گرویدہ تھے، یہی نہیں ان کے تلامذہ علامہ حمیدالدین فراہی اور اقبال کے فارسی کلام کے بھی مداح تھے۔ لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے فارسی گویوں میں غالب، شبلی ، اقبال ، حمید فراہی ، خواجہ عزیز،عزیز صفی پوری کا گرویدہ ہوں۔''(۱۷)

[۱۲]

علامہ شبلی سے گہرے تعلق کی وجہ سے ان کے احباب و متعلقین سے بھی مولانا دریابادی کی شناسائی ہوگئی تھی ۔ایک مرتبہ انہوں نے دور طالب علمی میں امتحان دینے کے لئے الہٰ آباد کا سفر کیا تو علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی محمد اسحاق ایڈوکیٹ ہائی کورٹ کے مہمان ہوئے ۔(۱۸)اسی طرح ان کے ماموں زاد بھائی اور ترجمان القرآن علامہ حمیدالدین فراہی سے بھی گہرا تعلق تھا۔ نہ صرف ان کی فارسی شاعری بلکہ ان کے زہد و ورع اور قرآن مجید پر گہری نظر کے معترف تھے۔ آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ان [شبلی] کے ایک خالہ زاد بھائی مولانا حمیدالدین فراہی تھے،علم و فکر کے دریا، تقویٰ اور حسن عمل کے پیکر ، عربی ادب کے فاضل ، متبحر اور قرآنیات کے نکتہ شناس ،اوقات نماز کی پابندی کا اس شدت سے اہتمام میں نے اپنی زندگی میں دو ہی شخصوں میں پایا، ایک یہی مولانا فراہی دوسرے میر اکبرالہ آبادی۔''(۱۹)

مولانا دریابادی سے سہو ہوا، مولانا فراہی علامہ شبلی کے خالہ زاد بھائی نہیں ماموں زاد بھائی تھے۔

۱۹۳۶ء میں جب علامہ شبلی اور مولانا فراہی کی تکفیر کا فتویٰ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے دستخط سے جاری ہوا تو مولانا دریابادی ہی نے حکیم الامت کو شبلی و فراہی کے عقائد و خیالات سے باخبر کر کے انہیں رجوع کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب حکیم الامت نقوش و تاثرات میں موجود ہے۔

[۱۳]

سید میر جان نے لکھنؤ سے ہفتہ وار مسلم گزٹ علامہ شبلی سے اس شرط پر جاری کیا تھا کہ وہ اس کی سرپرستی فرمائیں گے۔ چنانچہ علامہ نے کچھ دنوں تک اس کی سرپرستی کی۔ (۲۰) بعد میں علامہ شبلی کی ایما سے اس کے ایڈیٹر وحیدالدین سلیم مقرر ہو گئے تھے۔

مولانا دریابادی کو علامہ شبلی سے تاحیات عقیدت قائم رہی۔ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے انتقال کیا اور ان کی آخری یادگار دارالمصنّفین کے کاموں کا آغاز ہوا تو مولانا دریابادی اس کے تاسیسی رکن قرار پائے۔ مولانا حمیدالدین فراہی کی وفات [۱۹۳۰ء] کے بعد ان کی جگہ مجلس عاملہ کے صدر منتخب ہوئے، جس پر وہ تاحیات متمکن رہے۔ وہ بڑی پابندی سے دارالمصنّفین کے اجلاسوں میں شریک ہوتے، مفید مشورے دیتے۔ علامہ سلیمان ندوی عمر میں بڑے ہونے کے باوجود ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے سفر حجاز کے زمانہ میں ماہنامہ معارف کی ادارت کے فرائض مولانا دریابادی ہی نے انجام دیئے تھے۔

دارالمصنّفین نے ان کی کئی کتابیں حکیم الامت نقوش و تاثرات، برکلے، سفر حجاز، محمد علی کی ذاتی ڈائری، وغیرہ شائع کیں۔ دارالمصنّفین کی تاریخ میں بھی ان کا بڑا بلند مقام ہے اور یہ سب ان کی شبلی سے عقیدت ہی کی بنا پر تھا۔

حوالے

(۱) آپ بیتی ص۲۱۱-۲۱۲
(۲) آپ بیتی ص۱۳۶-۱۳۷
(۳) انشائے ماجدی ص۲۸۳
(۴) آپ بیتی ص۲۱۲
(۵) ایضاً ص۳۹-۴۰
(۶) آپ بیتی ص۲۱۳-۲۱۴
(۷) مکاتیب شبلی ج۲ص۱۹۳
(۸) انشائے ماجدی ص۲۸۳
(۹) آپ بیتی ص۱۴۸
(۱۰) آپ بیتی ص۲۷۶-۲۷۷
(۱۱) آپ بیتی ص۳۱۱
(۱۲) آپ بیتی ص۲۴۸
(۱۳) ایضاً ص۳۰۷
(۱۴) آپ بیتی ص۲۰۸
(۱۵) ایضاً ص۳۵۷
(۱۶) آپ بیتی ص۳۲۰
(۱۷) ایضاً ص۳۲۵
(۱۸) ایضاً ص۱۴۹
(۱۹) آپ بیتی ص۳۵۷
(۲۰) ایضاً ص۲۶۱

(تصویر: رشید احمد صدیقی)

[۱۶]

آشفتہ بیانی میری

• رشید احمد صدیقی

[مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی، طبع سوم ۱۹۷۷ء]

رشید احمد صدیقی [۱۸۹۴-۱۹۷۷ء] کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، وہ اردو کے نامور ادیب وانشا پرداز تھے۔ طنز ومزاح نگاری میں یگانہ عصر تھے۔ طنزیات ومزحکات، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، مضامین رشید ان کے بڑے ادبی وتخلیقی کارنامے ہیں۔

وہ علی گڑھ کے ممتاز اور نامور فرزند تھے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ علی گڑھ ہی میں استاد و صدر شعبہ اور پھر اسی خاک کا پیوند ہوئے۔ انہیں علی گڑھ بہت عزیز تھا بلکہ اس کے ذکر کے بغیر وہ لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ ''آشفتہ بیانی میری'' ان کی علی گڑھ کی آپ بیتی ہے۔ اس میں انہوں نے علی گڑھ کی ایسی خوب صورت مصوری کی ہے کہ اس سے بہتر اب تک نہ کی جا سکی حالانکہ علی گڑھ کی حشر سامانیوں پر متعدد ادباء وشعرا نے قلم اٹھایا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ علی گڑھ نہ صرف اس کے فرزندوں کا بلکہ تمام مسلمانوں کا دل ہے۔ اور رشید احمد صدیقی اس کی دھڑکن۔ آشفتہ بیانی میں علی گڑھ سے ان کا عشق پورے شباب پر ہے۔

''آشفتہ بیانی میری'' پہلی بار علی گڑھ سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ البتہ ۱۹۷۷ء میں تیسرا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ ۲۰۱۲ء میں مکتبہ جامعہ نے ایک اور ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے نامعلوم ایڈیشن ہندوپاک سے شائع ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے بڑی مقبولیت پائی۔

علی گڑھ سے جن کی نسبت رہی ہے ان کے نہاں خانہ دل میں سرسید کے ساتھ حالی وشبلی کی بھی محبت جا گزیں ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ میں نے شبلی کو نہیں دیکھا مگر ان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا ان سے ملا ہوں، میں ان سے دور طالب علمی میں متاثر ہوا۔(۱)

رشید احمد صدیقی جون پور ضلع کے رہنے والے تھے، جس کی سرحد اعظم گڑھ سے لگی ہوئی ہے۔ ان کے بھائی نیاز احمد صدیقی علامہ شبلی کے قائم کردہ شبلی کالج میں استاد تھے۔ مزید برآں وہ جب علی گڑھ پہونچے تو ان کی ملاقات اقبال سہیل سے ہوئی جو ان کے ہم درس اور علامہ شبلی کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ شبلی کی ادبی وشعری روایتیں ان کے حصہ میں زیادہ آئی تھیں۔ خود رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ علی گڑھ میں سہیل صاحب کی وہی حیثیت تھی جو کبھی حالی وشبلی کی تھی۔ (۲) وہ شاعری میں علامہ شبلی کا نام بڑے ادب واحترام سے لیتے تھے۔(۳) جب شعر وادب کا وہ تذکرہ کرتے تو فارسی شعراء کے ساتھ جہاں تہاں سے علامہ شبلی کے مماثل اشعار سناتے جاتے۔(۴) گویا رشید احمد صدیقی کو تصانیف شبلی کے علاوہ اقبال سہیل کی صحبت نے بھی شبلی کی فکر ونظر سے آشنا کیا۔

رشید صاحب دور طالب علمی میں اگر سہیل صاحب کے قریب رہے تو دور استادی میں جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ جن کی ہر بزم، بزم شبلی ہی تھی۔ معارف کے سلیمان نمبر میں رشید صاحب نے سید صاحب پر گنج گراں مایہ کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے اس سے دونوں کے گہرے تعلقات اور ذہنی وفکری رشتوں کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

''آشفتہ بیانی میری'' میں علامہ شبلی کا ذکر متعدد مقامات پر ضمناً آیا ہے اور ایک جگہ سرسید کے رفقاء کے ذیل میں مستقل طور پر ان کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

[ا]

رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ علامہ شبلی خداداد ذہانت کے مالک اور بڑی عظمت و

جامعیت کے حامل تھے، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کو ذہانت اور شعریت کا بہرہ وافر قدرت سے ودیعت ہوا تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام سے بے کراں شغف تھا۔ سلف کے کارناموں کو مایہ افتخار جانتے تھے اور مسلمانوں کی عالم گیر زبوں حالی سے آتش بجاں رہتے۔ اس عہد میں حالی اور شبلی کی شاعری، تنقیدی نگاری اور سیرت نویسی نے جس قدر اونچا درجہ جتنا جلد حاصل کر لیا وہ حیرت انگیز ہے۔ دونوں کو اردو و فارسی اور عربی پر عبور تھا اور ان زبانوں کے مزاج اور مقام سے باخبر تھے۔''(۵)

[۲]

شبلی کے ذکر میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا نے مذہبی ہونے اور انگریزی سے ناواقف ہونے کے باوجود علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی اور تہذیبی و سیاسی مقتضیات کی رہنمائی کی اور مسلمانوں کی صلاحیتوں کی تنظیم کی اور اس طرح کی کہ وہ وطن میں امن وآبرو اور وقعت کی نظر سے دیکھے جائیں۔(۶)

[۳]

رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ بغداد میں عباسیوں کے عہد میں اور ہندوستان میں مغلوں کے عہد میں جو حالات پیدا ہوئے، اور پھر انگریزوں کے دور میں اسلام اور مسلمانوں کے سامنے جو چیلنج تھے، ان کے مقابلہ کے لئے علما سامنے آئے اور ان کے الفاظ میں ''علی گڑھ نے یہ فریضہ سرسید، شبلی اور چراغ علی کے وسیلے سے ادا کیا۔''(۷) یہی وجہ ہے کہ ''سرسید، شبلی، چراغ علی معتقدات کو معقولات کی روشنی میں پیش کرنے میں بڑے کوشاں تھے۔''(۸)

[۴]

دوسرے بہت سے اہل علم کی طرح رشید احمد صدیقی نے بھی بعض مقامات پر حالی و شبلی کا موازنہ کیا ہے۔ ایک غیر ضروری موازنہ ملاحظہ ہو:

''شبلی اور حالی کی سیرت نویسی اور تنقید نگاری میں ایک بات خاص طور

پر محسوس ہوتی ہے، وہ یہ کہ شبلی نے سیرت کے لئے اسلام کے ناموران سلف اور تنقید کے لئے فارسی شاعری کا انتخاب کیا، ان دونوں کا اعتبار و احترام ہمارے دلوں میں پہلے سے جاگزیں تھا۔ دوسری طرف حالی نے سعدی سے قطع نظر غالب اور سرسید کو اپنایا جو اپنے عہد میں بدنام نہ تھے تو نیک نام بھی نہ تھے۔''(۹)

شبلی نے جن اسلاف کا انتخاب کیا اور جس میں سرسید کی حمایت بھی انہیں حاصل تھی، ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا، بلاشبہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے اسلاف سے بے پناہ محبت کا جذبہ تھا، مگر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز حکمراں اور مشنری نئی نسل کو مسلسل یہ ذہن نشین کرا رہے تھے کہ تمہارے اسلاف علم دشمن، علوم وفنون اور حکمرانی سے ناواقف تھے۔ اسی مشنری حملہ کے جواب میں علامہ شبلی کو اسلاف کے پرعظمت واقعات لکھنے پڑے۔ بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ۱۸۸۵ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں سرسید کی موجودگی میں جب علامہ شبلی اپنا مقالہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پیش کر رہے تھے سامعین میں سے لوگ اٹھ اٹھ کر دریافت کرتے تھے کہ مولانا کیا ہمارا ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں۔''(۱۰) انہی حالات میں شبلی نے اپنے اسلاف کے پرعظمت کارناموں کو قلم بند کیا اور حالی نے حیات سعدی سپرد قلم کی تھی جس سے رشید احمد صدیقی نے قطع نظر کر لیا ہے۔

یادگار غالب اور حیات جاوید بلاشبہ بڑی اہم کاوشیں ہیں اور ایک صدی گذرنے کے بعد بھی ان کی افادیت کم نہیں ہوئی مگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ایک شاگردی کا اور دوسرا ارادت مندی کا نتیجہ ہے۔ حیات جاوید کو شبلی نے کتاب المناقب کہہ دیا تو ہمارے نقادوں نے شبلی کو علی گڑھ تحریک ہی کا مخالف قرار دے دیا۔ فارسی ادب پر شبلی نے شعرالعجم لکھی جس کو بقول رشید احمد صدیقی اعتبار واحترام حاصل تھا، اس کی غیر اعتباری قائم کرنے کا سلسلہ پانچ برس تک جاری رہا اور اسی کی بدولت حافظ محمود شیرانی تحقیق کے باوا آدم قرار پائے۔ بہرحال رشید احمد صدیقی کا موازنہ درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

[۵]

رشید احمد صدیقی نے حالی وشبلی ہی کے بت نہیں ٹکرائے ہیں بلکہ شبلی وسید سلیمان ندوی یعنی استاذ وشاگرد کا بھی موازنہ کیا ہے اور ایک سے زاید مقامات پر کیا ہے، لیکن یہ موازنہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ انہوں نے جانشین شبلی کو شبلی سے زیادہ حالی کے قریب تر بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سید سلیمان ندوی جو شبلی کے سب سے معتبر شاگرد اور جانشین کہے جاتے ہیں، تاریخی مسائل کی تحقیق وتوضیح میں جذبات سے سروکار نہیں رکھتے تھے۔ استاد کا لہجہ شاعرانہ اور خطیبانہ تھا، شاگرد کا متوازن اور مفکرانہ۔ سوچنے اور لکھنے کے اعتبار سے سید سلیمان ندوی شبلی کے بجائے حالی سے زیادہ قریب تر ہیں۔''(۱۱)

ایک دوسرے مقالہ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن ان کی تصانیف پڑھی ہیں جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا ان سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا اس سے تھوڑا بہت آشنا ہوں۔ علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، ان کی شاعری، ان کی نثر، ان کے خطوط سب میں ''حسن طبیعت'' اور ''سوز دروں'' کی جیسی دلآویز مثالین ملتی ہیں اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے یا لے سکتے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے۔''(۱۲)

استاذ وشاگرد دونوں کا موازنہ اور دونوں کی کمیاں دکھانا دراصل رشید احمد صدیقی کے عہد کے علی گڑھ کا تقاضا تھا، شبلی نے سرسید کے سیاسی اور مذہبی نظریات سے انحراف واختلاف کر کے اور سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اس انحراف واختلاف کی تشریح کر کے گویا جرم کیا

تھا جس کی مخالفت سر سید اور علی گڑھ کے چند نام نہاد ہمدردوں نے اپنا فرض خیال کر لیا تھا۔ تاہم رشید صاحب بالغ نظر نقاد بھی تھے، انہوں نے شبلی کی عظمت کے بیان کرنے میں دانستہ کمی نہیں کی۔

[۶]

رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ علی گڑھ تحریک میں شبلی سے زیادہ جمالیات کا رمز آشنا کوئی نہیں تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''سر سید کے ساتھیوں میں شبلی سے زیادہ جمالیات کا رمز آشنا دوسرا نہ تھا۔ یہ رنگ ان کے خطوط اور غزلوں میں بالخصوص اور دوسری اصناف انشا پردازی میں بالعموم ملتا ہے۔ ان کی نثر و نظم میں وہ رامش و رنگینی ہے جسے عجم کا لمس کہہ سکتے ہیں۔ شبلی طبعاً شاعر تھے۔ یہ رنگ ان کی تحریر و تقریر سب میں جھلکتا ہے۔'' (۱۳)

[۷]

رشید صاحب کا خیال ہے کہ اردو شاعری کو سیاسی نظمیں شبلی نے دیں اور غزل میں سیاسی طنز کے نشتر ان کے شاگرد اقبال سہیل کا عطیہ ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سیاسی طنز کا رچا ہوا رنگ جو شبلی و سہیل کا حصہ تھا، حسرت موہانی اسے دیر تک نباہ نہ سکے۔ (۱۴)

[۸]

رفقائے سر سید نے علی گڑھ تحریک کو پروان چڑھایا اور اسے فکر و نظر اور شعر و ادب کے حوالہ سے بہت کچھ دیا، رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ اردو شاعری کو شعریت و شرافت کی فضا، معیار و موضوع کی اہمیت اور فکر و فن کے آداب حالی و شبلی نے عطا کئے، اور علی گڑھ میں کم و بیش یہ روایت آج بھی باقی ہے۔ (۱۵)

[۹]

عالم اسلام کے حالات سے ہندی مسلمانوں کے باخبر کرنے میں شبلی کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے سفر نامہ روم و مصر و شام اور چند مضامین کے علاوہ شہر آشوب اسلام اور دوسری نظمیں لکھ

کر مسلمانوں میں عالم اسلام کے تئیں ایک اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے بھی ان کے اس جذبے کا ذکر کیا ہے اور شہر آشوب اسلام کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ عالم اسلام کے حالات، مشہد مقدس پر روسیوں کی گولہ باری، طرابلس اور بلقان کے معرکے، قسطنطنیہ پر قبضہ اور ترکی میں ہندوستانی افواج کی سرگرمیوں نے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک ہیجان برپا کر دیا۔ اور اس ہیجان میں شبلی اور ان کے تلامذہ محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شعلہ نوائیوں کو بھی بڑا دخل ہے۔(۱۶)

''آشفتہ بیانی میری'' میں رشید صاحب نے عظمت شبلی کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے مورخانہ شعور اور ان کی شاعری کے حسن اور ان کے ذوق جمالیات کی داد دی ہے مگر ان کے بیان میں کسی قسم کی انفرادیت دکھائی نہیں دیتی اور شبلی سے ان کا لگاؤ ذرا کم کم ہی محسوس ہوتا ہے۔

حوالے

(۱) معارف سلیمان نمبر ص ۱۱۳
(۲) آشفتہ بیانی میری ص ۱۴۱
(۳) ایضاً ص ۷۶
(۴) ایضاً ص ۷۶
(۵) ایضاً ص ۲۰۵
(۶) ایضاً ص ۲۰۵-۲۰۶
(۷) ایضاً ص ۱۰۶
(۸) ایضاً

(۹) ایضاً ص۱۰۶-۱۰۷

(۱۰) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر ص۱۵

(۱۱) آشفتہ بیانی میری ص۲۰۷

(۱۲) معارف سلیمان نمبر ص۱۱۳

(۱۳) ایضاً ص۱۰۷

(۱۴) ایضاً ص۸۰

(۱۵) ایضاً ص۲۱۲

(۱۶) ایضاً ص۳۱-۳۲، طبع اول

(تصویر: مرزا احسان احمد)

[۱۷]

میں اور میری ادبی صلاحیت

• مرزا احسان احمد

[مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء]

مرزا احسان احمد [۹۶، ۱۸۹۵-۱۹۷۲ء] اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ ان کے والد مولوی مرزا محمد سلیم [م: ۱ اکتوبر ۱۹۲۳ء] بھی داد سخن دیتے تھے۔ وطن اعظم گڑھ کا ایک گاؤں مسلم پٹی تھا۔ ابتدائی اردو و فارسی کی تعلیم گھر پر قاضی عبدالرحمٰن حیرت سے حاصل کی۔ پھر علامہ شبلی کے قائم کردہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ سے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کا رخ کیا اور ایم اے او کالج سے بی اے، اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ تحصیل علم کے بعد ۱۹۱۸ء میں اعظم گڑھ واپس آئے اور پھر پوری زندگی وکالت کرتے رہے۔

مرزا احسان احمد کا ادبی شعور بڑا پختہ تھا، انہوں نے نظم ونثر دونوں سے شغف رکھا اور ایک بڑا قیمتی ادبی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کے بے شمار مضامین ومقالات ملک کے مؤقر علمی وادبی رسائل میں شائع ہوئے، جن کا محض ایک مجموعہ ''مقالات احسان'' ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح ان کے کلام کے دو مجموعے پیام کیف [۱۹۴۰ء] اور پیام زندگی [۱۹۸۶ء] شائع ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر انہوں نے ایک طویل مرثیہ کہا تھا جو ۱۹۳۴ء میں ''سر رشک اخلاص'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ان ادبی کارناموں کے علاوہ ان کا ایک بڑا ادبی کارنامہ جگر مرادآبادی [۱۸۹۰-۱۹۶۰ء] کا ادبی دنیا سے متعارف کرانا بھی ہے۔ ان کے کلام کا پہلا انتخاب ''داغ جگر'' مرزا صاحب ہی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ جگر ہی نہیں اصغر کا

مجموعہ کلام ''نشاط روح'' بھی پہلی بار انہیں کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔ مگر یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ آج جگر و اصغر سے ساری دنیا واقف ہے لیکن مرزا احسان احمد کی ادبی کاوشوں سے شاید ہی کوئی واقف ہو۔

مرزا احسان احمد نے علامہ شبلی کو دیکھا تھا، ان کے رشتہ دار بھی تھے، ان کے والد مولوی مرزا محمد سلیم علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے، اس طرح علامہ شبلی اور ان کے خانوادے سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ وہ علامہ شبلی کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے۔ ان کی تصنیفات اور ان کے افکار و خیالات کا انہوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اسی مطالعے کی بنیاد پر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

''یہ وہ ذات گرامی ہے جو جامعیت کمالات کے لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لئے سرمایہ فخر و ناز تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت نے علامہ مرحوم کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا، جس میں گونا گوں صلاحیتیں پنہاں تھے۔ ان صلاحیتوں سے علم و فن کی جو گراں قدر اور مہتم بالشان خدمات انجام دیں ہیں ان کے اعتراف میں کسی صاحب نظر کو تامل نہیں ہوسکا اور نہ ان کی کوئی مثال موجودہ دور کے ارباب فن کے علمی کارناموں میں نظر آسکتی ہے۔''(۱)

مرزا صاحب نے علامہ شبلی سے متعلق دو طویل مقالات لکھے ہیں:

۱۔ علامہ شبلی بحیثیت فارسی شاعر کے [۶۶صفحات]

۲۔ علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد [۳۲صفحات]

یہ مقالات ان کے مطالعے کی وسعت، تحقیق و تدقیق اور نقد و بحث کے لحاظ سے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ علامہ شبلی بحیثیت محقق و نقاد دراصل ڈاکٹر ابن فرید کی فرمائش پر ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کا آغاز انہوں نے ان الفاظ سے کیا ہے:

''ایک کامل الفن مصنف کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط تحقیق و

تنقید کی صلاحیت ہے۔اس لحاظ سے موجودہ دور کے مصنفین میں علامہ مرحوم کو جو امتیازی درجہ حاصل تھا اس سے حق وانصاف کی زبان منکر نہیں ہوسکتی۔ اس کی بہترین شہادت ان کی علمی وادبی تصانیف ہیں جن سے اندازہ ہوتا کہ قدرت نے ان کو کتنا جدت آفریں دماغ، کتنی نکتہ رس نگاہ اور کتنا سلاست رو و پرزور قلم عطا کیا تھا۔''(۲)

علامہ شبلی کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''علامہ مرحوم کا مذاق سخن بالکل فطری تھا۔اس میں تصنع وتکلف کا قطعاً شائبہ نہ تھا۔ وہ شاعری اس لئے نہیں کرتے تھے کہ کوئی مستقل دیوان مرتب کریں۔قدرت نے ان کو اس سے بلندتر کاموں کے لئے پیدا کیا تھا۔لیکن چونکہ فطرتاً شدیدالاحساس تھے اور طبیعت میں شاعرانہ رنگینی اور لطافت موجود تھی، اس لئے جب کوئی موثر واقعہ یا منظر سامنے آتا تو بےاختیار ان کا قلم گہر باری کرنے لگتا تھا۔''(۳)

یہ دونوں مقالات 'مقالات احسان' میں شامل ہیں۔

مرزا صاحب نے انتقال سے ایک سال پہلے ۱۹۷۱ء میں اپنی کتاب ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' شائع کی۔ اس میں انہوں نے اپنی علمی و ادبی زندگی کے آغاز سے اس کتاب کی اشاعت تک جن اہل علم، شعرا اور ارباب کمال سے ان کے روابط رہے اور جنہوں نے ان کے شعر وادب کی داد دی، ان کی تحریروں کو سلسلہ وار مرتب کیا ہے۔اس میں ان کی ادبی حیثیت کا بھی ذکر ہے اور شاعرانہ کمالات کا بھی۔تنقیدی مضامین کی تحسین وستائش بھی ہے اور ان کے اسلوب نگارش کی انفرادیت کا تذکرہ بھی اور ان کی کتابوں پیام کیف اور مقالات احسان پر شکریہ ومبارک باد بھی۔غرض ان سے مرزا صاحب کی ادبی سرگرمیوں کا ایک مرقع سامنے آجاتا ہے۔

میں اور میری ادبی صلاحیت میں کئی طرح کی تحریریں شامل ہیں، ان کے مقالات کی اشاعت پر جو نوٹ لکھے گئے یا ان کی کتابوں پر جو تبصرے ہوئے یا جو دیباچے لکھے گئے ان سب

کے اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، اور اہل علم و ادب کے داد و تحسین کے جو خطوط مرزا صاحب کے نام آئے وہ بھی درج کیے گئے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا اپنے عہد کی ادبی دنیا کے ایک بڑے حلقے میں اثر تھا۔ ان کے چند مداحوں کے نام یہ ہیں:

مولانا سید سلیمان ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا تاجور نجیب آبادی، میاں بشیر احمد، سر شیخ عبدالقادر، رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی، ابن فرید، سر تیج بہادر سپرو، ایم اسلم، اشرف صبوحی، ڈاکٹر ذاکر حسین، دیا نرائن نگم، مسعود اختر جمال، سید احتشام حسین وغیرہ۔

میں اور میری ادبی صلاحیت دراصل مرزا احسان احمد کی ادبی سرگذشت ہے اور ابتداء سے آخر تک کی ان کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر اس میں آ گیا ہے، علامہ شبلی کا کئی مقامات پر تذکرہ آیا ہے۔ اور مرزا صاحب کے علاوہ بعض دوسرے اہل قلم نے بھی کیا ہے۔ ایک جگہ مرزا احسان احمد نے لکھا ہے:

> ''اس سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں ہو سکتی اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ میرے ناچیز قلم کو نثر نگاری کا جو کچھ سلیقہ ہات آیا ہے وہ سب علامہ شبلی ہی کے عدیم المثال طرز انشا کے مطالعہ اور تتبع کا غائبانہ فیض ہے۔''(۴)

مرزا صاحب نے علامہ شبلی کے طرز تحریر کا شعوری طور پر تتبع کیا ہے اور ان کی تمام تحریروں میں وہی ایک رنگ ہر جگہ قائم ہے۔ رشید احمد صدیقی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] نے بھی اس کی داد دی ہے، ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے لکھنے اور دلائل پیش کرنے کا انداز مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا سہیل اور آپ پر ختم ہو گیا۔''(۵)

مرزا صاحب نے اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلیٰ ترین نمونہ علامہ شبلی کے طرز تحریر کو قرار دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''میں نے اپنے مضامین میں اسی طرز انشا کی تقلید کی ہے اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔''(۶)

شبلی کے طرزِ تحریر کا سب سے کامیاب متبع مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] کو قرار دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنی کتاب یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی میں یہی بات لکھی ہے، لیکن اب میرا خیال ہے کہ سب سے کامیاب متبع مولانا عبدالسلام ندوی نہیں مرزا احسان احمد تھے۔

حوالے

(۱) مقالات احسان ص۱

(۲) ایضاً ص۶۷

(۳) ایضاً ص۱-۲

(۴) میں اور میری ادبی صلاحیت ص۱۰۴

(۵) ایضاً ص۱۰۴

(۶) پیام کیف ص۶

(تصویر: ظفر حسن ایبک)

[۱۸]

خاطرات

• ظفرحسن ایبک
[سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۰ء]

خاطرات ظفرحسن ایبک[۱۸۹۵-۱۹۸۹ء] کی آپ بیتی ہے۔ یہ اولاً تین حصوں میں علی الترتیب ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۷ء ۱۹۷۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کا محقق ایڈیشن ہے جو ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا ہے۔ استانبول یونیورسٹی شعبہ ادبیات کے سابق استاذ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار[۱۹۲۴-۲۰۰۷ء] نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس ایڈیشن کی خوبی یہ ہے کہ اسے صاحب خودنوشت ظفرحسن ایبک کے تعاون سے مرتب کیا گیا ہے۔ مرتب کا پیش لفظ معلومات افزا ہے۔ کتاب پریس میں تھی کہ ظفرحسن ایبک نے ۵رجنوری ۱۹۸۹ء کو استانبول میں انتقال کیا اور وہ اس محقق ایڈیشن کے دیدار سے محروم رہے۔

ظفرحسن ایبک کرنال کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ وہ جس زمانہ میں بی اے کے طالب علم تھے، چند طلبہ نے قرآن پاک پر حلف لے کر آزادی کی جدوجہد کو زندگی کا اولین مقصد قرار دیا تھا، ان طلبہ میں ایک ظفرحسن ایبک بھی تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے تعلیم نامکمل چھوڑ کر آزادی وطن کے لئے جدوجہد شروع کی۔ اس کے نتیجے میں انہیں افغانستان، روس اور ترکی میں جلاوطنی کی زندگی گذارنی پڑی اور بڑی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کے قائد مولانا عبیداللہ سندھی[۱۸۷۲-۱۹۴۴ء] تھے۔ جن کے مولانا شبلی سے بھی مراسم تھے۔ علامہ شبلی کی کتاب سیرۃ النبیؐ پر جب علما کے ایک طبقہ کی طرف سے

اعتراضات کی لے بہت تیز ہوگئی تو علامہ شبلی نے مولانا محمود حسن کو حکم تسلیم کرتے ہوئے مسودہ سیرت انہیں مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ ان کے پاس بھیجا تھا کہ وہ دیکھ لیں اور اطمینان کرلیں، مگران کے حواریوں نے سیرۃ النبیؐ کو سرے سے دیکھنے ہی سے باز رکھا۔(۱)

ظفر حسن ایبک نے زندگی کا بیشتر حصہ ترکی میں گذارا اور پھر اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔ترکی کے زمانہ قیام میں انہوں نے ترک اسکالر اور مترجم محمد عمر رضا دوغرل بک کے مشورہ سے اردو کی چند مشہور کتابوں کے ترجمہ کا منصوبہ بنایا۔جس میں سرفہرست علامہ شبلی کی تصانیف الفاروق اور سیرۃ النبی تھیں۔خاطرات میں ان دونوں کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ کسی اور کتاب کے ترجمہ کا ذکر نہیں ہے اور نہ علامہ شبلی کا کہیں ذکر ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ظفر حسن ایبک شبلی اور تصانیف شبلی اور ان کی اہمیت سے کیونکر واقف ہوئے اور انہوں نے الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کو ترجمہ کے لئے کیونکر منتخب کیا؟ قیاس ہے کہ وہ اپنے استاذ مولانا عبید اللہ سندھی کے ذریعہ ان کی اہمیت سے واقف ہوئے ہوں گے یا پھر وہ جس زمانہ میں افغانستان میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے نادر شاہ سے ان کے گہرے مراسم ہو گئے تھے، اسی زمانہ میں نادر شاہ کی ہمشیرہ نے الفاروق کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، شاید وہاں سے تحریک ملی ہو، بہرحال ظفر حسن ایبک کا خیال تھا کہ ان ترجموں سے مالی حالت بھی بہتر ہوگی اور علمی حیثیت سے ترکی زبان میں اچھی کتابوں کا اضافہ ہوگا۔ چونکہ اس وقت ظفر حسن ایبک ترکی زبان سے نا آشنا تھے، اس لئے یہ طے پایا کہ وہ ان کتابوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کردیں اور عمر رضا دوغرل بک انہیں انگریزی سے ترکی جامہ پہنائیں۔ چنانچہ ظفر حسن ایبک نے سب سے پہلے الفاروق کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔خاطرات میں اس کی تفصیل انہوں نے اس طرح پیش کی ہے:

> ”میں نے عمر رضا دوغرل بک سے مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف کا ترجمہ کرکے ترکی میں چھپوانے کے امکانات پر گفتگو کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ میں ان کتابوں کا ترجمہ اردو سے انگریزی میں کروں اور عمر رضا دوغرل بک اس انگریزی مسودے کا ترکی میں ترجمہ کریں۔[میں اس زمانہ میں ترکی نہ جانتا

تھا] اور یہ ترکی ترجمہ کتب خانہ آثار علمیہ کی طرف سے استانبول میں چھاپا جائے، اس سے میرے گذارے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

میں نے بھائی صاحب کو کرنال لکھ کران سے الفاروق اور سیرۃ النبی کی چاروں جلدیں، عبداللہ منہاس مرحوم کی تصنیف کردہ پیام امین جیسی مذہبی کتابیں بھیجنے کی درخواست کی۔ کتابیں آنے پر میں نے سب سے پہلے الفاروق کا انگریزی ترجمہ کیا۔ عمر رضا دوغرل بک نے اس ترجمہ سے کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کو ۱۰/ مارچ ۱۹۲۷ء کو چھپنے کے لئے کتب خانہ آثار علمیہ کو دیدیا۔ یہ کتاب ترکی میں ''حضرت عمرؓ'' کے عنوان سے چھپی اور بہت مقبول عام ہوئی۔ میں نے اس ترجمے کے معاوضے میں پیسہ لینا نہ چاہا اور ترکی میں اپنی سب سے پہلی علمی کوشش کو کتب خانہ آثار علمیہ کو بطور ہدیہ پیش کر دیا۔ اس کتاب کے فروخت سے کتب خانہ کے مالک اشرف ادیب بک کو یقین ہو گیا کہ ایسے ترجموں سے اس کو کافی نفع ہوگا۔'' (۲)

الفاروق کا ترکی ترجمہ کتب خانہ دارالمصنّفین میں محفوظ ہے۔ جب یہ دارالمصنّفین پہونچا تو سید صاحب نے معارف میں اس کا ذکر کیا اور لکھا کہ:

''اردو کتابوں میں سے مولانا شبلی مرحوم کی مشہور آفاق کتاب الفاروق کا ترجمہ حضرت عمر کے نام سے ترکی میں ابھی شائع ہوا ہے۔ ظفر حسن صاحب نے پہلے اس کا اردو سے انگریزی میں اور عمر رضا بے نے اس انگریزی ترجمہ سے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا جو ۵۱۴ صفحوں میں متوسط تقطیع پر ٹائپ میں چھپا ہے۔ یہ اچھا کیا کہ اصل کتاب کے حوالے بھی حاشیہ میں باقی رکھے ہیں، آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے مختصر حالات اس تعلق سے دئے گئے ہیں کہ الفاروق میں شاہ صاحبؒ کا بارہا حوالہ آتا ہے۔ دوسرے ضمیمہ میں خود مصنف یعنی مولانا شبلی مرحوم کے مختصر سوانح

درج ہیں جن میں دارالمصنّفین کا بھی ذکر آ گیا ہے۔‘‘(۳)

ظفرحسن ایبک نے الفاروق کے بعد سیرۃ النبی کے ترجمے کا آغاز کیا، جس میں انہیں ایک سال سے زاید کا عرصہ لگا۔ اس کے لئے انہوں نے بعض صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ اس کی تفصیل انہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

’’اس کے بعد سیرۃ النبی کی تین جلدوں کا ترجمہ کرنے میں مجھے تقریباً ایک سال لگا، جس سے مجھے اتنی آمدنی ہوتی رہی کہ نہ صرف میں اپنا گذارہ کر سکا بلکہ بعض ہندوستانی مسلمان غریب مہاجروں کی بھی مدد کرتا رہا۔

سیرۃ النبی کی تین جلدوں کا ترکی ترجمہ ’’عصر سعادت‘‘ کے نام سے چار جلدوں کی صورت میں یکم دسمبر ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ ترکی میں اس کتاب کو سب علماء نے بہت ہی پسند کیا اور اس کے متعلق اخبارات میں بہت سے مقالے لکھے۔ یہ ساری کتابیں پرانے ترکی حرفوں (عربی حرفوں) میں چھپی تھیں۔ صرف ’’عصر سعادت‘‘ سیرۃ النبی کی آخری جلد پرانے ترکی حرفوں (یعنی عربی رسم الخط) میں چھپوانے میں ذرا مشکلات پیش آئیں، کیونکہ اس زمانے میں ترکی میں عربی حرفوں کی بجائے رومن حروف کے استعمال کے بارے میں قانون بن گیا تھا اور نومبر ۱۹۲۸ء کے مہینے کے بعد کوئی کتاب یا اخبار عربی حرفوں میں نہ چھپ سکتا تھا۔‘‘(۴)

ظفرحسن ایبک نے لکھا ہے کہ ترکی کے نئے قانون کے مطابق یہ ترجمہ نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ انہوں نے ترک شہریت حاصل کر کے وہاں کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

’’میں ترکی رعایا بننے کے بعد یکم اگست ۱۹۲۸ء کو فوج میں داخل ہو گیا تھا اور چھاؤنی یعنی فوجی بارک میں رہنے لگا تھا، جہاں اس قسم کا ترجمہ وغیرہ کرنا ناممکن تھا، اس لئے میں مختلف بہانے سے باہر جا کر ایک دوست کے گھر

میں کتاب کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ خدا خدا کر کے میں نے یہ ترجمہ ستمبر کے آخر تک ختم کیا اور عمر رضا دوغرل بک نے ترکی ترجمہ اکتوبر میں پورا کیا اور کتاب کا آخری حصہ نومبر کے شروع میں پریس میں دیدیا گیا جس سے کتاب بروقت مقررہ عربی حرفوں میں چھپ کر تیار ہوگئی۔''(۵)

الفاروق اور سیرۃ النبی کے ترکی ترجمہ کی یہ داستان ظفرحسن ایبک کی آپ بیتی ''خاطرات'' کے علاوہ کہیں دستیاب نہیں۔ البتہ عمر رضا دوغرل بک کے ترجمے کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں محفوظ ہیں۔ عمر رضا دوغرل بک کے ترکی ترجمے راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ دیباچے میں اس کی صراحت موجود ہے کہ اسے ظفرحسن ایبک نے پہلے انگریزی میں ترجمہ کیا پھر اسی کو ترکی قالب میں ڈھالا گیا۔ افسوس کہ ظفرحسن ایبک نے خاطرات میں اپنے انگریزی ترجموں کے محفوظ ہونے یا نہ ہونے کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ ترجمے بھی اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ الفاروق کے جو انگریزی ترجمے مولانا ظفر علی خاں اور شیخ محمد سلیم کے قلم سے شائع ہوئے ہیں، وہ سب ظفرحسن ایبک کے ترجمہ کے بعد کے ہیں۔ اسی طرح سیرۃ النبی کے انگریزی تراجم بھی ظفرحسن ایبک کے بعد کے ہیں۔ ان تراجم کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ممکن ہے وہ استانبول کے کسی کتب خانے میں محفوظ ہوں، جہاں ظفرحسن ایبک نے اپنی زندگی گذاری یا پھر عمر رضا دوغرل بک کے ذاتی اثاثہ میں محفوظ ہوں۔ ترک اسکالر بالخصوص یوسف قراچا اگر اس کی طرف توجہ دیں تو شاید وہ کہیں دستیاب ہوجائیں، جو بلا شبہ ذخیرہ شبلیات میں گراں قدر اضافہ ہوں گے۔

علامہ شبلی کو ترکوں سے بے پناہ تعلق تھا اور یہ تعلق ان کے عہد شباب ہی میں پیدا ہوگیا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مطالعہ ومشاہدہ کے لئے مصر وشام کے ساتھ ترکی کا بھی انتخاب کیا تھا۔ وہ ترکی میں تقریباً تین ماہ مقیم رہے، نہ صرف کتب خانوں اور تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا بلکہ وہاں کی مختلف شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں، ترکوں نے بھی اپنی محبت کا ثبوت دیا، غازی عثمان پاشا جیسے بااثر شخص نے دست بوسی کی، خلیفہ وقت نے تمغہ مجیدیہ سے سرفراز کیا۔ اس کی تفصیل

سفر نامہ روم ومصر وشام میں موجود ہے۔

ظفر حسن ایبک اور محمد رضا دوغرل بک کی کاوشیں شبلی کے سفر کے ۳۵ ؍سال بعد منظر عام پر آئیں۔ تصانیف شبلی کے ترکی تراجم اور ان کے متعدد ایڈیشن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کئی برس تک قائم رہا، اور اس نے بڑی مقبولیت پائی۔ ایک ترک فاضل سید محمد توفیق بے ۱۹۲۸ء میں ہندوستان آئے تو انہوں نے سید صاحب کو خط لکھا کہ ترکی میں سیرۃ النبیؐ کے ترجمہ نے بڑی دلچسپی پیدا کر دی اور لوگ اس کو ذوق وشوق سے پڑھ رہے ہیں۔(۶)

۱۹۳۲ء میں نواب فخر یار جنگ بہادر حیدر آباد دکن کی سیاحت کے لئے ترکی گئے، واپسی پر انہوں نے سید صاحب کو خط کے ذریعہ یہ مژدہ سنایا کہ:

''میں کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا اور باوجود اس کے کہ جن لوگوں کے ہاتھ زمام حکومت ہے وہ اس سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی جو سیرۃ النبیؐ مبارک کی بڑی مداح ہے اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہو چکا ہے وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے، لیکن بروصا میں جو شاہان عثمانیہ کی فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سال کے دارالحکومت رہا ہے بہت احباب کو سیرۃ النبیؐ کا دلچسپی سے ذکر کرتے سنا۔ خدا آپ کے مساعی جمیلہ کو بار آور کرے۔''(۷)

اس خط پر سید صاحب نے اپنی قلبی مسرت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے دارالمصنّفین کے اس نیک عمل کو یہ عزت بخشی کہ اس کے ذریعہ سے ترکی میں جس کے متعلق ہر روز خدا جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا فیض پہونچایا۔''(۸)

ہمارے عہد میں بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ ترک اسکالر اور مصنف ومترجم یوسف قراچا نے

علامہ شبلی کی تین کتابوں سفر نامہ روم ومصر وشام، الغزالی اور سیرۃ النبیؐ کی دونوں جلدوں کو ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمے استانبول سے علی الترتیب ۲۰۰۲ء، ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئے ہیں۔ ترجمہ سفر نامہ روم ومصر وشام کا نیا ایڈیشن حال ہی میں بیس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا اور ختم ہوگیا اور اب نئے ایڈیشن کی تیاری ہے۔ اس وقت ترکوں کو اپنے شاندار ماضی اور عظمت رفتہ کی بازیافت کی جو للک پیدا ہوئی ہے اس کی تسکین کا سفر نامہ میں کافی سامان موجود ہے۔ امید ہے ترکی کے نئے حالات میں تصانیف شبلی کے تراجم کی اہمیت میں اضافہ ہوگا۔ ۱۷/۱۸ برس سے یوسف قراچا نے ترکی میں شبلی شناسی کا جو سلسلہ قائم کر رکھا ہے وہ قابل تحسین وستائش ہے۔ ہم ان کی درازی عمر کی دعا کرتے ہیں۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص ۶۵۹

(۲) خاطرات ص ۳۱۷-۳۱۸

(۳) شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۱۲۷

(۴) خاطرات ص ۳۲۵-۳۲۶

(۵) ایضاً ص ۳۲۶

(۶) شذرات سلیمانی حصہ دوم ص ۲۲۴

(۷) شذرات سلیمانی حصہ سوم ص ۱

(۸) ایضاً ص ۱-۲

(تصویر: مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

[۱۹]

غبار کارواں

• مولانا سعید احمد اکبرآبادی

[ماہنامہ آج کل دہلی، مارچ، ۱۹۷۱ء]

ماہنامہ آج کل دہلی نے غبار کارواں کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا، جس میں اہل قلم اپنے حالات وسوانح قلم بند کرتے تھے۔ چنانچہ متعدد اہل قلم نے اپنے علمی و تعلیمی اور ادبی حالات و کوائف لکھے۔ اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی [۱۹۰۸ - ۱۹۸۵ء] نے بھی اپنے احوال قلم بند کئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ مکمل خودنوشت نہیں، بلکہ زندگی کا ایک اجمالی مرقع ہے۔ تاہم اختصار کے باوجود اس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے بنیادی احوال و کوائف آ گئے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نومبر ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر مدرسہ امدادیہ مرادآباد میں داخل ہوئے۔ متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند گئے اور ۱۹۲۸ء میں فراغت حاصل کی۔ یہاں انہیں دارالعلوم کے اکابر شیوخ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ انہیں اپنے اساتذہ میں علامہ انور شاہ کشمیری سے خصوصی شغف رہا۔

دیوبند کے بعد اگرچہ انہوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا تاہم تحصیل علم کا سلسلہ بھی جاری رہا اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے عربی و انگریزی میں ایم اے کیا۔ اس طرح وہ جدید وقدیم دونوں علوم سے بہرہ ور ہوئے۔

تحصیل علم کے بعد وہ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں استاد مقرر ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان نے یہیں ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے بعد وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش پر مدرسہ عالیہ کلکتہ سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی نے انہیں شعبہ سنی دینیات میں ریڈر مقرر کیا، چنانچہ کلکتہ کو خیر باد کہہ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آ گئے۔ یہیں سے ۱۹۷۲ء میں رٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے کالی کٹ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی اور شیخ الہند اکیڈمی میں خدمات انجام دیں۔ ۲۴ رمئی ۱۹۸۵ء کو کراچی میں وفات پائی، جہاں وہ اپنی بیٹی سے ملنے گئے تھے۔ مشہور مورخ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ کے صدر پروفیسر محمد اسلم ان کے داماد تھے۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ ان کا شمار اردو کے ممتاز ادیب اور نامور اہل قلم میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے پچاسوں اہم اور تحقیقی مضامین و مقالات اور ایک درجن سے زاید بلند پایہ کتابیں نکلیں۔ ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں:

فہم قرآن [۱۹۴۱ء]، غلامان اسلام [۱۹۴۰ء]، صدیق اکبر [۱۹۵۷ء]، عثمان ذوالنورین، اسلام میں غلامی کی حقیقت، خطبات اقبال پر ایک نظر [۱۹۸۳ء]، چار مقالات [۱۹۶۷ء] مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال، وحی الٰہی، اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، وغیرہ۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا ایک اور بڑا کارنامہ ندوۃ المصنّفین دہلی کے قیام میں تعاون اور ماہنامہ برہان کا اجراء اور ادارت ہے، جس سے وہ دم واپسیں تک وابستہ رہے اور علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ برہان کے حوالہ سے علمی صحافت کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے درج ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کی علمی صحافت کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔

انہیں علامہ شبلی سے ابتدا ہی سے بڑی عقیدت تھی اور یہ عقیدت کسی نسبت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان کے علم و فضل اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا ہوئی تھی۔ دور طالب علمی میں

اپنے مطالعہ وکتب بینی کے ذکر میں وہ لکھتے ہیں:

''اسی زمانہ میں میں نے اردو ادب کا مطالعہ کیا تو اردو کے عناصر خمسہ میں سے کوئی نہیں تھا جس کی اکثر و بیشتر کتابیں میں نے نہ پڑھی ہوں۔ ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اور سیر کوہ سار، عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول، راشد الخیری کے مختصر افسانے، خواجہ حسن نظامی کے تخیلی مضامین اور نیاز فتح پوری کے انشایئے اور شہاب کی سرگذشت، یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن سب سے زیادہ طبیعت جس شخصیت سے متاثر ہوئی، وہ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہے۔ میں نے مولانا کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھی ہیں، لیکن الفاروق اور شعر العجم دو ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے طبیعت پر عمیق اور دوررس اثرات پیدا کئے۔''(۱)

الفاروق اور شعر العجم کی اہمیت، عظمت اور انفرادیت کا اعتراف متعدد اہل قلم نے کیا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی ان کے بڑے مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''الفاروق تحقیق کا شاہ کار تو ہے ہی، زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ رہی شعر العجم تو اس میں شبلی کا جو اصل کارنامہ ہے اور جس میں میرا خیال ہے کہ ایران میں بھی ابھی تک ان کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوسکا وہ شعر العجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے۔ جن میں فارسی شاعری کا عہد بہ عہد ارتقا اور ہر عہد کی لفظی و معنوی خصوصیات اور ان کی شستہ و رفتہ اور بے ساختہ اور برجستہ زبان میں بحث کی ہے اور اس میں زبان و بلاغت کے وہ عجیب و غریب نازک اور لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ بے ساختہ سطر سطر پر احسنت اور مرحبا کی صدا نکلتی ہے۔''(۲)

علامہ شبلی کی شخصیت ہمہ جہت اور کثیر الاوصاف تھی۔ خاص طور پر تاریخ اور شعر و ادب

میں یگانہ عصر تھے۔ان کے اسلوب نگارش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہماری اسالیب بیان کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی ان کی ان عظمتوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''شبلی تاریخ کا ذوق اور اس کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ساتھ میں منطق اور فلسفہ کے بہت اچھے عالم تھے۔شعروادب کا ذوق فطری تھا۔طبیعت میں جودت وشیفتگی بلا کی تھی۔ان سب چیزوں کے بیک وقت اجتماع نے اردو زبان کے کلاسیکل مصنفین میں شبلی کی شخصیت کو بہت بلند اور نمایاں کر دیا ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ دقیق سے دقیق علمی بحث کو جس قدرت کلام کے ساتھ، دلآویز شگفتہ زبان میں شبلی لکھ سکتے تھے، ان کے جانشین سید سلیمان صاحب ندوی اور تلمیذ خاص عبدالسلام ندوی کو بھی وہ بات نصیب نہیں ہوئی۔''(۳)

عظمت شبلی کا سارا زمانہ معترف ہے۔اس میں ایک مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی شامل ہیں، تاہم مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے بارے میں ان کی رائے قابل لحاظ نہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی، عربوں کی جہاز رانی اور عرب و ہند کے تعلقات میں جس علمی زبان کا استعمال کیا ہے اور جس طرح دقیق علمی مباحث کو سلیس اور شگفتہ انداز میں قلم بند کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔اسی طرح مولانا عبدالسلام ندوی نے حکمائے اسلام اور تاریخ اخلاق اسلامی اور امام رازی وغیرہ کتابوں میں جس شستہ وسلیس زبان میں داد تحقیق وتصنیف دی ہے، اس کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔مولانا عبدالسلام ندوی کے انداز تحقیق وتصنیف کی داد تو مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دی ہے۔

بہر حال مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علامہ شبلی کی تحریروں سے دور طالب میں متاثر ہوئے۔دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے پاس نہ صرف شبلی بلکہ دارالمصنّفین کے اہل قلم کی تصانیف موجود تھیں، یہی نہیں انہوں نے عالم عربی کے مجلّات المقتطف اور الہلال وغیرہ منگائے اور ان کا مطالعہ کیا۔واضح رہے کہ عربی مجلّات ہندوستان میں سب سے پہلے علامہ

شبلی ہی نے ندوے میں منگائے اور معارف کی اشاعت کا جب انہوں نے خاکہ تیار کیا تو خاص طور پر عربی مجلّات منگانے اور ان کے علمی مشمولات معارف میں نقل کرنے کا خیال پیش کیا۔ غرض مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا شبلی سے عشق کسی زمانہ میں کم نہیں ہوا۔ اپنے احباب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی [۱۹۰۱ - ۱۹۸۴ء] اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی [۱۹۰۱ - ۱۹۶۲ء] کے ساتھ تصنیف و تالیف اور کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تو ان کے پیش نظر دارالمصنّفین ہی کا خاکہ تھا، چنانچہ انہوں نے اس کا نام بھی ندوۃ المصنّفین رکھا۔ دارالمصنّفین کے سابق ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ:

> ''ان کی زبانی بارہا یہ سنا ہے کہ وہ شروع ہی سے مولانا شبلی کی تصانیف اور دارالمصنّفین کی تصانیف سے متاثر رہے ہیں۔ دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے پاس ان کتابوں کو دیکھ کر وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو تعجب ہوتا تھا اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی ذات اور ان کی تحریروں پر دبستان شبلی کا بڑا اثر رہا جس کا کھلا ہوا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا اور اس کی تاسیس میں ان کی بھی شرکت ہوئی تو دارالمصنّفین ہی کی تقلید میں اس کا نام ندوۃ المصنّفین رکھا گیا ہے۔'' (۴)

اسی طرح ندوۃ المصنّفین کا ترجمان ماہنامہ برہان جاری کیا تو اس کے مشمولات میں اور معارف کے مشمولات میں بظاہر کوئی فرق نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ بعض اہل علم نے برہان کو معارف کا ہم پلہ قرار دیا۔ افسوس برہان چند سال ہوئے مرحوم ہوگیا۔ اور بحمداللہ معارف کو نکلتے ایک صدی گذر گئی مگر وہ اب تک اپنے اسی معیار پر جاری ہے جس کا خواب علامہ شبلی نے دیکھا تھا اور جس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے جاری کیا تھا۔ اللہ اچھا رکھے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور مولانا عمیر الصدیق ندوی کو جو علم و ادب سے بے اعتنائی کے اس دور میں اس بارگراں کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

۱۰-۱۱رفروری ۱۹۴۵ءکو پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ''مشاہیر اسلام'' کے تحت یوم شبلی کا انعقاد کیا۔اس میں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد اقبال، مولانا طفیل احمد منگلوری، مسٹر محمد علی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے، شمس العلما مولانا تاجور نجیب آبادی نے علامہ شبلی کے فضل وکمال پر تقریر کی۔اس تاریخی تقریب میں شرکت کے لئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی دہلی سے لاہور تشریف لے گئے اور ۱۰رفروری ۱۹۴۵ءکو پہلے اجلاس میں اپنا مقالہ ''مولانا شبلی مفکر اسلام کی حیثیت سے'' پیش کیا، جسے بڑی دلچسپی سے سنا گیا۔یہ مقالہ تلاش بسیار کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہوسکا۔غالباً شائع نہیں ہوا۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی جب شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے اور انہیں تحقیقی مقالات برائے پی.ایچ.ڈی لکھوانے کی اجازت ملی تو وہ طلبہ سے اولاً علامہ شبلی ہی کی تصانیف کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے۔انہوں نے غبار کارواں میں لکھا ہے کہ:

> ''میرے شعبہ میں کوئی طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتا تو اس کو شروع کے دو تین مہینوں میں مولانا شبلی کی خاص خاص کتابیں غور اور توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں تا کہ اسے معلوم ہو سکے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کس طرح اس کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کرکے، ہر ہر چیز پر الگ الگ بحث کی جاتی ہے اور اس کے لئے اسلوب نگارش کس قسم کا ہونا چاہئے۔''(۵)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنی تصانیف میں بھی علامہ شبلی ہی کا طرز اختیار کیا ہے، وہی انداز، وہی اسلوب اور تحقیق وتجزیہ کا وہی طرز۔واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے جو اثرات دور طالب علمی میں ان پر مرتب ہوئے تھے وہ آخر تک باقی رہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب [انور شاہ کشمیری] نے مجھ میں جس علمی وتحقیقی ذوق کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری مولانا شبلی کی کتابوں نے کی۔''(۶)

حوالے

(۱) ماہنامہ آج کل، دہلی، مارچ ۱۹۷۱ء ص ۴

(۲) ایضاً ص ۵

(۳) ایضاً

(۴) معارف جولائی ۱۹۸۵ء، ص ۱۹۸

(۵) غبار کارواں، آج کل دہلی مارچ ۱۹۷۱ء ص ۵

(۶) ایضاً ص ۶

(تصویر: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[۲۰]

کاروان زندگی

• مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ
[مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۱۳ - ۱۹۹۹ء] کی خودنوشت کاروان زندگی سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور آخری حصہ ۱۹۹۹ء میں۔ اس کے طبع دوم میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ کے قلم سے تتمہ شامل ہے، جس میں مولانا مرحوم کی اخیر زندگی کے حالات وواقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔

کاروان زندگی میں مولانا علی میاں کی ۸۸ر سالہ زندگی کے تمام سوانحی، علمی، تعلیمی، تصنیفی اور دعوتی حالات و واقعات آ گئے ہیں۔ انہوں نے بہت مصروف علمی و عملی زندگی گذاری۔ ملک و ملت اور دین و مذہب کی بڑی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اس لئے کاروان زندگی محض ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جگ بیتی بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام اور بعض یوروپی ممالک کے مسلمانوں کی دینی وملی سرگرمیوں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ علاوہ ازیں خود مولانا کی تصنیفات کا ذکر ہے۔ ان کے اسفار کا ذکر ہے۔ ان کے خطبات و مقالات کا ذکر ہے۔ معاصرین کی وفیات اور ان کی خصوصیات کا ذکر ہے۔ ہندوستان کے ساتھ عالمی مسائل و معاملات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض مولانا کے عہد کی گوناگوں سرگرمیوں کی تفصیلات اس میں آ گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک منفرد خودنوشت ہے۔

مولانا علی میاں کا شمار عالم اسلام کے ممتاز علما و ادبا اور مصنفین میں ہوتا ہے۔ وہ ندوہ

کے سابق ناظم اور نزہۃ الخواطر کے مصنف مولانا سید عبدالحی حسنی کے صاحبزادے، ایک دوسرے ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی کے برادر اصغر اور ان کے جانشین تھے۔ وہ ندوہ کے طالب علم، استاذ، معتمد تعلیم اور آخر میں ناظم منتخب ہوئے۔ اس منصب پر وہ دم واپسیں تک فائز رہے۔ معتمد تعلیم کی حیثیت سے وہ علامہ شبلی کے بھی جانشین ہوئے جن کا شمار ندوہ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ علامہ شبلی سے بہت متاثر تھے۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بعض اقوال و اقتباسات اور اشعار درج کئے ہیں۔ تصنیفات اور ان سے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ مولانا کی مجالس کا مجموعہ ''مجالس حسنہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے جس کے مرتب مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کا اٹھارہ مقامات پر ذکر ہے۔ ان کے والد مولانا سید عبدالحی حسنی علامہ شبلی کے معاصر تھے۔ ندوہ کی تعمیر و ترقی میں دونوں نے برسوں ساتھ خون پسینہ بہایا، انہیں نزہۃ الخواطر لکھنے کا مشورہ علامہ شبلی ہی نے دیا تھا۔ (ا) تاہم ندوہ کے بعض معاملات میں دونوں کے درمیان اتفاق رائے نہیں تھا۔ اس کا ذکر بھی مولانا علی میاں نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحی'' میں کیا ہے اور اسی انداز سے کیا ہے جس طرح ایک لائق فرزند کو کرنا چاہئے۔ یہاں اس کی تفصیل مقصود نہیں بلکہ ہمارے مطالعہ کا موضوع کاروان زندگی میں ذکر شبلی کا تعارف و تجزیہ ہے۔

کاروان زندگی کی سات جلدوں میں براہ راست شبلی کا بہت کم ذکر آیا ہے۔ جہاں ذکر آیا ہے ضمناً آیا ہے۔ حالاں کہ مولانا علی میاں نے دیگر محسنین ندوہ کا ذکر زیادہ وضاحت سے کیا ہے، تاہم جو ہے سو ہے۔

[ا]

مولانا علی میاں نے اردو ادب اور بعض مفید کتابوں کے مطالعہ کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ:

> ''رائے بریلی کے قیام میں جو کبھی کبھی طویل ہو جاتا تھا، میرے ہاتھ
> میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آگئی۔ مطبع نامی کان پور کی چھپی ہوئی، سراپا

تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔'' (۲)

[۲]

الفاروق مولانا کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کا اسلوب اس میں سب سے زیادہ اجاگر ہوا ہے اور یہ بڑی مؤثر کتاب ہے۔(۳)

دور طالب علمی ہی میں انہوں نے اردو کے عناصر اربعہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔اس میں مولانا شبلی کی کتابوں کے مطالعہ کا بھی ذکر ہے۔(۴)

[۳]

کاروان زندگی حصہ اول کا ایک عنوان ''دارالعلوم کی فضا اور اپنے بانی اور معماروں سے ناآشنائی'' ہے۔اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ ندوہ میں کوئی دینی ودعوتی فضا موجود نہ تھی بلکہ ان کے الفاظ میں:

> ''ساری فضا پر علمی و ادبی تحریری ذوق سایہ فگن تھا۔ دارالعلوم کے ماحول میں سب سے بڑی مثالی (IDEAL) شخصیت جو قابل اقتداء وتقلید سمجھی جاتی تھی اور جو طلبہ کا منتہائے پرواز وتخیل تھا، وہ مولانا شبلی کی ذات تھی۔ انہیں کو دارالعلوم کا اصل بانی اور معمار سمجھا جاتا تھا۔اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ مولانا شبلی کا ندوہ کے علمی وادبی مزاج کی تشکیل میں بنیادی اور شاید سب سے بڑا حصہ ہے اور ان کا اسلوب تحریر اس وقت تک سنجیدہ اور علمی خیالات کے ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور اس وقت تک زندہ وتابندہ ہے اور بظاہر ابھی عرصہ تک رہے گا۔'' (۵)

مولانا کے مطابق ندوہ کی ایک صورت حال یہ بھی تھی کہ:

> ''ہر ذہین طالب علم [مولانا شبلی کی تقلید میں] مصنف، مورخ، ادیب وناقد بننے ہی کا خواب دیکھتا تھا اور قدیم اداروں، نصاب ونظام اور باہر کی شخصیتوں سے یا تو بے خبر تھا یا ان کے بارے میں کسی قدر حقارت آمیز

> خیالات رکھتا تھا۔ بھائی صاحب [ڈاکٹر سید عبدالعلی] بھی اس صورت حال سے بہت دل گیر تھے اور دینی و روحانی شخصیتوں اور علمائے ربانی سے طلبہ کا ربط قائم کرنا چاہتے تھے، مگر سالہا سال کے اثر کو جس کی جڑیں بڑی گہری تھیں، چند سال میں مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔''(۶)

چوں کہ دارالعلوم میں دینی و دعوتی ماحول نہیں تھا اور طلبہ بقول مولانا علی میاں علامہ شبلی کو دارالعلوم کا اصلی بانی خیال کرتے تھے، اس لئے مولانا مرحوم نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ:

> ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس تاریخی مسلمہ حقیقت کا انکار کیا جائے کہ تحریک ندوۃ العلما مولانا محمد علی مونگیری کا تخیل اور ان کے دل کی آواز تھی۔ وہی اس کے داعی اول اور بانی اصلی ہیں۔ نیز ندوہ کے ذریعہ جو ثقافت وجود میں آئی اور وہ جس کا داعی اور حامل ہے، اس میں مولانا شبلی، مولانا حکیم سید عبدالحی، صدیار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور فخر ندوہ مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی حصہ ہے اور یہ سب اس کے بہترین مظہر اور نمونہ تھے۔''(۷)

مولانا علی میاں کے مذکورہ بالا اقتباسات ذہنوں میں کئی سوال پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً طلبہ میں علامہ شبلی اس قدر کیوں مقبول تھے اور وہ انہیں اپنا آئیڈیل کیوں خیال کرتے تھے؟ جب کہ بقول مولانا علی میاں اصلی بانی مولانا محمد علی مونگیری تھے اور یہ کہ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور دوسرے علماء کی موجودگی میں دینی و دعوتی فضا کیوں قائم نہیں ہوئی اور کیوں طلبہ کا مطمح خیال صرف علامہ شبلی ہو گئے؟ علامہ شبلی تو معتمد تعلیم تھے، کبھی کبھی درس میں شامل ہو جاتے۔ اساتذہ سے ان کے نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس پر گفتگو کرتے، کبھی قرآن پڑھاتے اور کبھی بخاری کا درس دیتے۔ ان باتوں کا طلبہ پر اثر کیوں نہیں ہوا اور ان میں دینی رجحان کیوں نہیں پیدا ہوا؟

دراصل اس وقت ندوہ سے جو افراد وابستہ تھے۔ کوئی شخص علم و فضل میں علامہ شبلی کا مد مقابل نہ تھا۔ پھر طلبہ، اساتذہ بلکہ تمام اشخاص یہ دیکھ رہے تھے کہ ندوہ کا دستور العمل وہ تیار کریں؟

نصاب تعلیم وہ بنائیں اور امراء ورؤسا سے مل کر بڑی بڑی رقمیں وہ لائیں، زمین وہ حاصل کریں، دارالعلوم کا نقشہ وہ بنوائیں، تعمیرات کے لئے جد و جہد وہ کریں۔ طلبہ کے مسائل وہ حل کریں۔ تعلیم و تعلم میں وہ حاضر رہیں۔ ماہنامہ الندوہ وہ نکالیں، فکر ندوہ کی ترجمانی وہ کریں، مخالفین اسلام اور مخالفین ندوہ کے جوابات وہ دیں، تحریک اشاعت اسلام کی قرارداد وہ پیش کریں۔ وقف علی الاولاد کے لئے پورے ہندوستان کے علماء اور قانون دانوں میں حرکت وہ پیدا کریں، شدھی تحریک کے سدباب کے لئے سراپا غیرت وہ بن جائیں، غالباً یہی وجوہ ہیں جن کے سبب نہ صرف طلبہ و اساتذہ بلکہ پورا ہندوستان شبلی و ندوہ کو لازم و ملزوم سمجھتا تھا۔

مولانا علی میاں نے جس عہد میں دینی و دعوتی فضا نہ ہونے کا ذکر کیا ہے اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ شبلی پر؟ یا مولانا علی میاں سے پہلے کے نظمائے ندوہ پر؟ علامہ شبلی کے معتمدی سے مستعفی ہوجانے کے بعد ان کے والد ماجد ناظم ہوئے، درمیان میں نواب سید علی حسن خاں پھر ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک ان کے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم رہے۔ یہ حضرات اتنے دنوں تک نظامت کرنے کے بعد بھی نہ اپنی روحانیت کے اثرات مرتب کرسکے اور نہ دینی و دعوتی فضا قائم کی۔ ۱۹۱۳ء میں جس سال مولانا علی میاں نے دنیا میں آنکھیں کھولیں اسی سال علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہوئے، اس کے تیس سال بعد کا منظرنامہ مولانا پیش کررہے ہیں، اس دوران گویا ندوہ دین کی نہیں علم و ادب کی خدمت کرتا رہا؟ اور ندوہ کے دور شباب میں جو بڑے بڑے اہل علم اور ارباب کمال پیدا ہوئے جس میں سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری ندوی فلسفی بھی شامل ہیں، یہ سب محض ادیب و انشاپرداز تھے؟ جن کے زہد و تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

شبلی کے اثرات اس قدر گہرے تھے کہ اس کا مٹانا بقول مولانا علی میاںؒ آسان نہ تھا۔ اس سے کم از کم یہ واضح ہے کہ ندوہ کی مثالی شخصیت مولانا شبلی کی ذات تھی۔ باوجود اس کے اس دور میں آئیڈیل کی تلاش شروع ہوئی اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ممکنہ آئیڈیل میں علامہ شبلی کا بھی نام شامل ہے۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی جن کا دینی رجحان تیزی کے ساتھ ترقی کررہا تھا اور جن کے تمام علمی کمالات [شبلی کے زیر اثر نہیں] آزادانہ فکر ونظر، وسیع مطالعہ اور قوت تنقید پر ہر حال میں طبعی وخاندانی شرافت غالب تھی اور جنہوں نے ندوہ کے دور اول میں جب مولانا محمد علی اس کی نظامت اور رہنمائی کے مسند پر متمکن تھے، تعلیم حاصل کی تھی۔ اس حقیقت کو محسوس کرنے لگے تھے اور اس نکتہ کی طرف وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ درس گاہ کی شمالی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب ہر ادارہ کی کوئی ایک یا چند معیاری شخصیتیں ہوتی ہیں جو طلبہ اور نوجوانوں کے لئے نمونہ اور اسوہ (IDEAL) کا کام دیتی ہیں اور جن کی تقلید میں فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک آئیڈیل ہیں۔ [غالباً اس موقع پر دوسرے نمبر پر دیوبند کا بھی نام لیا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ وہاں کی کن شخصیتوں کا ذکر کیا] آپ لوگ یہاں دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے بھی آئیڈیل لایئے تاکہ وہ اس کی تقلید کریں۔ یہاں چار شخصیتیں آئیڈیل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا شبلی، آپ کے والد ماجد مولانا سید عبدالحی، نواب سید علی حسن خاں۔ پھر فرمایا، آپ کے والد صاحب ان سب کے کمالات کے جامع اور سب کے نمائندہ تھے۔ وہ روحانیت بھی رکھتے تھے۔ عالم بھی تھے۔ اردو عربی کے ادیب بھی اور بلند پایہ مصنف بھی۔ آپ ان کو طلبہ کے سامنے آئیڈیل کے طور پر پیش کریں۔ ممکن ہے مرور زمانہ سے الفاظ میں ردوبدل ہوگیا ہو، لیکن مفہوم یہی تھا۔''(۸)

مولانا سید سلیمان ندوی علامہ شبلی کے شاگرد رشید اور جانشین ہیں، انہوں نے حیات شبلی میں ندوہ سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور انہیں علامہ شبلی سے جس قدر عقیدت تھی اور جس کا

اظہار وہ آخری سانس تک کرتے رہے، یقین نہیں آتا کہ انہوں نے آئیڈیل کے طور پر اپنے استاذ علامہ شبلی کے سوا کسی اور کا نام پیش کیا ہوگا، مگر چوں کہ مولانا علی میاں نے لکھا ہے جن کا اعتبار ہمارے دل میں سید صاحب ہی کی طرح ہے، اس لئے یقین کرنے کے سوا چارہ بھی نہیں۔

جہاں تک مولانا سید عبدالحی حسنی کا معاملہ ہے بلا شبہ وہ بڑے پایہ کے شخص تھے۔ ان کے علمی وادبی کارنامے بھی آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ ندوہ کے لئے ان کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں، مگر ندوہ کے عہد شباب میں بھی ان کا شمار علامہ شبلی کے بعد ہوتا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کی زندگی ہی میں ماہنامہ الندوہ میں ندوہ کے جلسہ دہلی کی جو روداد لکھی ہے اس میں بھی واضح طور پر لکھا ہے کہ مولانا شبلی کے بعد وہ دوسری شخصیت ہیں جو اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔(۹)

علامہ شبلی کو محض ادیب، نقاد اور صاحب اسلوب قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے اور ان کے بالمقابل اپنے والد مولانا سید عبدالحی حسنی کو جامع کمال قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ ان میں روحانیت تھی اور بلا شبہ روحانیت میں وہ بلند رتبہ تھے مگر علامہ شبلی کی روحانیت بھی کم درجہ کی نہیں تھی، اس کی ایک جھلک حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی کی اس تحریر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’جب دارالعلوم ندوۃ العلما کی نئی عمارت بننی شروع ہوئی اور اس کی دیواریں کچھ بلند ہوگئیں تو علامہ شبلی پر اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور ایک دن تمام طلبہ کو لے کر عمارت کے پاس گئے، جو کمرہ قرآن کے لئے تعمیر ہو رہا تھا وہاں سے مزدوروں کو ہٹا دیا اور طلبہ کے ساتھ اپنے ہاتھ سے کچھ دیر اینٹ، گارا اور چونا ڈھوتے رہے، اس کے بعد طلبہ کو جمع کر کے ایک تقریر کی جس کے آخر میں انہوں نے بڑے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا کی:
>
> ’’اے خدا! یہ چند ناتواں، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری

کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے جاتا ہے جن کے ساتھ ان کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر، سب اس طوفان کی زد میں ہیں۔ اے خدا! ان چند ناتواں بچوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھالیں گے۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جو ان کے چہرہ پر نہیں کھلتا تو ہی ہے جس سے ان کی آبرو رہ جائے۔'' (۱۰)

غالباً یہی وجہ تھی کہ طلبہ علامہ شبلی کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے تھے۔

[۴]

کاروان زندگی حصہ سوم میں رابطہ ادب اسلامی کے جلسہ ندوۃ العلما جو جنوری ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوا تھا کی اجمالی روداد قلم بند کی گئی ہے۔ اس میں مولانا علی میاں نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس میں مولانا حالی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور بعض دوسرے ادبا و شعراء کے ساتھ علامہ شبلی کا بھی تذکرہ ہے۔ (۱۱)

[۵]

مولانا علی میاں نے ہندوستان کے ایسے علمی و تحقیقی کاموں کا ذکر کیا ہے جن کی مثال بقول ان کے یورپ و امریکہ میں ملنی مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''اسی طرح علامہ شبلی کی شعر العجم کی [حافظ محمود خاں شیرانی کی تنقید کے باوجود] مثال نہ ایران کے ادب میں ملتی ہے، نہ ہندوستان کے ادب میں۔ اسی طرح سے میں کئی کتابوں کے نام لے سکتا ہوں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی، مولانا شبلی کی الجزیہ فی الاسلام، کتب خانہ اسکندریہ اور مولانا سید عبدالحی کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند اور نزہۃ الخواطر اپنے موضوع پر بے مثال کتابیں ہیں۔'' (۱۲)

[۶]

مولانا محمد منظور نعمانی کی کتاب ''ایرانی انقلاب امام خمینی اور شیعیت'' کے ذکر میں

انہوں نے اس بات پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسل اردو کے بلند پایہ لٹریچر سے بیگانہ ہے۔انہوں نے جدید لٹریچر میں الفاروق کو بھی شامل کیا ہے۔(۱۳)

[۷]

کاروان زندگی جلد پنجم [ص۲۳۲] میں مولانا نے اپنے ترکی کے سفر کی تفصیلات لکھی ہیں۔اس میں ترکوں سے ان کے ایک خطاب کا ذکر ہے جس میں مولانا نے خلافت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کی جد وجہد اور ان کے جذبات کا ذکر کیا ہے ۔اس سلسلہ کے دو مشہور اشعار نقل کئے ہیں جس میں ایک شعر علامہ شبلی کا ہے۔جو یہ ہے:

زوال دولت عثماں زوال ملک و ملت ہے
عزیزو ! فکر فرزند و عیال وخانماں کب تک

اسی سفر میں مولانا مرحوم میزبان رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی قبر کی زیارت کو گئے اور فاتحہ خوانی کی۔علامہ شبلی نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کو میزبان عالم کا میزبان لکھا ہے۔مولانا نے اسے بلیغ کلام قرار دیا ہے۔(۱۴)

کاروان زندگی میں نسبتاً علامہ شبلی کا کم ذکر ہے، تاہم ان کی مجالس میں اکثر علامہ کا ذکر رہتا تھا۔مجالس حسنہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، جس کی بنیاد پر ہمارے کرم فرما پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے ایک فاضلانہ مقالہ [مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر مولانا شبلی کے اثرات] لکھا ہے جو کتابچے کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مولانا علی میاں صاحب کی مجالس میں شبلی کا ذکر کثرت سے ہے اور ان کی نگارشات میں بھی شبلی کا تذکرہ موجود ہے۔انسانی نفسیات یہ ہے کہ کوئی شخص جب بار بار کسی شخصیت کا ذکر کرتا ہے اور اس کے ذکر سے رطب اللسان رہتا ہے تو اس شخصیت کی خوبیوں کو بھی غیر شعوری طور پر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔علامہ شبلی ادیب، ناقد، سوانح نگار، شاعر اور انشا پرداز تھے۔ان کی شاعری اور ساحری اور خوبصورت اور دلکش نثر نگاری کا رنگ

مولانا علی میاں کی نثر میں بھی جھلک جایا کرتا تھا۔''(۱۵)

مولانا علی میاں یقینی طور پر علامہ شبلی سے متاثر تھے، اور وہی نہیں ان کے معاصرین میں نہ جانے کتنے ان سے متاثر ہوئے۔ دراصل وہ شبلی کا دور تھا۔ پھر ان کے تلامذہ اور متاثرین مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جدوجہد، اور علمی و عملی کارناموں سے پورا ہندوستان گونج رہا تھا اور ان کے ذریعہ فکر شبلی کا بھی آوازہ بلند تھا۔

پروفیسر محسن عثمانی کے مقالہ میں محض علامہ شبلی کی صہبائے علم وادب کا تذکرہ ہے۔ مولانا علی میاں کی طرح انہوں نے بھی اسلامی علوم وفنون میں شبلی کے عالمانہ مقام اور مجتہدانہ دست گاہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس کے قلم سے الفاروق اور سیرۃ النبی جیسی عظیم الشان کتابیں نکلی ہوں، جس نے اشاعت اسلام کا منصوبہ بنایا ہو، جس نے مستشرقین کا جواب دیا ہو، جس نے وقف علی الاولاد کی مسلسل تحریک چلائی ہو، جس نے نو برس تک ندوہ کو سنبھال رکھا ہو، جس نے ندوہ کا عالم عرب سے رشتہ قائم کیا ہو، جس کی دینی حمیت کا اعتراف مخالف بھی کرتے رہے ہوں اسے محض ادیب، شاعر، نقاد ثابت کرنا اعتراف کمال نہیں، اغماض ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی صاحب کا مقالہ ہمارا موضوع نہیں تاہم ذکر آ گیا ہے تو ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''ندوہ کی خوب صورت لائبریری جو مولانا علی میاں کے عہد نظامت میں تعمیر ہوئی، لائبریری کا نام کسی بھی اہم شخصیت کے نام پر رکھا جا سکتا تھا، لیکن مولانا علی میاں نے لائبریری کا نام مولانا شبلی کے نام پر رکھوایا۔ یہ خلوص دل سے شبلی کی عظمت کا اعتراف ہے۔''(۱۶)

دلوں کا حال اللہ جانتا ہے اور مولانا مرحوم کے اخلاص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تاہم واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کی ندوہ آمد سے پہلے ندوہ کا کتب خانہ بہت معمولی تھا، علامہ شبلی نے اور امور کی طرح اسے بھی ترقی دی اور سب سے پہلے اپنا نہایت قیمتی کتب خانہ جس میں مصر وشام، قسطنطنیہ

اور یورپ کی بہترین مطبوعات اور نوادرات شامل تھے، وقف کیا۔ پھر اپنے احباب و متعلقین کے کتب خانے وقف کرائے جس میں نواب عماد الملک، نواب علی حسن خاں، ان کی بہن صفیہ بیگم، سکندر نواز جنگ، نواب عزیز جنگ، حکیم احمد علی، مولوی شرف الدین، سید مرتضیٰ، مولوی یوسف علی، نواب احمد سعید خاں، وغیرہ کے کتب خانے شامل ہیں۔ کتابوں کے حصول کے لئے سید صاحب کو پٹنہ اور حیدرآباد کے سفر پر بھیجا اور کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ علامہ شبلی جس وقت ندوہ سے مستعفی ہوئے کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد ۱۲۱۰۵/ ہو چکی تھی۔ (۱۷)

یہی وجہ تھی کہ علامہ شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں ندوہ کے اجلاس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کتب خانہ کی ایک عمارت تعمیر کر کے اس کو علامہ شبلی کے نام سے موسوم کیا جائے۔ (۱۸) اسی اجلاس میں مولانا سید عبدالحی حسنی ندوہ کے ناظم منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۵ء کی منظور قرارداد پر بعد کے نظمائے ندوہ نے توجہ نہیں دی۔ بلاشبہ اس قرارداد کو عملی جامہ پہنانا مولانا علی میاں کا شبلی سے غایت تعلق کا ایک نمونہ ہے۔

حوالے

(۱) الندوہ اپریل ۱۹۱۵ء

(۲) کاروان زندگی اول، ص ۹۴

(۳) مواعظ حسنہ ص ۴۵۵

(۴) کاروان زندگی حصہ اول ص ۹۵

(۵) ایضاً ص ۱۵۲-۱۵۳

(۶) ایضاً ص ۱۵۴

(۷) ایضاً ص ۱۵۳

(۸) ایضاً ص ۱۵۳-۱۵۴

(۹) الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۱۰

(۱۰) معارف سلیمان نمبر ص ۲۵۷-۲۵۸

(۱۱) کاروان زندگی ج ۳ ص ۲۱۷

(۱۲) ایضاً ج ۳ ص ۲۳۲

(۱۳) ایضاً ج ۳ ص ۲۵۹

(۱۴) ایضاً ص ۲۳۲-۲۳۳

(۱۵) ایضاً ص ٦

(۱٦) ایضاً ص ۱

(۱۷) حیات شبلی ص ۴۲۹-۴۳۰

(۱۸) تاریخ ندوۃ العلما حصہ دوم ص ۱۱۴

(تصویر: مولانا مجیب اللہ ندوی)

[۲۱]

نقوش زندگی

• مولانا مجیب اللہ ندویؒ
[مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اعظم گڑھ، طبع اول، ۲۰۱۲ء]

یہ حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸- ۲۰۰۶ء] بانی جامعۃ الرشاد اور مدیر الرشاد اعظم گڑھ کی ناتمام خودنوشت ہے۔ میرے ہی مسلسل اصرار پر مولانا مرحوم نے لکھنے کا آغاز کیا۔ اس زمانہ میں ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ ہر قسط پر جھجک جھجک کر یاد دلاتا اور وہ کمال مہربانی سے کہتے اچھا لکھتا ہوں۔ پھر کسی دن فجر بعد اپنی میز پر بیٹھتے اور ایک قسط لکھ کر دے دیتے۔ سات آٹھ قسطیں الرشاد میں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد نہ ان کی ایسی صحت رہی کہ وہ لکھتے اور نہ مجھ میں ہمت کہ تقاضا کرتا۔ ایک روز مرحوم پروفیسر کبیر احمد جائسی [۱۹۳۴-۲۰۱۲ء] اور ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کے کہنے پر ہمت جٹا کر املا کرانے کی بات کہی تو فرمایا چھوڑو جی املا میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ نوک پلک درست نہیں ہوتے اور پھر میں یہ کہنے کی بھی ہمت نہیں جٹا سکا۔ میرے سامنے ہی روز بروز ان کی صحت گرتی گئی اور پھر وہ اسے ناتمام چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ **نور اللّٰہ مرقدہٗ**.

میرا خیال تھا کہ تتمہ لکھ کر اور انہوں نے بعض مضامین میں جہاں اپنے حالات قلم بند کئے ہیں، ان کو شامل کر کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ جدید انداز ترتیب وتدوین کے مطابق شائع کروں گا، مگر ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبداللہ عمار نے ۲۰۱۲ء میں شائع کر دیا۔ جس کی مجھے خبر نہ تھی، یہی اشاعت میرے پیش نظر ہے۔ خدا نے توفیق دی تو اس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی،

تتمہ اوراشاریہ کے ساتھ شائع ہوگا۔

مولانا مرحوم کا اصلی وطن تو غازی پور کا موضع کسمی تھا مگر وہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ گھوسی میں ۴/جنوری ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد شیخ حبیب اللہ [م: جنوری ۱۹۵۱ء] محکمہ پولیس میں ملازم تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم بھی اعظم گڑھ میں ہوئی۔مدرسہ یعقوبیہ جامع مسجد میں حفظ قرآن کا آغاز ہوا، مگر اس کی تکمیل حافظ عبدالعزیزؒ سے موضع اکھنی ضلع کیمور بھبوا بہار میں ہوئی۔[۱۹۳۵-۱۹۳۸ء] تک ابتدائی تعلیم مدرسہ مظہرالعلوم بنارس میں ہوئی، اس کے بعد وہ ندوہ میں داخل ہوئے۔۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک وہاں اعلی تعلیم حاصل کی۔۱۹۴۴ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنّفین بلا کر رفیق مقرر کیا۔اس عہدہ پر مولانا مرحوم ۱۹۶۶ء تک متمکن رہے۔۱۹۶۱ء میں جامعۃ الرشاد کی بنیاد رکھی۔اس وقت کے دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی اور مشورہ دیا گیا کہ وہ دارالمصنّفین کے لئے یکسو ہو جائیں جسے انہوں نے تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ انہیں دارالمصنّفین کو خیر باد کہنا پڑا اور پھر وہ جامعۃ الرشاد کے لئے یکسو ہو گئے اور اسے بڑی ترقی دی اور ایک بڑا ادارہ بنادیا۔مولانا نے ۱۲/مئی ۲۰۰۶ء کو انتقال کیا اور ۱۳/مئی کو مدرسہ کے پیچھے عام قبرستان میں دفن ہوئے۔**انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.**

مولانا مرحوم کا مذاق خالص علمی تھا۔ان کا اگرچہ بنیادی موضوع مطالعہ وتحقیق فقہ تھا لیکن ان کی تصنیفات کے دائرہ میں بڑا تنوع ہے۔ دارالمصنّفین کے زمانہ رفاقت میں ''اہل کتاب صحابہ وتابعین'' اور ''تبع تابعین'' حصہ اول جیسی اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔اسی زمانہ میں انہوں نے چند انتہائی اہم اور منفرد موضوعات پر معارف میں سلسلہ مضامین شروع کیا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ان کی تصنیفات وتالیفات کے نام یہ ہیں:

۱۔اسلامی فقہ [تین جلدیں] ۲۔اہل کتاب صحابہ وتابعین، ۳۔تبع تابعین حصہ اول، ۴۔فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین، ۵۔اجتہاد اور تبدیلی احکام، ۶۔فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل ۷۔اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات، ۸۔اسلامی قانون اجرت، ۹۔عبادت

وخدمت،۱۰۔ دینی مدارس اوران کی ذمہ داریاں،۱۱۔سرمد اوران کی رباعیاں،۱۲۔ثبوت رجم، ۱۳۔جہیز کی شرعی حیثیت،۱۴۔اسوۂ حسنہ،۱۵۔مسئلہ کفالت،۱۶۔خطبۂ نکاح،۱۷۔قرآن پاک کی تعلیم اوراس کی عظمت،۱۸۔نماز اور خشوع،۱۹۔خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ،۲۰۔ذکرو دعا،۲۱۔ایمان وعقیدہ،۲۲۔ریاض الحدیث،۲۳۔اسلامی تعلیم [چار حصے] ۲۴۔انوار محمدی [مرتبہ]،۲۵۔اہل دل کی باتیں وغیرہ۔

مولانا مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ ماہنامہ الرشاد کا اجرااور تادم واپسیں اس کی اشاعت کا اہتمام ہے۔راقم الحروف نے اس کا ۲۲ رسالہ اشاریہ مرتب کیا ہے۔اس سے اس کی گوناگوں خدمات واضح ہوتی ہیں۔حضرۃ الاستاذ کا تذکرہ یہاں شاید طویل ہوگیا اور یہ فطری بھی تھا،ان کے کاموں اور کارناموں کی تفصیل کے لئے راقم کی مرتب کردہ ''کتابیات مجیب'' [مطبوعہ ۲۰۱۴ء] ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

یہاں میرے پیش نظر مولانا مرحوم کی سیرت وشخصیت کی تفصیلات نہیں بلکہ ان کی خود نوشت نقوش زندگی سے ان کی عقیدت شبلی اور شبلی شناسی کے واقعات کا مطالعہ ہے۔

[۱]

مولانا مرحوم چوں کہ اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے،اس لئے شبلی سے ابتدا سے آشنا رہے ہوں گے،مگر جب مدرسہ مظہرالعلوم بنارس میں وہ زیر تعلیم تھے،اپنے استاذ مولانا کوثر ندوی سے ''موازنہ انیس ودبیر'' کی تعریف سن کر اس کا مطالعہ کیا اور اس طرح پڑھا کہ اخیر تک اس کے اقتباسات انہیں یاد تھے۔(۱) اسی طرح سیرۃ النبی کا مشہور اقتباس جو ظہور قدسی کے عنوان سے ہے،اسی دور میں از بر ہوگیا تھا۔(۲)

[۲]

۱۹۳۹ء میں وہ ندوہ پہنچے تو انہیں شبلی ہوسٹل میں جگہ ملی۔سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ندوہ کے درودیوار شبلی ہی کے کارناموں سے پرشور تھے۔اس دور طالب علمی میں سالانہ چھٹیوں میں وہ کسی بڑی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے۔ایک سال کی چھٹیاں انہوں نے شعرالعجم کی پانچوں

جلدوں کے مطالعہ میں گذاریں۔(۳)

[۳]

ماہنامہ الندوہ لکھنو سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔شبلی کے عظیم الشان کارناموں میں ایک الندوہ کا اجرا بھی ہے۔علامہ شبلی کے بعد وہ بند ہو گیا تھا،مولانا مرحوم کے زمانہ طالب علمی میں اسے پھر جاری کیا گیا،مگر یہ اشاعت بھی شعلہ مستعجل ثابت ہوئی۔مولانا مرحوم اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نے ۱۹۰۴ء میں مجلس انتظامیہ میں ندوہ کی طرف سے ایک ماہانہ پرچے کے اجراء کی تجویز رکھی اور وہ پاس بھی ہو گئی،مگر کئی مہینے اس کے اجرا میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ تنگ نظر لوگ کسی قیمت پر الندوہ کا ایڈیٹر علامہ شبلی کو بننے نہیں دینا چاہتے تھے،مگر کسی کے اندر کوئی صلاحیت تو تھی نہیں،اس لئے مجبور ہو کر علامہ شبلی کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو جوڑ دیا گیا۔بہر حال ان کی ادارت میں الندوہ نکلا اور اس نے پورے ہندوستان کے اہل علم میں اپنا سکہ بٹھا لیا۔اس وقت رسالہ مخزن لاہور کے علاوہ اس کا کوئی ہم سر نہیں تھا۔۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کے ندوہ سے بددل ہو کر چلے آنے کے بعد کچھ لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ دن بعد بند ہو گیا۔''(۴)

[۴]

۱۹۴۰ء میں ماہنامہ الندوہ تیسری بار جاری کرنے کی تحریک مولانا محمد عمران خاں ندوی کی طرف سے سید صاحب کی تائید کے ساتھ ہوئی۔مولانا عبدالسلام قدوائی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر بنائے گئے اور انتظامی امور مولانا محمد عمران خاں مہتمم کے حوالہ ہوئے،مگر اس کی زندگی بھی شعلہ مستعجل ثابت ہوئی اور ایک برس بعد بند ہو گیا۔(۵)

[۵]

مولانا مجیب اللہ ندوی نے دور طالب علمی میں جو پہلا مقالہ لکھا وہ ''غزوہ موتہ'' پر تھا۔

مولانا لکھتے ہیں:

''غزوہ موتہ کے سلسلے میں عام مورخین لکھتے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کوشکست ہوئی ،مگر علامہ شبلی نے اپنے ذوق و قیاس کی بنیاد پر لکھا ہے کہ مسلمانوں کوشکست نہیں ہوئی تھی بلکہ لشکر وہاں سے بچ کر نکل آیا تھا۔''(٦)

اب عام مورخین اور علامہ شبلی کے موقف کے مطالعہ میں مولانا مرحوم منہمک ہو گئے اور ایک مفصل مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا'' کیا غزوہ موتہ میں مسلمانوں کوشکست ہوئی تھی؟'' یہ مقالہ بقول مولانا مرحوم برہان یا ندیم گیا میں شائع ہوا۔ (٧) مگر برہان کے اشاریہ سے اس کی اشاعت کی تصدیق نہیں ہوتی ۔اس لئے خیال ہے کہ غالبًا ندیم گیا میں شائع ہوا۔ چوں کہ اب تک ندیم گیا کا اشاریہ مرتب نہیں ہوسکا ہے،اس لئے اس کی بھی تصدیق نہیں ہوسکی۔ندیم بہت اہم رسالہ تھا۔ایک زمانہ میں مولانا سید ریاست علی ندوی[١٩٠٤-١٩٧٦ء] اس کے مدیر تھے۔ اس کا بہار نمبر خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے اس کا ایک انتخاب شائع کیا ہے۔ بہر حال مولانا مرحوم کا پہلا مقالہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے اور یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ آیا مولانا نے عام مورخین کی تائید کی تھی یا علامہ شبلی کی۔تاہم قیاس ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی ہی کے موقف کی تائید کی ہوگی۔

یہ مقالہ انہوں نے اپنے استاد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی[١٩١٣-١٩٩٩ء] کو دکھایا تو انہوں نے مولانا کا حوصلہ بڑھایا اور تعریف کی۔البتہ یہ بھی کہا کہ''شبلی اسکول کا انداز بغیر تمہید بات شروع کرنے کا ہے۔''(٨) مولانا علی میاں ان سے عمر میں محض پانچ سال بڑے تھے۔

[٦]

اس طرح گویا مولانا مرحوم کی تحریر کا آغاز ہی علامہ شبلی کے ایک موقف کے مطالعے سے ہوا۔ غالبًا اسی اٹھان کو محسوس کر کے سید صاحب نے انہیں دارالمصنّفین بلایا۔ وہ دارالمصنّفین آئے تو بقول ان کے یہ دارالمصنّفین کی علمی زندگی کے عہد شباب کا آخری زمانہ تھا۔(٩) جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی[١٨٨٤-١٩٥٣ء]،مولانا عبدالسلام ندوی[١٨٨٣-١٩٥٦ء]

اور مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] جیسی شخصیتیں موجود تھیں اور جن کی ہر ادا میں شبلی کی جھلک پائی جاتی تھی۔اس ماحول میں شبلی کی فکر ونظر کے جلوے انہیں خیرہ نہ کرتے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس دور میں بلکہ اس کے بعد کے ادوار میں بھی جو کتابیں لکھیں، ان میں کسی نہ کسی نوع سے علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے۔ان کی آخری تصنیف اسوۂ حسنہ ہے۔وہ میرے سامنے قلم بند ہو کر سنہ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔مولانا مرحوم ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود گھنٹوں میز پر بیٹھے لکھا کرتے۔بظاہر اس موضوع کا شبلی سے کوئی تعلق نہیں، تاہم اس میں بھی انہوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا۔احادیث کے اردو ذخیرے کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان تمام بیش بہا ذخیروں کی موجودگی میں راقم الحروف نے علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی معنوی نسبت اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی وتحقیقی ذلہ ربائی کے طفیل میں ایک نئے مجموعہ حدیث کے مرتب کرنے کا آج سے پچیس تیس برس پہلے ارادہ کیا تھا۔........اس میں رنگ بھرنے کی توفیق اب ملی۔''(۱۰)

دارالمصنّفین کے زمانہ قیام میں علامہ شبلی سے متعلق تقریبات میں وہ بڑے اہتمام سے شریک ہوتے اور ان سے دلچسپی لیتے۔افسوس کہ خودنوشت مکمل نہ ہوسکی اور بہت سے واقعات اس میں درج ہونے سے رہ گئے۔یہاں ایک دو واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

[۷]

۱۹۶۰ء میں ادیب علی گڑھ کا شبلی نمبر ڈاکٹر ابن فرید [۱۹۲۵-۲۰۰۳ء] نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔اس میں مولانا مرحوم کا ایک طویل مقالہ ''شبلی کی سوانح نگاری'' شامل ہے۔ سچ یہ ہے کہ مولانا نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔راقم نے افادیت کے پیش نظر ماہنامہ الرشاد [اکتوبر ۱۹۹۹ء] میں اسے دوبارہ شائع کیا۔اس مقالہ میں انہوں نے علامہ شبلی کی سوانحی تصنیفات اور ان کی سوانح نگاری کی خصوصیات، مقصدیت، درایت، پس منظر اور پیش منظر، محنت وجستجو اور عالمانہ شان، ایجاز واعتدال، انشاء پردازی وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔بڑی بات

یہ ہے کہ عیش نیز بگو کے عنوان سے کمیوں اور خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ایک اور عنوان ''اخذ نتائج اور استدلال میں عجلت اور غلطی'' سے بھی تنقید کی ہے۔ اس میں خاص بحث قومی جذبہ اور اسلامی جذبہ سوانح نگاری پر ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کی زیادہ تر سوانح عمریاں سوائے سیرۃ النبی کے قومی جذبہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔ (۱۱)

ان کے اس موقف سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے، مگر جس محنت و تحقیق سے مقالہ لکھا گیا ہے وہ قابل صد تحسین و ستائش ہے۔

[۸]

فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنّفین کی طلائی جوبلی تقریبات منعقد ہوئیں، جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین [۱۸۹۷-۱۹۶۹ء] نے صدارت کی تھی اور ملک و بیرون ملک کے متعدد نامور علما و فضلا اور اہل علم شریک ہوئے۔ مولانا مرحوم اس وقت دارالمصنّفین کے رفیق تھے، وہ بھی شریک تھے، مگر روداد لکھنے والوں نے ان سے صرف نظر کیا ہے۔

[۹]

اسی سال [۱۹۶۵ء] محمد الحسنی مرحوم کی کتاب سیرت مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوہ شائع ہوئی، جس میں ندوہ کے ذکر میں علامہ شبلی اور ان کی خدمات کو نظرانداز کیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے مدیر معارف شاہ معین الدین احمد ندوی کی خواہش پر باب التقریظ والانتقاد میں تنقید و تبصرہ لکھا۔ (۱۲) اور کتاب کی کمیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی اور شبلی پر بے جا الزامات کی تردید کی اور یہ بھی لکھا کہ ندوہ میں اس وقت تاریخ سازی ہورہی ہے۔ اس کا کہیں ذکر تو نہیں مگر مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ مولانا مرحوم کی دارالمصنّفین سے علاحدگی کا ایک سبب یہ تبصرہ بھی تھا۔ اس میں مولانا مرحوم نے شبلی کی خدمات ندوہ کا خاص طور پر ذکر بھی کیا ہے اور اس کے نظر انداز کئے جانے پر احتجاج بھی۔

[۱۰]

۱۹۷۵ء میں شبلی کالج اعظم گڑھ میں بانی ادارہ کی یاد میں ''شبلی ہفتہ'' تقریبات منعقد

ہوئیں، جس میں اردو اور ہندی کے نامور اہل قلم، ادبا و شعراء اور نقادوں نے شرکت کی۔ جس میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی [۱۹۲۷ - ۱۹۷۸ء] ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی، شمس الرحمٰن فاروقی [پ: ۱۹۳۵ء] ڈاکٹر ڈی این شرما، ڈاکٹر تربھون سنگھ اور انیس انصاری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تقریب میں شبلی کالج کے اساتذہ اور دارالمصنّفین کے اہل قلم بھی شامل رہے اور مقالات پیش کئے۔ یہ بات شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ حضرۃ الاستاذ نے اس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ ایک گراں قدر مقالہ ''علامہ شبلی نعمانی کی جذباتیت'' کے عنوان سے پیش کیا، جس میں علامہ شبلی کی حمیت وغیرت اسلامی کے جذبات کی عکاسی ان کی تحریروں کے حوالہ سے کی تھی اور ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے عہد میں غیرت اسلامی کا سب سے بڑا نمونہ تھے اور ان کے تمام علمی کارنامے اسی بے مثل جذباتیت کے زیر اثر وجود میں آئے۔

[۱۱]

دارالمصنّفین کے زمانہ قیام کا ایک اور واقعہ مولانا مرحوم کی عقیدت شبلی کی غمازی کرتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ گجرات کے سفر پر گئے۔ راندیر میں قیام رہا۔ سید صاحب سے ملاقات کے لئے مولانا محمد یوسف بنوری [۱۹۰۸-۱۹۷۷ء] بھی راندیر تشریف لائے۔ ایک مجلس میں مولانا بنوری نے اپنا ایک خواب بیان کیا جو مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> ''ایک مجلس میں مولانا بنوری نے ایک لمبا چوڑا خواب بیان فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک پہاڑی ہے، اس پہاڑی کے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف علامہ شبلی اور کچھ لوگ ہیں جو مشقت سے جنت کی جانب جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ خواب سن کر سید صاحب تو خاموش رہے مگر مجھے بہت غصہ آ گیا اور ادب کے دائرے سے باہر ہو کر میں نے عرض کیا کہ مولانا معاف کیجئے گا، آپ حضرات کو چوں کہ علامہ شبلی کے ساتھ حسن ظن نہیں ہے، اس لئے آپ لوگوں کو اس طرح کا خواب نظر آتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی نے جس پرشور جذبہ سے سیرت نبویؐ کی

تدوین شروع کی اور پھراس کی تکمیل کے بعدانہوں نے اس پرحب نبویؐ میں
ڈوبا ہوا جو والہانہ سرنامہ لکھا اور جو قطعہ کہا، جنت کے فرشتوں نے جب اسے
کراماً کاتبین سے سنا ہوگا یا ان کا نوشتہ پڑھا ہوگا تو وفات کے ساتھ ہی اذن
الٰہی کے بعد اپنے جلو میں لے جا کر جنت میں ان کے مقام بلند کی سیر کرادی
ہوگی ، اس لئے مشقت سے جنت میں جانے کے خواب کو اضغاث احلام
[خواب پریشاں] ہی کہا جا سکتا ہے۔میرا رخ دیکھ کرحضرت سید صاحب نے
چپ رہنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ فرمایا اور گفتگو کا رخ پھیر دیا۔''(۱۳)

[۱۴]

نقوش زندگی میں اس واقعہ کے ذکر کے بعد مولانا نے علامہ شبلی کی سیرۃ النبی کا سرنامہ
اورسیرت سے متعلق ان کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

''سرنامہ کی عبارت یہ ہے:

ایک گدائے بےنوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی
نذر لے کرآیا ہے:

زچشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن
شبلی نعمانی

تاخیر سے سیرت لکھنے پرانہوں نے یہ قطعہ کہا تھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

آج بھی یہ سرنامہ اور قطعہ پڑھئے تو ان سے چشمہ ہائے رحمت الٰہی
کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''(۱۴)

[۱۳]

اس زمانہ میں حضرۃ الاستاذ پر علامہ شبلی کا اس قدر اثر تھا کہ راندیر کے بعد حضرت سید صاحب کے ساتھ وہ بمبئی پہنچے اور چوپاٹی کی سیر کرنی چاہی تو سید صاحب سے کہا کہ ''میں چوپاٹی دیکھنا چاہتا ہوں، جس کا ذکر علامہ شبلی نے اپنے خطوط اور اشعار میں کیا ہے۔'' (۱۵)

[۱۴]

علامہ شبلی کے زمانہ ندوہ میں ان کی قیام گاہ اہل علم وادب کا مرکز تھی اور ان کی ذات جان انجمن۔ اس میں شریک ہونے والوں کے چند نام ملتے ہیں۔ مولانا کے بیان کے مطابق اس میں ثاقب لکھنوی [۱۸۶۲-۱۹۴۱ء] بھی شریک ہوتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''جب لکھنو میں کوئی بڑے پیانے کا مشاعرہ ہوتا تو ندوہ کے طلبہ بڑے شعرا مثلاً جگر مرادآبادی، روش صدیقی، مجاز رودولوی وغیرہ کو مدعو کرتے۔ روش صدیقی تو کئی بار ندوہ آئے۔ ایک بار ثاقب لکھنوی کو بھی بلایا گیا۔ ثاقب صاحب علامہ شبلی کے بڑے قدرداں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب ندوہ گولہ گنج میں تھا تو وہ برابر مولانا کے یہاں حاضری دیا کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شہدائے کانپور پر علامہ شبلی نے جو نظم کہی تھی انہوں نے مجھے خود پڑھ کر سنایا۔'' (۱۶)

[۱۵]

مولانا سید سلیمان ندوی نے جس وقت حیات شبلی لکھی وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] سے بیعت وارادت کا رشتہ قائم کر چکے تھے، اس لئے بعض لوگوں کو خیال گذرا کہ شاید شبلی سے اب وہ عقیدت باقی نہ رہے۔ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کا خیال ہے کہ مقدمہ حیات شبلی میں انہوں نے دونوں کا خیال رکھا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب نے حیات شبلی کا مقدمہ اس وقت لکھا تھا جب وہ مولانا تھانوی سے بیعت ہو چکے تھے، جو اس وقت تصوف کے فکر وعمل کے سب سے

بڑے شارح تھے۔ علامہ شبلیؒ نے گو سوانح مولانا روم اور شعر العجم میں مسائل تصوف کی جا بجا بڑی اچھی تشریح کی ہے، مگر مجموعی حیثیت سے ان کے سوچنے اور برتنے کا انداز متصوفانہ نہیں تھا۔ سید صاحب کے دل میں مولانا تھانوی کا انتہائی احترام تھا، مگر علامہ شبلیؒ سے بھی انہیں بے پناہ محبت تھی۔ ایسی محبت جو کسی زمانہ میں کم نہیں ہوئی، چنانچہ انہوں نے ان دونون طرز فکر وعمل کی مقدمہ میں بڑی اچھی توجیہ بھی کی ہے اور صوفیہ اور متکلمین دونوں کا مقام بھی متعین کیا ہے۔''(۱۷)

[۱۶]

سیاسی نقطہ نظر سے بھی مولانا مرحوم علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ہم نوا تھے۔ علامہ شبلیؒ اپنے عہد میں دو قومی نظریہ کے خلاف اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ پر سخت چوٹیں کیں۔ حضرۃ الاستاذ کا بھی یہی نقطہ نظر رہا۔ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ مسلم لیگ مخالف خیمہ میں رہے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ سیاسیات پر گہری نظر رکھنے اور اس کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کے باوجود کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ علامہ شبلیؒ کا بھی یہی طرز عمل رہا۔

حوالے

(۱) نقوش زندگی ص ۲۹۔۳۰

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً ص ۶۶

(۴) ایضاً ص ۴۲

(۵) ایضاً ص ۴۲

(۶) ایضاً ص ۶۸

(۷) ایضاً ص۶۸

(۸) ایضاً ص۶۸

(۹) ایضاً ص۷۰

(۱۰) اسوۂ حسنہ ص۱۱

(۱۱) ادیب شبلی نمبر ص۵۹

(۱۲) معارف، جولائی ۱۹۶۵ء

(۱۳) نقوش زندگی ص۷۷

(۱۴) ایضاً ص۷۷-۷۸

(۱۵) ایضاً ص۷۸

(۱۶) ایضاً ص۶۳

(۱۷) ایضاً ص۸۵

(تصویر: حافظ نذر احمد)

[۲۲]

سرگذشت ایام

• حافظ نذر احمد

[مسلم اکادمی۔لاہور،طبع اول ۲۰۱۵ء]

لاہور کی سرزمین پر حافظ نذر احمد [۱۹۱۹-۲۰۱۱ء] سے بڑا آج تک شبلی کا شیدائی پیدا نہیں ہوا۔اس کے جواب میں کچھ لوگ ڈاکٹر سید عبداللہ [۱۹۰۷-۱۹۸۷ء] کا نام پیش کر سکتے ہیں اور بلا شبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایک بڑے شبلی شناس تھے۔انہوں نے نہ صرف علامہ شبلی کے فضل وکمال پر مقالات اور خطبات پیش کئے، بلکہ اپنی کتاب ''سرسید اور ان کے نامور رفقا'' میں شبلی کے علمی، ادبی، کلامی اور سوانحی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا اور ایک مضمون ''شبلی کے کام کی مجموعی قدر و قیمت'' لکھ کر ثابت کیا کہ واقعی ان کے کارنامے عظیم الشان ہیں۔اس کے باوجود حافظ نذر احمد کی شیفتگی شبلی ان سے بلند تر نظر آتی ہے اور جس طرح وہ عظمت شبلی کے معترف و مداح تھے اور جس طرح علامہ شبلی کو مدۃ العمر خراج عقیدت پیش کرتے رہے، وہ ان کی زندگی کا ایک مثالی کارنامہ ہے۔

حافظ نذر احمد ۲۰ رنومبر ۱۹۱۹ء کو قصبہ نگینہ ضلع بجنور اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد اردو و فارسی کی تعلیم بھی نگینہ ہی میں حاصل کی۔ پھر وہیں مدرسہ عربیہ قاسمیہ سے ۱۲-۱۳ سال کی عمر میں قران مجید حفظ کیا اور قاری محمد سلیمان دیوبندی سے تجوید وقرأت پڑھی۔ ۱۹۳۵ء میں اپنی بہن کے ہاں لاہور چلے گئے اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے، بلکہ اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

تحصیل علم کے بعد عملی زندگی کے آغاز میں دارالاسلام پٹھان کوٹ چلے گئے ۔ وہاں سے ایک سال گذار کر واپس آئے اور لاہور میں دفتری ہو گئے ۔ بعد ازاں اسلامیہ کالج لاہور میں نائب ناظم دینیات مقرر ہوئے ۔ پھر بوجوہ اسلامیہ کالج کی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور عبدالسلام قریشی [م: ۸/اپریل ۱۹۶۲ء] کے تعاون سے ۱۹۴۸ء میں شبلی کالج لاہور کی بنیاد رکھی ۔

حافظ نذر احمد نے متنوع خدمات انجام دیں اور سب قابل ذکر ہیں، تاہم ان میں تین پہلو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ایک قرآن پاک کی خدمت، دوسرے شبلی کالج کے ذریعہ تعلیمی خدمات اور تیسرے تصنیف وتالیف ۔

حافظ نذر احمد نے تفہیم قرآن کے لئے درس دیئے اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے قرآن پاک کا سلیس اور آسان زبان میں ترجمہ کیا ۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی انہوں نے بڑی علمی کاوشیں کیں اور مختلف النوع موضوعات پر متعدد کتابیں اور رسالے قلم بند کئے ۔ ان کی معلوم کتابوں اور رسالوں کے نام یہ ہیں:

۱- آؤ مدینہ چلیں ،۲- سیرت مبارکہ کے چند پہلو ،۳- طب نبوی ؐ ،۴- ارض مقدس [فلسطین] ۵- دیواریں اور غاریں ، ۶- اربعین نووی ، ۷- مؤطام امام محمد ، ۸- اللہ کے احکام ۹- تعلیمی مقالات ، ۱۰- مقالات یوم شبلی ، ۱۱- ہمارے فرائض اور ہمارے حقوق ، ۱۲- اشاریہ تفسیر ماجدی ، ۱۳- فرہنگ عصریہ ، ۱۴- پیارے نبی کی پیاری زبان ، ۱۵- سورۃ البقرہ ، ۱۶- آسان ترجمہ قرآن کریم ، ۱۷- عبادت کیوں اور کیسے ؟ ۱۸- شفا اللہ کے ہاتھ میں ، ۱۹- ہمارے مشاہیر ، ۲۰- جائزہ مدارس عربیہ [دو جلدیں] ۲۱- انبیائے قرآن ، ۲۲- اسلام کا نظام عدل و تعزیرات ، ۲۳- ہماری مکمل نماز ، ۲۴- فلسفۂ نماز ، ۲۵- انتخاب آیات واحادیث ، ۲۶- سیرۃ النبی ایک نظر میں [چارٹ] ، ۲۷- نصاب اسلامیات بی.اے ، ۲۸- نصاب اسلامیات ایف. اے ، ۲۹- نصاب اسلامیات میٹرک ، ۳۰- نصاب اسلامیات پرائمری و مڈل ، ۳۱- ہماری اردو [مڈل کلاسز] ۳۲- ہماری اردو [پرائمری جماعتوں کے لئے] ۳۳- مسیحیت پاکستان میں ، ۳۴-

مؤطا امام مالک مع اردو ترجمہ واسماء الرجال۔

مسلم اکادمی کے نام سے لاہور میں انہوں نے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ ان کی بیشتر تصنیفات اسی ادارہ سے شائع ہوئیں۔ یہ ادارہ اب بھی قائم ہے۔ ان کی خود نوشت ''سرگذشت ایام'' اسی ادارہ سے میں شائع ہوئی ہے۔

حافظ نذر احمد بڑے نیک اور عابد وزاہد شخص تھے۔ مدۃ العمر دین وملت کی خدمت کرتے رہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ ۲۳ر ستمبر ۲۰۱۱ء کو لاہور میں ۹۲ رسال کی عمر میں وفات پائی۔

سرگذشت ایام ان کی طویل علمی و تعلیمی زندگی کا ایک مختصر مرقع ہے۔ جسے مشہور اہل قلم اور مبصر و ناقد اور ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے سابق چیف ایڈیٹر ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے مرتب کیا ہے اور ان کے صاحبزادے محمد فاروق نے مسلم اکادمی لاہور سے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔

سرگذشت ایام کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ سرگذشت ایام ہے۔ دوسرے حصہ میں حافظ نذر احمد کے اعزہ واقارب کے تاثراتی مضامین ہیں اور تیسرے حصہ میں حافظ صاحب کی شخصیت اور خدمات پر اہل قلم نے جو مضامین لکھے تھے، انہیں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب حافظ نذر احمد کی حیات خدمات کا ایک عمدہ مرقع ہوگئی ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حافظ نذر احمد علامہ شبلی کے عاشق زار تھے، اسی طرح سرگذشت ایام کے مرتب ڈاکٹر سفیر اختر صاحب بھی ایک بڑے شبلی شناس ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے حافظ نذر احمد کی خواہش پر ''کتاب نامہ شبلی'' مرتب کی، جس سے شبلی شناسی کا کارواں تیز گام ہوا اور جس سے خود مجھے کتابیات شبلی مرتب کرنے میں بڑی مدد ملی۔ علامہ شبلی کے بارے میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کا نظریہ بہت واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ان عہد آفریں شخصیات میں سے ہیں جن کے فکر وعمل نے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو گہرے طور پر

متاثر کیا۔ ان کی ادبی اور تنقیدی کاوشوں سے اردو اور فارسی زبانوں کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ان کی سوانحی اور تاریخی تحریروں نے فکر وفہم کو نیا رخ دیا اوران کی علمی وتعلیمی تحریک ایک مدرسہ فکر بن گئی۔''(۱)

''کتاب نامہ شبلی'' کے محرک حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ سرگذشت ایام کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی نعمانی کی علمی، تعلیمی اور فکری خدمات سے زمانہ آگاہ ہے۔ حافظ صاحب علامہ شبلی کی ان خدمات کی تجلیل کرتے رہتے تھے۔......میں ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک روز انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ علامہ شبلی نعمانی کے سوانح وافکار کے حوالے سے کتابیات شائع ہونا چاہئے۔ میں نے اس کی بھرپور تائید کی تو ان کے دل کی بات زبان پر آگئی کہ یہ کام تم کرو۔ میں نے ان کی خواہش کو حکم سمجھا اور اپنی طالب علمانہ صلاحیت کے مطابق کتاب نامہ شبلی مرتب کیا جو انہوں نے اپنے ادارے مسلم اکادمی اور شبلی کالج کی بزم ادب کی جانب سے شائع کیا۔ انہوں نے کتاب نامہ شبلی اصحاب ذوق بالخصوص علامہ شبلی نعمانی کے فکر و دانش سے دلچسپی رکھنے والوں میں تقسیم کیا اور جب بھی کسی نے ان سے کتاب نامے کے لئے رابطہ کیا، انہوں نے نسخہ بھیج کر مسرت محسوس کی۔''(۲)

کتاب نامہ شبلی سے حافظ نذر احمد کی دلچسپی کا اندازہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کے درج ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جن دنوں ''کتاب نامہ شبلی'' کی کتابت ہو رہی تھی، حافظ صاحب ریڑھ کی ہڈی کے عارضے میں مبتلا تھے۔ چند مہرے ہل گئے تھے اور ڈاکٹروں نے تخت پر چت لیٹے رہنے کا مشورہ دے رکھا تھا۔ اسی حال میں انہوں نے لیٹے لیٹے پروف دیکھے اور کتاب نامے کا پیش لفظ ''علامہ شبلی اور ان

کا کارنامہ'' قلم برداشتہ لکھا۔''(۳)

حافظ نذر احمد کے اس پیش لفظ کا ایک ایک لفظ عقیدت شبلی میں ڈوبا ہوا ہے۔اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ شبلی اوران کے کارناموں کی عظمت ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی تھی۔وہ علامہ شبلی کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی اپنی ذات میں انجمن نہیں بلکہ انجمن ساز تھے۔حق تو یہ ہے کہ انجمن ساز نہیں ادارہ ساز تھے۔ادارے بھی وقتی یا عام سطح کے نہیں بلکہ مستقل اور دائمی نوعیت کے ادارے جو اپنے قیام کی گولڈن جبلی کی تیاریاں کررہے ہیں۔ایسے ادارے جو صدی گذر جانے کے باوجود اپنی جگہ منفرد اور یکتا ہیں۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ برصغیر پاک و ہند کی وہ علمی درسگاہ ہے جس کا نصاب، بنیادی فکر اور ذریعہ تعلیم آج بھی انفرادیت کا حامل ہے۔........ دارالمصنّفین اعظم گڑھ تحقیقی، تربیتی اور تصنیف وتالیف کا ادارہ ہے، جس کی اپنی چھاپ ہے، جس کی مطبوعات زبان حال سے اپنے ارادے کی نشان دہی کردیتی ہیں۔یہ سب علامہ شبلی کی ادارہ ساز شخصیت کا پرتو ہے۔''(۴)

حافظ نذر احمد نے علامہ شبلی کے فضل وکمال کے ساتھ ان کی جامعیت کا ذکر خاص طور پر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی کی شخصیت کا دوسرا منفرد پہلو ان کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی ہے۔وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے۔یہ وصف خاص بہت کم افراد کو حاصل ہوتا ہے۔شبلی معلم بھی تھے اور مصنف بھی، سیرت نگار بھی تھے اور مورخ بھی، ادیب شہیر بھی تھے اور شاعر بھی۔تاریخ ادبیات کے ماہر بھی تھے اور یگانہ محقق ونقاد بھی۔''(۵)

حافظ صاحب مرحوم علامہ شبلی کی تصنیف وتالیف کے میدان میں انفرادیت اور کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہوں نے جو کچھ لکھا بڑی تحقیق سے لکھا اور جو موضوعات ہیں ان میں اولیت کا سہرا ان کے سر بندھا ہے۔ان کا لکھا مستند تھا اور اپنے موضوع پر حرف آخر کہلایا۔علامہ شبلی کا دائرہ نگارش بہت وسیع ہے۔انہوں نے سیرت کا موضوع اپنایا تو اسے کسی ایک دائرے یا کسی ایک دور تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر اپنے دور تک مختلف ہستیوں کو چنا، ان میں ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلیفہ ثانی بھی ہیں اور سلاطین اسلام بھی، مشاہیر اسلام بھی ہیں اور شعرائے کرام بھی۔''(۶)

علامہ شبلی سے ان کے گہرے لگاؤ کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو، جس سے اس حقیر کا بھی یک گونہ تعلق ہے۔۱۹۹۳ء میں میں نے ''کتابیات شبلی'' مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو اس سلسلے میں ایک خط محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو لکھا، جو اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے ڈائرکٹر اور اخبار اردو اسلام آباد کے مدیر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس خط کو ماہنامہ اخبار اردو اسلام آباد میں شائع کر دیا۔حافظ نذر احمد نے وہ خط پڑھا تو اس کے تراشے کے ساتھ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کو خط لکھا کہ:

''کتابیات شبلی کے بارے میں ایک اعلان ہے جو محمد الیاس الاعظمی اعظم گڑھ کی طرف سے ہے۔ان کا پتہ مکمل نہیں چھپا کہ میں خود انہیں آپ کے کتاب نامہ شبلی کے بارے میں لکھ دیتا۔اب مقتدرہ سے پتہ حاصل کر کے آپ خود لکھ دیں تو اچھا ہے۔''(۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے مجھے خط لکھا کہ جب کتابیات شبلی مکمل ہو جائے تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیں۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے مقتدرہ سے شائع شخصی کتابیات کے ۱۵/ کتابچے بھی ارسال کئے۔جو اب میرے ذاتی کتب خانہ میں ان کی یادگار ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کو بھی خط لکھا۔چنانچہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے کتاب نامہ شبلی کا نسخہ مجھے بھیجا مگر افسوس وہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔

اس سے حافظ جی کے علامہ شبلی سے گہرے شغف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ مباحث ضمناً آ گئے اور موضوع سے ہٹ کر بھی ہیں مگر ان کا ذکر ضروری بھی تھا۔ اب سرگذشتِ ایام میں شبلی کالج لاہور کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں۔

شبلی کالج لاہور ۱۹۴۸ء میں بڑی بے سروسامانی میں قائم ہوا۔ حافظ نذر احمد نے اس کی سرگذشت لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''۵۰/ میور روڈ (حال علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو) میں بارون بلڈنگ کے نام سے مشہور عمارت تھی۔ بلڈنگ میں نیچے ایک وسیع تہہ خانہ تھا۔ کسی زمانے میں یہاں چٹنیاں اور مربے کا کارخانہ تھا۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں تہہ خانہ ہم نے بڑی جد و جہد سے کرائے پر حاصل کر لیا اور یہاں تعلیم بالغاں اور میٹرک [آرٹس] کی تین شبینہ کلاسز شروع کر دیں۔ پہلے سال ہمارے ۳۸ طلبہ میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے اور نتیجہ ستر فیصد کے قریب رہا جو بہت بڑی بات تھی۔'' (۸)

کچھ دنوں بعد حافظ صاحب نے ایک اور ہال کرائے پر لیا اور بی اے تک کی کلاسز شروع کرا دیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''دو سال بعد ہمیں سکیٹنگ ہال بھی کرائے پر مل گیا۔ ہم نے ٹاٹ کے عارضی پردے ڈال کر ہال کو چار کمروں میں تقسیم کیا۔ ٹاٹ کے عیب چھپانے کے لئے اس کے دونوں طرف سفیدی پھیر دی، اس طرح دسویں کے ساتھ نویں اور ایف اے بی اے کی کلاسز شروع ہو گئیں۔ تعلیم بالغاں کو جونیئر اور سینئر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دراصل یہ پرائمری اور مڈل کے دو حصے تھے۔ ان میں صرف اردو، حساب اور انگریزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس طرح ہمارے طلبہ عام طور پر چار سال میں میٹرک پاس کر لیتے تھے۔'' (۹)

اس کے بعد حافظ صاحب نے شبلی کالج کو مزید ترقی دی۔ ادیب عالم اور منشی فاضل کی

کلاسز شروع کرادیں۔ بعدازاں شبینہ کلاسز کے ساتھ ڈے کلاسز کا بھی آغاز ہوا۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''اب ہم نے شبینہ کلاسز کے ساتھ مستقل ڈے کلاسز کا بھی اجراء کردیا دن میں چھٹی سے دسویں تک آرٹس/سائنس دونوں ایف اے اور آئی کام کی کلاسز شروع کردیں۔''(۱۰)

شبلی کالج جن حالات میں قائم ہوااوراس کی کس درجہ ضرورت تھی، وہ حافظ نذر احمد نے اس طرح بیان کی ہے:

''یہ پاکستان کا دورابتلا تھا۔ باقاعدہ، تعلیمی ادارے معدودے چند تھے۔ جب کہ طلب علم کی خواہش مندوں کی تعداد کثیر تھی۔ اندازہ کیجئے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم نے میٹرک کے امتحان میں ایک سو سے زیادہ پرائیویٹ طلبہ کے داخلے بھیجے اور نتائج بھی حوصلہ افزا ہوئے تھے۔''(۱۱)

شبلی کالج لاہور دورابتلا میں قائم ہوا، تاہم حافظ نذر احمد کی جدوجہد رنگ لائی۔ اس سے ہزاروں طلبہ نے استفادہ کیا۔ تعلیم بالغاں سے سیکڑوں لوگوں نے اپنی تعلیمی پیاس بجھائی۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں:

''شبلی کالج سے تعلیم بالغاں حاصل کرنے والے اور میٹرک ایف اے، بی اے، ادیب، عالم منشی فاضل اور آئی کام کے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ قیام پاسکتان کے بعد مغل پورہ، باغبان پورہ، صدر بازار، دھرم پورہ، گڑھی شاہو اور قلعہ گوجرسنگھ یعنی سرحد پاکستان سے ریلوے اسٹیشن تک کوئی اورنجی تعلیمی ادارہ نہ تھا، جہاں سے مقامی اور مہاجرین کسب فیض کر سکتے۔ ایسے نوجوانوں کی متعدد مثالیں ہیں جو سڑکوں کے کنارے پنکچر لگاتے لگاتے اور گلی کوچوں میں ایڑھیاں لگاتے پھرتے پھراتے، دفاتر میں ملازمت کرنے کے قابل ہوگئے۔ میری نگاہوں میں آج بھی ایسے چار نوجوانوں کی

تصویر پھر رہی ہے جو پاکستان ریلوے سوسائٹی اور لاہور کارپوریشن میں نائب
قاصد بھرتی ہوئے تھے،شبلی کالج سے میٹرک ایف اے اور بی اے کے امتحان
پاس کر کے اپنے ہی دفاتر میں سپریٹنڈنٹ کے عہدے تک پہونچے۔''(۱۲)

شبلی کالج بے سہاروں کا سہارا تھا۔ اس نے نہ جانے کتنوں کی زندگیاں بدل دیں۔
ایک واقعہ سنئے:

''ایک دن کلاسز چیک کرتے ہوئے میں میٹرک [آرٹس] کے کمرے
میں گیا۔ دیکھا کہ ایک ڈیسک پر تین طالب علم بیٹھے ہیں،لیکن ان کے پاس
کتاب ایک ہی ہے۔ میں نے باز پرس کی تو بولے ہم باپ بیٹا اور داماد ہیں۔
ہم غریب آدمی ہیں۔ ایک کتاب سے گذارا کر لیتے ہیں۔ میٹرک کا نتیجہ نکلا تو
باپ محکمہ معلومات عامہ پنجاب میں نائب قاصد تھا،اسے کلرکی کی جگہ مل گئی۔
داماد سڑک کے کنارے پنکچر لگاتا تھا وہ ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ بیٹے کا حال
مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

شبلی کالج کے متعدد ابنائے قدیم آج بھی لاہور ہائی کورٹ اور سپریم
کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالی کا احسان ہے۔ ہم جس قدر شکر
ادا کریں کم ہے۔''(۱۳)

حافظ نذر احمد نے سرگذشت ایام میں کالج کے بہت سے تجربات و مشاہدات اور
واقعات قلم بند کئے ہیں اور شبلی کالج کی انفرادیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''شبلی کالج گو ایک پرائیویٹ ادارہ تھا لیکن یہ ایک بامقصد ادارہ تھا۔ تعلیم
وتدریس کے علاوہ طلبہ کی تربیت اس کے پیش نظر تھی۔ کسی فخر کے طور پر نہیں بلکہ
تحدیث نعمت کے طور چند ایک تجربات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔''(۱۴)

ایک محیر العقول واقعہ کے عنوان سے ایک ایسے طالب علم کا ذکر کیا ہے جسے بورڈ کی
طرف نقل کرنے کی نوٹس آ گئی تھی۔ چنانچہ حافظ نذر صاحب نے اس سے چند سوالات کئے کہ کیا

آپ کسی کاغذ سے نقل کرتے ہوئے پکڑے گئے، کہا نہیں۔ پھر پوچھا نگراں کو تمہارے پاس سے کوئی کاغذ ملا، اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تمہاری میز کے پاس سے کوئی کاغذ ملا، کہا نہیں۔ تو میں نے اس سے پوچھا پھر تم پر نقل کا کیس کیسے بن گیا۔ تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا کہ میرا انگریزی کا پرچہ چیک کرنے والے نے لکھا ہے کہ اس طالب علم نے فلاں فلاں سوال کتاب سے نقل کیا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اس نے یہ بات کیسے لکھ دی۔ اس نے جواب دیا، اللہ تعالی نے مجھے ایسا حافظہ عطا کیا ہے کہ میں ایک بار کچھ پڑھ لوں تو وہ کتاب بند کر کے ہو بہو لکھ سکتا ہوں۔ جو جوابات میں نے لکھے تھے وہ میں نے کتاب میں پڑھے تھے۔ اب میں نے اس کا امتحان لیا اور ایک کتاب کا کوئی صفحہ اس سے پڑھوایا، پھر کتاب لے لی اور لکھنے کے لئے کاغذ دے دیا، چنانچہ اس نے جو پڑھا تھا ہو بہو لکھ دیا۔ (۱۵)

شبلی کالج کے بانی پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب تھے۔ انہوں نے طلبہ اور پرنسپل کے درمیان کی تمام رکاوٹیں ختم کر کے ایک دوسرے سے پرنسپل کے بجائے ہمدرد اور مونس وغم خوار کا رشتہ قائم کیا۔ اس کے بھی متعدد فوائد کالج اور طلبہ کو میسر آئے۔ (۱۶)

شبلی کالج کی ایک اور انوکھی ادا تھی۔ یہاں طلبہ کے معاملات و مسائل زبانی سنے جاتے تھے، درخواست کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور درخواست کے بغیر رخصت منظور ہو جاتی تھی۔ (۱۷)

صباحی خطاب کا اہتمام ہوتا تھا، مگر اس میں حاضری کی کوئی قید نہیں ہوتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ جبر اور جرمانے کے مقصد کے بغیر خوشی سے اس میں شامل ہوں۔ صباحی خطاب کے بارے میں حافظ نذر احمد لکھتے ہیں:

> ''طلبہ کالج ہال میں جمع ہو جاتے تو کوئی طالب علم ڈائس پر آ کر چند آیات کی تلاوت کرتا۔ اس کے بعد تمام طلبہ تختہ سیاہ سے اس دن کے درس کی آیت / حدیث اپنی خاص کاپی میں نوٹ کر لیتے۔ طلبہ یہ نوٹ بک اپنے کسی دوسرے موضوع کی کاپی سے زیادہ حفاظت اور ادب کے ساتھ رکھتے تھے۔ بندہ نے

ایک سو آیات قرآن اور ایک سو احادیث نبویؐ کا انتخاب کر کے طبع کرایا۔ اس کی کوئی آیت اور حدیث پانچ سے زیادہ الفاظ پر مشتمل نہیں۔''(۱۸)

صباحی خطاب کے بعد قرآن مجید کی اجتماعی تدریس ہوتی تھی۔ اس میں پہلی جماعت سے منتہی جماعت تک کے طلبہ شریک ہوتے۔ حافظ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''قرآن مجید کی تدریس جو ہجے کے بغیر براہ راست اور تکرار کے انداز سے کی جاتی تھی، الحمد للہ سال میں قرآن مجید ختم ہو جاتا اور طلبہ کی اکثریت تلاوت کے قابل ہو جاتی۔(۱۹)

علامہ شبلی نے علی گڑھ میں برسوں درس قرآن دیا تھا، غالباً حافظ صاحب کے ذہن میں یہ بات وہیں سے آئی ہوگی۔ یہاں یہ بات عرض کر دوں کہ اعظم گڑھ میں علامہ کا قائم کردہ شبلی کالج ہے اور علمی و تعلیمی خدمات کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، مگر اس میں درس قرآن کا اہتمام آج تک نہ ہو سکا۔

شبلی کالج لاہور میں غیر مسلم طلبہ بھی زیر تعلیم تھے اور اکثر اس ماحول سے متاثر۔ دو طلبہ بخوشی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔(۲۰)

شبلی کالج میں نماز تراویح کا بھی اہتمام ہمیشہ ہوتا رہا اور خود پرنسپل حافظ نذر احمد صاحب تراویح پڑھاتے تھے۔ بعض غیر مسلم طلبہ بھی اس میں شریک ہوتے بلکہ منع کرنے کے باوجود شریک ہوتے اور انہیں اس عمل میں لطف آتا تھا۔(۲۱)

حافظ نذر احمد صاحب شبلی کالج میں اکثر تقاریب کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ اس طرح کی دو تقاریب کا سرگذشت ایام میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ ایک یوم شبلی اور دوسرے یوم والدین۔

یوم شبلی مئی ۱۹۶۸ء میں بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر مقالات بھی لکھوائے گئے جو لاہور اور دوسرے شہروں کے اہل قلم نے لکھے۔ اس میں درج ذیل اہل علم کے نام شامل ہیں:

ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی پروفیسر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید مرتضی

حسین فاضل، علامہ سید شبیر بخاری، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر افتخار احمد چشتی، پروفیسر شیخ محمد عثمان۔

کئی روز تک اخبارات میں اس تقریب کا تذکرہ ہوتا رہا۔

مقالات کتابی شکل میں شائع ہوئے اور اہل علم میں تقسیم ہوئے۔ یہ مجموعہ راقم کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے اور واقعی بہت عمدہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مذکورہ بالا اہل علم کے مقالات شامل ہیں۔ ان مقالات میں تنوع ہے اور شبلی کے فکر وفن کے بیشتر نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں۔

شبلی کالج لاہور کی کامیابی سے حافظ صاحب خوش خوش دنیا سے گئے۔ ان کی یہ تحریر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی اس کالج کے بانی کا نام نہ تھا، نہ مولانا شبلی سے ہمارا کوئی نسبی رشتہ تھا، لیکن ان کی علمی عظمت اور اپنی عقیدت کے اعتبار سے ہم نے علامہ شبلی کے نام سے اس کالج کو منسوب کیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ نسبت اثر سے خالی نہیں ہوتی۔'' (۲۲)

علامہ شبلی کے نام منسوب ہند و پاک میں اور بھی کالج ہیں، جن کا ذکر راقم نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں قدرے تفصیل سے کیا ہے، مگر اعظم گڑھ کے کالج کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت مرحوم شبلی کالج لاہور ہی کو ملی۔ کالج کی یہ شاندار تاریخ، ہماری تعلیمی تاریخ میں حافظ نذر احمد کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

حوالے

(۱) کتاب نامہ شبلی ص ۶

(۲) سرگذشت ایام ص ۲۷

(۳) ایضاً ص ۲۷

(۴) ایضاً ص۲۸

(۵) ایضاً ص۲۹

(۶) ایضاً ص۲۹

(۷) ایضاً ص۲۶

(۸) ایضاً ص۱۴۳

(۹) ایضاً ص۱۴۴

(۱۰) ایضاً ص۱۴۴

(۱۱) ایضاً ص۱۴۴

(۱۲) ایضاً ص۱۴۴-۱۴۵

(۱۳) ایضاً ص۱۴۵

(۱۴) ایضاً ص۱۴۷

(۱۵) ایضاً ص۱۴۵۔۱۴۶

(۱۶) ایضاً ص۱۴۸

(۱۷) ایضاً ص۱۴۸

(۱۸) ایضاً ص۱۴۹

(۱۹) ایضاً ص۱۵۰

(۲۰) ایضاً ص۱۵۰

(۲۱) ایضاً ص۱۵۱

(۲۲) ایضاً ص۱۵۳

(تصویر: پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی)

[۲۳]

دھوپ چھاؤں

• پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی
[حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء]

دھوپ چھاؤں ہمارے بزرگ کرم فرما اور عہد حاضر کے ممتاز ادیب ونقاد اور دانشور عالی جناب نواب پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی [پ: اپریل ۱۹۲۴ء] کی خودنوشت کا ایک باب ہے۔ اس میں انہوں نے زمانہ طالب علمی اور اپنے عہد کے علی گڑھ پر قلم اٹھایا ہے۔ شروانی صاحب علی گڑھ کے شروانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پوتے اور نواب عبیدالرحمٰن خاں شروانی کے صاحبزادے ہیں، مگر انہوں نے جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے، خاندانی وجاہت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ بہت سی خوبیوں کے جامع اور متعدد کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مرتب ہیں۔ ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

انڈیا ونس فریڈم: ایک مطالعہ، میر کارواں ابوالکلام آزاد، شذرات ریاض شروانی، کتابوں کے درمیاں، مقالات ریاض شروانی۔ انسان کیسے کیسے۔ مسائل ومباحث وغیرہ۔

شروانی صاحب مولانا آزاد کے عاشق صادق ہیں اور ان کی ہر ادا پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کی سیاسی فکر کے ساتھ مذہبی فکر کے بھی ہم نوا اور موجودہ ہندوستان میں غالباً سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ ان کی شاید ہی کوئی تحریر وتصنیف اس فکر سے خالی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر تحریروں میں مولانا آزاد کے فکر ونظر کی جلوہ گری ہے۔

دھوپ چھاؤں میں انہوں نے اولاً خاندانی احوال لکھے ہیں پھر اپنے تعلیمی حالات سپرد

قلم کئے ہیں۔ کہنے کو تو یہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء کے حالات پر مشتمل ہے مگر درحقیقت اس دور کے علی گڑھ کے اتنے واقعات اس میں آ گئے ہیں کہ شاید ہی کہیں اور ملیں۔ اسے انہوں نے خود ہی شائع کیا ہے۔ یہ بھی ان کی وضع داری ہے، جس وقت دھوپ چھاؤں شائع ہوئی وہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری اور ماہنامہ کانفرنس گزٹ کے مدیر تھے۔ چاہتے تو اس ادارہ سے شائع کر سکتے تھے، مگر ان کی اصول پسندی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے صرفہ سے شائع کریں۔

پیرانہ سالی، ضعف اور کمزور صحت کے باوجود وہ آج بھی سرگرم عمل ہیں۔ کانفرنس کے اب بھی نائب صدر ہیں۔ چند دنوں پہلے کانفرنس گزٹ کی ادارت سے سبکدوش ہوئے تو اپنا ماہنامہ فکر نو جاری کیا اور محض چند ماہ میں اسے گزٹ کا ثانی بنادیا اور بڑے فکر انگیز اداریے لکھے۔ افسوس اس وقت ان کی صحت اچھی نہیں ہے۔ بینائی خاصی متاثر ہو گئی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔

شروانی صاحب مولانا آزاد اور حبیب الرحمٰن شروانی کے ممدوح علامہ شبلی نعمانی کے بڑے اداشناس ہیں۔ یہ تعلق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ گو انہوں نے علامہ شبلی پر کم لکھا ہے، لیکن شبلی کے خطوط پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں ان کا شاندار توسیعی خطبہ ایک قابل ذکر تحریر ہے۔ اب وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

مجھے ان کی خاص شفقتوں سے واسطہ رہا ہے اور اب بھی میری تصنیفی زندگی ان کے فرط شفقت سے سر نہیں اٹھا سکتی۔ احباب واقف ہیں کہ میری دیگر تصنیفات کے علاوہ خاص علامہ شبلی سے متعلق ایک درجن کتابیں شائع ہوئیں۔ شروانی صاحب نے تقریباً ان تمام کتابوں پر تبصرہ کیا ہے، جو ان کے تبصروں کے مجموعہ ''کتابوں کے درمیان'' میں شامل ہیں۔ خاص طور پر شبلی سے متعلق کتابوں پر انہوں نے جو نقد و تبصرہ لکھا ہے، وہ ثابت کرتا ہے کہ ان کے دل میں علامہ شبلی کسی سے کم رتبہ نہیں رکھتے ہیں۔ طوالت اور خودستائی کے خوف سے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور دھوپ چھاؤں میں آئے ذکر شبلی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

[۱]

اہل علم واقف ہیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کا تذکرہ ہوتو ذکر شبلی کے بغیر وہ مکمل نہیں ہوگا۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی صاحب دارالمصنّفین کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی تاسیس کے سلسلے میں ان کے دوست اور ممدوح علامہ شبلی نعمانی ان سے برابر مشورہ کرتے رہے۔اس کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی انہیں ہمیشہ جانشین استاد کا درجہ دیتے رہے۔ وہ دارالمصنّفین کی علمی مجلس کے صدر برسوں رہے۔''(۱)

واقعہ بھی یہی ہے کہ دارالمصنّفین کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ وہ ابتداء میں دارالمصنّفین کو اپنے وطن حبیب گنج لے جانا چاہتے تھے، مگر علامہ شبلی راضی نہیں ہوئے۔ پھر وہ اعظم گڑھ میں قائم ہوا تو مدۃ العمر اس کے صدر نشین رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالمصنّفین کی جو تاریخیں لکھی گئیں سب میں ان کا ذکر تفصیل سے ہے۔ دارالمصنّفین کے ترجمان ماہنامہ معارف نے چند ہی خصوصی شمارے شائع کئے ہیں، اس میں پہلا نمبر مولانا حبیب الرحمٰن شروانی ہی پر شائع ہوا۔

[۲]

علامہ شبلی کو مولانا شروانی سے بڑی گہری عقیدت تھی۔خود انہوں نے ''حبیب شبلی'' لکھا ہے۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی اس تعلق کی وضاحت اور ان کے احباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے مراسم سے سب اہل علم وادب واقف ہیں۔ جب مولانا آزاد نے ان سے مخاطب کر کے غبار خاطر لکھی تو خود فرمایا کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ وہ اور مولانا شروانی مل کر ایک کتاب لکھیں جس پر مصنف کا نام حبیب شبلی درج ہو۔''(۲)

علامہ شبلی کو مولانا شروانی سے کس درجہ تعلق خاطر تھا اس کا مطالعہ کرنا ہو تو علامہ شبلی کے ان خطوط کا مطالعہ کرنا چاہئے جو ان کے نام ہیں اور جو مکاتیب شبلی اور مکتوبات شبلی میں شائع ہوئے ہیں۔

[۳]

پروفیسر شروانی نے دھوپ چھاؤں میں اپنی کتب بینی اور مطالعاتی زندگی کی تفصیل بھی قلم بند کی ہے۔ پہلے قرآن واحادیث وتفاسیر اور بعض دوسری کتابوں اور ان کے مصنّفین کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد علامہ شبلی کی تصنیفات کے مطالعہ کا ذکر ہے اور اس خوبی سے ہے کہ ان کی تصانیف کی بنیادی خصوصیات بھی آ گئی ہیں۔ان کے اثرات کو بھی بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اس دوران میں نے جن غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کیا،ان میں مجھے خاص طور سے علامہ شبلی نعمانی کی تصانیف نے متاثر کیا۔میں سب سے زیادہ متاثر الفاروق سے ہوا۔اس کے بارے میں میری ڈائری میں اندراج ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد میری فکر میں حضرت عمر فاروقؓ کی عظمت بہت بڑھ گئی۔میرا خیال ہے کہ کسی مصنّف کا اصلی کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ جس مقصد سے کوئی کتاب لکھتا ہے،اس میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔علامہ شبلی کی بعض دوسری کتابوں کا مطالعہ اس دور کے بعد کیا لیکن اپنی بات مکمل کرنے کے لئے یہ عرض کردوں کہ میری رائے میں ان کی چند دیگر تصانیف بھی اس صفت سے متصف ہیں۔مثلاً شعرالعجم پر تحقیقی نقطہ نظر سے جو بھی اعتراض کیا جائے،ہندوستان میں فارسی شعروادب کے احیاء میں اس کتاب نے بلاشبہہ اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور فارسی شعرفہمی کی راہیں استوار کی ہیں۔تاریخ و سوانح میں سیرۃ النبیؐ ج اول اور المامون بھی معرکے کی کتابیں ہیں۔جزیہ پر انہوں نے جو کچھ دیا ہے وہ اس موضوع پر حرف آخر ہے۔کتب خانہ اسکندریہ پر لکھتے ہوئے انہوں نے تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔عطیہ فیضی

کے نام ان کے خطوط مکاتبتی ادب میں بیش بہا اضافہ اور انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔'' (۳)

شبلی اور تصانیف شبلی کی اس قدر مدلل مداحی حبیب شبلی کے پوتے ہی کو سزاوار ہے، مگر وہ صرف مداح ہی نہیں نقاد بھی ہیں اور بعض معاملات میں شبلی پر حالی اور مولانا آزاد کو فوقیت دیتے ہیں اور جن لوگوں نے شبلی کا سرسید سے موازانہ کیا ہے اسے بے جا قرار دیتے ہیں۔ رقم طراز ہیں:

> ''تنقید بالخصوص نظری تنقید میں خواجہ حالی کا مرتبہ ان سے برتر ہے اور سیاسی اور مذہبی لٹریچر میں مولانا آزاد کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔ سرسید احمد خاں سے ان کا مقابلہ جرأت بے جا ہے۔ ان دونوں کی عمر میں نسل سے بھی زیادہ کا تفاوت ہے۔ سرسید ایم اے او کالج کے بانی تھے اور وہ اس میں استاد رہے۔ اگر چہ یقیناً باعث فخر استاذ رہے، خود سرسید نے اپنی ایک تقریر میں تین حضرات کو [اسی ترتیب کے ساتھ] کالج کے لئے باعث افتخار قرار دیا ہے۔ حالی، شبلی اور آرنلڈ۔'' (۴)

حالی بھی شبلی سے عمر میں بیس سال بڑے تھے۔ ہندوستان کا جو دور انہوں نے دیکھا تھا، شبلی نے نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدمہ شعر وشاعری اردو کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں قدم تھا۔ بلاشبہہ نظری اعتبار سے حالی شبلی سے بلند تھے۔ اس کا ذکر متعدد نقادوں نے کیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ حالی کا دور نظری دور تھا اور وہ اس میں شبلی سے بلند ہیں، مگر شبلی کا دور عملی تنقید کے آغاز کا دور ہے اور سچ یہ ہے کہ اس عہد میں اس معاملہ میں شبلی کا بھی کوئی ہم پلہ نہیں۔ شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر عملی تنقید کے دو بہترین نمونے ہیں۔

سیاسی اور مذہبی لٹریچر دو علاحدہ علاحدہ پہلو ہیں۔ بلاشبہہ سیاسی لٹریچر میں مولانا آزاد کو فوقیت حاصل ہے مگر مذہبی لٹریچر میں بھی شبلی پر مولانا آزاد کو فوقیت دینا درست موقف نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خود مولانا آزاد نے شبلی کی مذہبی تصنیفات اور ان کی تحریک وقف علی الاولاد اور اشاعت اسلام وغیرہ کی بے حد تعریف کی ہے۔ غالباً شروانی صاحب کے پیش نظر شبلی کی یہ خدمات نہیں

تھیں۔ الفاروق، علم الکلام، سیرۃ النبی اور الندوہ کے مقالات، کیا ان کا کوئی جواب ہے؟ اس مذہبی لٹریچر کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اسی طرح نظریہ سیاست میں بھی شبلی پر آزاد کا تفوق تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد تو اسی سیاسی نقطہ نظر کے علم بردار تھے جو شبلی کا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سرسید کے اثر سے آزاد کو آزاد کرنے والے شبلی ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی آزاد کے لسان الصدق میں بھی ساتھ ہیں، پھر الندوہ میں بھی۔ الہلال کے زمانہ میں شبلی نے جو کچھ لکھا وہ جس نقطہ نظر کی چیزیں ہیں، اس سے اہل علم واقف ہیں۔ دراصل شروانی صاحب آزاد کے ایسے عاشق ہیں کہ ان کے سامنے ان کو کسی اور کی ادا بھاتی ہی نہیں۔ شروانی صاحب عمروں میں تفاوت کی بنا پر سرسید اور شبلی کے موازنہ کو بے جا بتاتے ہیں اور خود شبلی و آزاد کا موازنہ پیش کرتے ہیں، حالانکہ ان کی عمروں میں بھی تفاوت ہے۔

[۴]

شبلی علی گڑھ آ کر علامہ شبلی بنے۔ انہوں نے علی گڑھ سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کا اعتراف خود علامہ شبلی نے کیا ہے۔ پروفیسر شروانی نے بھی دھوپ چھاؤں میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ شبلی سے کالج کو بھی فائدہ پہنچا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ شبلی نے سرسید کی قیمتی لائبریری سے بہت استفادہ کیا تھا اور علی گڑھ کی آزاد خیالی کی فضا نے ان کے جوہر کو جلا بخشی تھی، لیکن انہوں نے یہ قرض مع سود کے ادا کر دیا تھا۔ انہوں نے کالج کی چہار گونہ خدمت انجام دی۔ صحیح اسلامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سیاسی بیدار مغزی کی بنیاد رکھی۔ عربی زبان و ادب کو فروغ دیا اور اپنی بیش بہا تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ اس کے علمی خزانے کو مالا مال کیا۔ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی رونق تھے، بلکہ ان کی جان ہوتے تھے۔'' (۵)

[۵]

شبلی نے علی گڑھ چھوڑا اور تحریک ندوہ میں شامل ہوئے تو انہیں بعض لوگوں نے علی گڑھ

تحریک ہی کا مخالف قرار دے دیا، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر شروانی نے کیسی صائب رائے دی ہے:

''کہا جاتا ہے کہ وہ [شبلی] علی گڑھ تحریک کے مخالف تھے اور یہی بات مولانا آزاد کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔ اس میں محض جزوی صداقت ہے۔ یہ دونوں بزرگ صرف اس تحریک کے سیاسی موقف سے متفق نہیں تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور علی گڑھ کے سیاسی موقف سے تو خود ایم اے او کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی کے متعدد طالب علموں نے بھی انحراف کیا۔ سرسید کے عہد میں سیاسی تقاضے جو بھی رہے ہوں، جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا علی گڑھ کی سیاست کا نقص واضح سے واضح تر ہوتا گیا۔ جس انحراف کی بنیاد علامہ شبلی کے تربیت یافتہ علی برادران اور حسرت موہانی نے رکھی تھی اس کا سلسلہ ہماری نسل تک دراز ہوا اور حصول آزادی کے بعد بھی قائم رہا۔''(۶)

[۶]

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی علی گڑھ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں، خاص طور پر اس کے اساتذہ اور تلامذہ اور ان کی کاوشوں کے لحاظ سے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''اگر مجھ سے کہا جائے کہ ایم اے او کالج کے سب سے ممتاز استاد اور سب سے نامور طالب علم کا نام بتاؤ تو میں بلا تامل کہوں گا کہ علامہ شبلی اور مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ شبلی کی عبقریت شبہے سے بالاتر ہے اور پروفیسر آل احمد سرور کی یہ رائے سراسر مبنی بر حقیقت ہے کہ اردو میں دانشور چار ہوئے ہیں، سرسید، علامہ شبلی، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد۔''(۷)

[۷]

علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات الکلام، علم الکلام پر اعتراضات بہت ہوئے اور اس کے جوابات بھی دیئے گئے۔ علماء بالخصوص مولانا عبدالحق حقانی کے حواریوں نے اس کے

بعض مباحث کی بنیاد پر ان کی تکفیر کی تھی اور جن خیالات کی بنیاد پر کفر ثابت کیا تھا علامہ شبلی نے اس سے انکار کیا اور بتایا کہ الکلام میں وہ مباحث دراصل میرے نہیں ملاحدہ کے ہیں۔ پروفیسر شروانی مدظلہ ان کتابوں کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس زمانے میں علامہ شبلی کی دو مزید تصانیف الکلام اور علم الکلام کا مطالعہ کیا۔ یہ اس وجہ سے کہ میرا ایک اختیاری مضمون فلسفہ تھا اور میں مفتی صاحب سے بھی علم کلام پڑھ رہا تھا۔ میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی کی ان تصانیف کا مطالعہ کر کے میرا رجحان معتزلہ کی طرف ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ایک عزیز کو لکھا تھا کہ اگر ہمارے پاس معتزلہ نہ ہوتے تو مستشرقین نے اسلام پر جو اعتراضات کئے ہیں، ان کا جواب دینے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ تھا۔'' (۸)

''دھوپ چھاؤں'' متنوع معلومات کا خزانہ ہے۔ ہم نے محض پروفیسر شروانی کی شبلی شناسی کا ذکر کیا ہے۔ کاش پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی سعی کرتے۔

حوالے

(۱) دھوپ چھاؤں ص۳۲
(۲) ایضاً ص۳۳
(۳) ایضاً ص۹۷
(۴) ایضاً ص۹۷
(۵) ایضاً ص۹۷
(۶) ایضاً ص۹۷-۹۸
(۷) ایضاً ص۹۸
(۸) ایضاً ص۹۸

(تصویر:مولانا اعجاز اعظمی)

[۲۴]

حکایت ہستی

• مولانا اعجاز احمد اعظمی

[مکتبہ ضیاء الکتب، شیخو پور ضلع اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء]

حکایت ہستی مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم [۱۹۵۱-۲۰۱۳ء] کی خودنوشت کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی تعلیم وتربیت اور شوق مطالعہ وکتب بینی کے احوال وکوائف قلم بند کئے ہیں۔ ابتداء سے اخیر یعنی تکمیل تک کے تمام مراحل تعلیم کو بالترتیب بیان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر جن کتابوں نے ان کے ذہن ووجدان کو متاثر کیا ان کا ذکر اوران کی خصوصیات حوالۂ قلم کی گئی ہیں۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی بڑے عالم ومصنف اور صاحب فضل وکمال اور صاحب زہد وورع وتقویٰ بزرگ تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع، نظر عمیق اور باریک بیں تھی۔ انہوں نے مدۃ العمر درس وتدریس، وعظ ونصیحت اور تصنیف وتالیف سے سروکار رکھا۔ مختلف موضوعات پر داد تحقیق و تصنیف دی۔ متعدد متنوع مضامین اور تقریباً دو درجن کتابیں سپرد قلم کیں۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ بے شمار تشنگان علم نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ ان کی ذاتی زندگی بھی بڑی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی۔ دیوبند میں تعلیم پائی تھی، مذاق بھی وہی تھا مگر ان کی محفل میں بیٹھ کر جی خوش ہوجاتا تھا۔ وسعت قلبی، اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کے اوصاف سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ حکایت ہستی اگرچہ ان کی ابتدائی اور تعلیمی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہے، تاہم اس میں بھی ان کی اخلاقی بلندی کے اوصاف نمایاں ہیں۔

علامہ شبلی نے تحریک ندوہ کی تعبیر وتشریح میں اپنے بعض خطوط میں دیوبند پر تنقید کی ہے۔ مولانا مرحوم نے ایک مضمون میں ان کا جائزہ لیا ہے اور یہ جائزہ انہوں نے دیوبند کا ترجمان بن کر پیش کیا۔ وہ اگر قومی وملی مفادات کے وسیع تناظر میں ان تنقیدوں کا تجزیہ کرتے تو انہیں بھی اپنا نقطہ نظر تبدیل کرنا پڑتا، جیسا کہ خود علامہ شبلی کو کرنا پڑا تھا۔ واضح رہے کہ علامہ شبلی کی تعلیم و تربیت بھی مولانا فاروق چریا کوٹی نے انہیں قدیم خطوط پر کی تھی۔ البتہ علامہ شبلی نے مختلف علوم و فنون کے ماہرین سے بھی استفادہ کیا تھا اور پھر سرسید کی صحبت اور علی گڑھ کی علمی فضا نے ان میں وسیع النظری پیدا کردی تھی۔ بہرحال مولانا اعجاز احمد اعظمی کی یہ تنقید اس وقت ضمنی ہوکر رہ جاتی ہے جب ان کی خودنوشت میں علامہ شبلی اور ان کی تصانیف پر ان کے والہانہ جذبات سامنے آتے ہیں۔ حکایت ہستی میں علامہ شبلی اور ان کی تصانیف کا چار مقامات پر ذکر آیا ہے۔ دو جگہ سیرۃ النبی کا ایک ایک جگہ مقالات شبلی اور حیات شبلی کا۔

[۱]

مولانا مرحوم نے اپنے مطالعہ کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''مبارک پور کی طالب علمی میں حیات شبلی پڑھی تھی، اس میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی کے مطالعہ کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی کتاب اول سے آخر تک نہ پڑھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر یہ طریقہ اختیار کروں تو ایک ہی کتاب میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ بے ترتیبی کے ساتھ ادھر ادھر اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے اور نہایت سرعت کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے، لیکن بایں ہمہ کتاب میں جو بہترین معلومات ہوتیں ان پر نگاہ پڑ جاتی اور ان معلومات پر اس قدر حاوی ہوجاتے کہ کتاب پر ریویو کرنے کے لئے بالکل تیار ہو جاتے۔ (۱) علامہ شبلی کے اس طریقہ مطالعہ نے میرے سرعت مطالعہ کی راہ ہموار کی۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کا مطالعہ کے باب میں میرے اوپر بڑا احسان ہے، ان کی زندگی سے، ان کی کتابوں سے اور ان کے مقالات سے

میں نے مطالعہ کرنا سیکھا۔ بات کو سمجھنا سیکھا۔ عمدہ طرز میں بیان کرنا اور لکھنا سیکھا، اللہ تعالی انہیں غریق رحمت کرے۔''(۲)

حکایت ہستی کے اس اقتباس سے کم از کم مجھ پر یہ راز عیاں ہوگیا کہ مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم کے اسلوب تحریر میں دلکشی اور دلآویزی کیوں کر پیدا ہوئی۔ علمائے دیوبند میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی علامہ شبلی کے طرز نگارش اور طریقہ تحقیق کی نہ صرف داد دی ہے بلکہ ان کے تتبع کا اعتراف بھی کیا ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

[۲]

مولانا اعجاز احمد اعظمی کو عشق نبویؐ کی دولت بچپن ہی میں مل گئی تھی، جب وہ ابتدائی درجات میں تھے۔ انہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ پھر یہ عشق ایسا پروان چڑھا کہ سیرت کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مطالعہ کیا۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی خود ایک عاشق رسول کا نذرانہ ہے۔ مولانا مرحوم نے سیرۃ النبیؐ سے عشق وعقیدت کی داستان بڑے دلچسپ انداز میں قلم بند کی ہے۔ سیرۃ النبی کی خریداری اور شوق واہتمام ملاحظہ ہو:

> ''میں نے سیرۃ النبی کا زیادہ تر حصہ اس سال پڑھ لیا تھا۔ تیسرا اور چوتھا حصہ جس کی بڑے سائز میں عمدہ دبیز کاغذ پر طباعت ہوئی تھی، جلی حروف، روشن ورق، بہت دیدہ زیب، لیکن مدرسہ کا مملوکہ نسخہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پوری کتاب خریدلوں۔ اس وقت تمام حصوں کی قیمت بغیر جلد کے نوے روپے تھی۔ مبارک پور کے ایک جلد ساز تھے، ان کے پاس سیرۃ النبی تھی۔ انہوں نے مجھے آدھی قیمت پر دینا منظور کرلیا۔ والد صاحب سے میں نے عرض کیا، انہوں نے قدرے توقف کے بعد اجازت دے دی۔ میں نے کتاب خرید لی۔ یہ امتحانی دور تھا، تیاریاں چل رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ خوب صورت جلد باندھئے اور امتحان ختم ہونے سے پہلے مجھے نہ دیجئے، ورنہ اس کی مشغولیت امتحان کی تیاری میں رکاوٹ بن جائے گی۔

انہوں نے بہت اہتمام سے خوب صورت جلد باندھی اور جب مدرسہ میں تعطیل ہوگئی اور میں گھر جانے لگا تو انہوں نے مجھے کتاب حوالہ کی۔'' (۳)

عالم سرخوشی اور وفور جذبات دیکھیں :

''اب یہ میری کتاب تھی، اس وقت سرخوشی کا جو عالم تھا مت پوچھئے، جیسے دولت فراواں حاصل ہوگئی۔ انہیں گھر لے گیا اور از سرنو مطالعہ شروع کیا۔ مجھے جلد اور تیز پڑھنے کی مشق تھی۔ میں ہر روز ایک جلد مکمل کرلیا کرتا۔ ہر وقت پڑھتا رہتا، نماز اور رفع ضروریات کا وقت مستثنیٰ تھا۔ کھاتے وقت مطالعہ جاری رہتا۔ جب تک پوری کتاب ختم نہ ہوئی آنکھیں نیند سے آشنا نہ ہوئیں، اس وقت جاگنے کی بھی خوب مشق تھی۔

چھ دن میں چھ جلدیں پوری ہوگئیں۔ خاص خاص مضامین پھر دہرانے لگا۔ ایک طالب علم نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ اس کے لئے چند تقریریں لکھ دوں۔ سیرۃ النبی سے اخذ کر کے متعدد موضوعات پر آدھ آدھ گھنٹے کی چھ سات تقریریں بھی لکھیں۔'' (۴)

یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا گیا کہ مولانا مرحوم کو طالب علمی میں سیرۃ النبی کے مطالعہ کا کس قدر شوق تھا اور انہوں نے سیرۃ النبی کا کس طرح مطالعہ کیا، واضح ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی یوں ہی پر عظمت نہیں ہوتا مولانا اعجاز احمد اعظمی مرحوم کی عظمت کا شاید یہی راز بھی تھا۔

[۳]

ایک اور مقام پر مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ انہوں نے سیرۃ النبی شبلی وسلیمان کا مطالعہ اس طرح کیا جس طرح تلاوت کی جاتی ہے۔ (۵)

[۴]

علامہ شبلی کے علمی وادبی اور تاریخی مقالات نے بہت سے اہل علم کو متاثر کیا۔ خاص طور پر ان کے طرز تحریر، طریقہ استدلال اور منطقی اسلوب وانداز نے مقالہ نگاری کی دنیا میں ایک

انقلاب برپا کردیا تھا۔مولانا اعجاز احمد اعظمی بھی اس سے متاثر ہوئے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی کے مقالات کا وہ حصہ جو منطقی مبحث پر مشتمل ہے، بار بار پڑھا۔''(۶)

یہ خوبیاں مولانا مرحوم کی تحریروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ان کا انداز بھی منطقی اور طرز استدلال کاٹ دار ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے انداز نگارش میں بڑی شستگی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔راقم کا خیال ہے کہ یہ سب علامہ شبلی کی کتابوں کے مطالعے اور ان کے اسلوب نگارش کے اثرات ہیں۔

حوالے

(۱) حیات شبلی ص۵۹۹

(۲) حکایت ہستی ص۲۱۶-۲۱۷

(۳) ایضاً ص۱۲۱

(۴) ایضاً ص۱۲۱-۱۲۲

(۵) ایضاً ص۲۶۶

(۶) ایضاً ص۱۸۹

(تصویر مولانا عمران خاں ندوی)

[۲۵]

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں

• مولانا محمد عمران خان ندوی
[معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۴۶ء]

ندوۃ العلما کا ترجمان ماہنامہ الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں علامہ شبلی نعمانی کی ادارت میں نکلا اور بہت جلد علمی حلقوں کا نورِ نظر بن گیا۔ اس سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے حیات شبلی [مطبوعہ: ۱۹۴۳ء] میں اس کی تاریخ، خدمات اور اثرات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مئی ۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی اس کی ادارت سے مستعفی ہوئے اور پھر وہ کچھ دن کے بعد آسمان صحافت سے مٹ گیا۔ دوبارہ مولوی اکرام اللہ خاں ندوی نے ادارت سنبھالی مگر وہ سنبھل نہ سکی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۱۳-۱۹۹۹ء] اور مولانا عبدالسلام قدوائی [۱۹۰۶-۱۹۷۹ء] کے ادارت میں جنوری ۱۹۴۰ء میں تیسری بار جاری ہوا اور بڑے عمدہ مشمولات کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا مگر یہ بھی شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔ البتہ اس جدید اجراء میں مولانا ضیاء الحسن علوی [م: ۱۴؍ جون ۱۹۴۵ء] کی ''یاد ایام'' کی اشاعت اور ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' کے سلسلے زیادہ مقبول ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں دارالعلوم ندوہ کے ناظم مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری [م: ۲۲؍ اکتوبر ۱۹۸۶ء] نے افادیت کے پیش نظر اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں مجلس نشریات اسلام کراچی نے بھی شائع کیا۔ ۲۰۱۳ء میں مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے تعلیقات وحواشی کے ساتھ ایک اور ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اس میں مولانا نے بڑی محنت وتحقیق سے بڑے معلومات افزا حواشی کا اضافہ کیا

ہے۔اس کے لئے وہ اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں بڑا وقیع سلسلہ تھا۔اس میں اس وقت کے متعدد اہل علم و ادب اور ارباب دین و دانش نے اپنے اپنے مضامین میں ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جن سے وہ متاثر ہوئے یا جن کتابوں نے ان کے قلب ونظر کو نور بخشا۔ یہ علمی وتعلیمی مضامین بنیادی طور پر آپ بیتی ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔اس لئے ان کا مطالعہ ضروری خیال کیا گیا اور بڑی بات یہ ہے کہ اس میں کل ۱۹ارتحریریں شامل ہیں اور بیشتر تحریروں میں علامہ شبلی کی عظیم الشان علمی وتحقیقی، تاریخی اور تنقیدی کتابوں سے متاثر ہونے کا ذکر واعتراف موجود ہے۔اس سے جہاں شبلی اور تصانیف شبلی کی عظمت ظاہر ہوتی ہے وہیں اثرات شبلی کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں علی الترتیب ان قدر شناسان شبلی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

[۱]

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۷-۱۹۵۰ء] تحریک ندوہ کے ممتاز فرد تھے اور علم و دانش میں اپنے عہد میں منفرد مقام رکھتے تھے۔انہوں نے متعدد علمی و دینی کتابیں لکھیں، شعر و ادب کا بھی بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ان کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے۔شروانی صاحب علامہ شبلی کے خاص احباب میں ہیں اور دونوں کے آخری دم تک انتہائی خوش گوار تعلقات رہے۔الندوہ انہیں دونوں کی مشترکہ ادارت میں نکلا تھا۔بعض کتابوں کی تصنیف میں انہوں نے علامہ سے مشورے کئے، انہوں نے علامہ شبلی کی کئی کتابوں پر مفصل تبصرے لکھے۔ان کی وفات پر بھی بڑا مفصل مقالہ لکھا۔ان کی یہ تمام تحریریں مقالات شروانی میں شامل ہیں۔مکاتیب شبلی میں ان کے نام شبلی کے ۱۱۸رخطوط اور مکتوبات شبلی میں ۲۴رخطوط شامل ہیں۔ بعد میں چند اور خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔ان سے دونوں کے نہ صرف گونا گوں تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ علمی، فکری اور ادبی موضوعات میں افادہ واستفادہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔دونوں کے ربط وتعلقات پر ہمارے دوست ڈاکٹر عطا خورشید نے معارف کے شبلی نمبر [نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء] میں بہت عمدہ مقالہ لکھا ہے۔زیر نظر کتاب میں پہلا مضمون انہیں کے قلم سے ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''بڑی صحبت مولانا شبلی صاحب مرحوم کی صحبت تھی، یہ موصوف کے ورودعلی گڑھ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سب سے پہلے میں نے موصوف کوکشتی کے اکھاڑے میں دیکھا تھا۔ ہرصحبت میں ادبی و تاریخی تذکرے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، شعرالعجم کا مطالعہ کیا،تبصرے لکھے۔ان کتابوں کے مطالعے میں کلام کی برجستگی،مورخانہ بیان اور وقائع نگاری کی قوت نے خصوصاً دل پر اثر ڈالا۔''(۱)

[۲]

جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے بھی اپنی محسن کتابوں پرلکھا ہےاور جگہ جگہ مولانا شبلی کا ذکر کیا ہے۔ایک جگہ ابن خلکان کے مطالعہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نے ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد کے سفر سے واپس آکر مجھے اس کے انگریزی یا فرنچ مترجم کا جب ایک تبصرہ دیا اور تعریف فرمائی کہ دیکھو یورپین کس وقعت سے کسی کتاب کو دیکھتے ہیں تو میرے دل میں ایک ٹھیس لگی اور میں نے ابن خلکان پر ایک تبصرہ لکھ کر پیش کیا جو الندوہ میں چھپا۔''(۲)

سید صاحب نے اپنے کلامی ذوق کے بارے میں لکھا ہے کہ علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ان کی تصنیفات پڑھیں۔ان کی حوالہ دی ہوئی کتابیں دیکھیں۔(۳) اور پھر اپنے قرآنی علوم ومعارف سے دلچسپی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''سب سے آخری جلوہ قرآن پاک کا نظر آیا۔مولانا شبلی مرحوم نے اس کا آغاز کیا۔مولانا حمیدالدین مرحوم کی دلچسپ ومفید صحبتوں میں یہ چسکا اور آگے بڑھتا گیا اور اسی کا یہ اثر ہوا کہ سیرت نبویؐ کی ہر بحث میں قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث نبویؐ اس کے نقش ونگار ہیں۔''(۴)

[۳]

مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲ - ۱۹۷۷ء] تو شیدائی شبلی تھے۔آپ بیتی میں

انہوں نے جا بہ جا اس شیفتگی کا ذکر کیا ہے جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ اس مضمون میں بھی انہوں نے بعض باتیں دہرائی ہیں۔ علامہ شبلی سے اپنی ابتدائی واقفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''۱۹۰۷ء میں نیاز ''مقالات شبلی'' اور ''الکلام'' سے حاصل ہوا، اور اسی دم سے جادو مولانا شبلی کا چل گیا۔ تلاش ان کی اور ان کی تحریروں کی ہوئی، انہیں پڑھتا نہ تھا تلاوت کرتا تھا۔ الندوہ والد مرحوم کے نام جاری کرایا۔ پرانا پرچہ سناتا، فقرے کے فقرے حفظ ہوگئے، ترکیبیں زبان پر چڑھ گئیں۔ ہم سنوں سے کہتا پھرتا بلکہ لڑتا پھرتا کہ علامہ شبلی اس دور کے مجدد ہیں۔'' (۵)

مولانا ایک زمانہ میں انگریزی تعلیم اور فلسفہ کے زیر اثر الحاد کی طرف مائل ہوگئے تھے۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبیؐ نے ان کی قلب ماہیت کی۔ وہ اپنے الحاد کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''ہاں اسی درمیان مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی جلد اول شائع ہو چکی تھی۔ اسے خوب غور سے پڑھا تھا اور اس سے بھی یہ اثر قبول کیا تھا۔ صاحب سیرت کی رسالت پر ایمان تو اب بھی دور کی چیز تھی، لیکن مارگولیس وغیرہ کے اثر سے نعوذ باللہ جو ایک خداع اور خونخوار سردار کا تصور قائم ہو گیا تھا، آنکھوں سے یہ زنگ اسی سیرت کے مطالعہ کی برکت سے کٹ چکا تھا اور اس کی جگہ ایک خوش نیت مصلح قوم کے تخیل نے لے لی تھی۔'' (۶)

[۴]

میاں بشیر احمد [۱۸۹۳-۱۹۷۱ء] بی اے آکسن، بیرسٹر، مدیر ہمایوں لاہور بڑے پایہ کے شخص اور ممتاز اہل قلم تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں کچھ عرصہ تاریخ کے استاد رہے۔ کئی کتابیں لکھیں، ان میں ''مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' اور ''طلسم خیال'' نے بڑی مقبولیت پائی۔ انگریزی میں اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی سوانح بھی لکھی۔ ۳۵ برس [۱۹۲۲-۱۹۵۷ء] تک ہمایوں کو جاری رکھا، جس نے علم و ادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ وہ الفاروق سے بے حد

متاثر تھے۔انہوں نے اپنے مضمون میں اس کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''وہ کتاب جس نے اوائل عمر میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ڈالا شبلی کی الفاروق تھی۔اسلام، تاریخ، کہانی، سیاست، راست بازی، اس میں یہ سب کچھ تھا، گویا لڑکپن میں مجھے ایک رہنما مل گیا۔ میں نے جانا بس یہی اسلام ہے۔ برسوں گذر گئے، کئی مرتبہ الحاد نے کامیابی کے ساتھ میرے دماغ پر حملہ کیا، لیکن دل جس الفاروقی رنگ میں پہلی عمر میں رنگا جا چکا تھا وہ رنگ کچھ نہ کچھ باقی رہا۔ایک تو عمر ایسی تھی کہ جو اثر پڑا وہ مٹ نہ سکا اور دوسرے کتاب بھی ایسی عظیم الشان تھی کہ جب میرے ایک دہلوی ادیب دوست نے اس پر دو سال ہوئے نکتہ چینی کی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ سیرۃ النبیؐ پڑھنے کے بعد بھی میری پسند کی کتاب الفاروق ہی رہی۔ حضرت عمرؓ کا وہ صحرا میں اپنے غلام کو اونٹ پر بیٹھا کر اس کے آگے آگے چلنا، وہ راتوں کو گشت کرنا، وہ ایک بڑھیا کا دلیری سے کہنا **اتق اللّٰہ یا عمرؓ**، اسلام کا وہ دو بڑی سلطنتوں پر چھا جانا، ان کا اثر آج تک طبیعت سے زائل نہیں ہوا۔''(۷)

[۵]

پروفیسر بدرالدین علوی [۱۸۹۳ - ۱۹۶۵ء] سابق استاذ شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بڑے پایہ کے شخص تھے۔انہیں مولوی لطف اللہ علی گڑھی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔انہوں نے اپنی مطالعاتی زندگی میں متعدد کتابوں کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے۔اس میں اولاً علامہ شبلی کے سفرنامہ روم ومصر وشام کا ذکر ہے۔ثانیاً ماہنامہ الندوہ ودیگر کتابوں کے مطالعہ کا۔انہوں نے صراحت سے لکھا ہے کہ سفرنامہ کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف بھی دلچسپی سے پڑھیں۔(۸)

[۶]

مولانا سید طلحہ ایم اے [۱۸۹۰-۱۹۷۰ء] پروفیسر اورینٹل کالج لاہور بڑے عالم فاضل

شخص تھے۔ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر عبور تھا، والی بھوپال کی فرمائش پر سیرت ام المومنین حضرت ام سلمہؓ لکھی۔ انہیں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار بکثرت یاد تھے۔ انہوں نے اپنی شعرفہمی کے ذکر میں ان کتابوں کی فہرست درج کی ہے جنہوں نے ان کی شعرفہمی میں اہم رول ادا کیا، اس میں شعرالعجم کا نام بھی شامل ہے بلکہ انہوں نے صراحت سے لکھا ہے کہ شعرالعجم نے مجھے سب سے زیادہ فائدہ پہونچایا۔(۹)

[۷]

مولانا سعید احمد اکبرآبادی [۱۹۰۸- ۱۹۸۵ء] کا اسم گرامی علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے میدان میں ممتاز و مشہور ہے۔ ان کی غبار کارواں کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں تصانیف شبلی کے اثرات کا فراخدلی سے اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''مولانا شبلی کی کتابوں میں سب سے پہلے غالباً میں نے المامون اور الغزالی پڑھیں۔ مولانا کے انداز نگارش، طرز تحقیق اور طریقہ بحث نے دل پر عجیب اثر کیا اور میں مولانا کی تحریروں کا ایسا گرویدہ ہوگیا کہ میں نے آپ کی سب کتابیں خریدکیں اور پڑھیں۔ الفاروق اور سیرۃ النبیؐ جلد اول کئی بار پڑھیں اور ان دونوں کتابوں کے مقدمے تو خدا جانے کتنی مرتبہ پڑھے ہیں، ٹھیک سے یاد بھی نہیں۔''(۱۰)

مولانا اکبرآبادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا شبلی مرحوم ہی نے سنجیدہ علمی ذوق کی طرح ڈالی۔(۱۱)

[۸]

پروفیسر سید نواب علی [۱۸۷۷-۱۹۶۱ء] سابق وزیر تعلیم ریاست جونا گڑھ، استاد، اہل قلم اور مصنف تھے۔ ان کے قلم سے متعدد مضامین اور کتابیں نکلیں۔ سیرۃ المصطفیٰؐ، معارج الدین اور تاریخ صحف سماوی ان کی معروف کتابیں ہیں۔ ان کی تعلیم کننگ کالج لکھنؤ میں ہوئی

تھی، اس زمانہ میں وہ علامہ شبلی کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ماہنامہ الندوہ میں مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں دیگر کتابوں کے ساتھ علامہ شبلی کی الکلام اورالغزالی اور رسائل شبلی سے مستفید اور متاثر ہونے کا ذکر صراحت سے کیا ہے۔ پھر علامہ شبلی کی تصانیف اور خود ان سے اپنی گرویدگی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''۱۹۰۳ء میں جب میرا تقرر بڑودہ کالج میں ہوگیا تو سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر دس مضامین سیرۃ المصطفٰے کے نام سے لکھنا شروع کئے۔ اس زمانے میں مولانا شبلی بڑودہ تشریف لے گئے اور جسٹس عباس طیب جی مرحوم کے بنگلہ پر پہلی ملاقات ہوئی۔ مولانا کی تصانیف مجھے پہلے ہی گرویدہ کر چکی تھیں۔ اب ان کے حسن اخلاق نے لطف تقریر، ذوق سخن اور تبحر علمی نے اور بھی گرویدہ کر لیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تعطیلوں میں جب بھوپال جاتا تھا تو منشی منصب علی صاحب کے مکان پر مولانا سے اکثر ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔'' (۱۲)

اس اقتباس سے ان کی شیفتگی شبلی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ علامہ شبلی بڑودہ میں عباس طیب جی اور بھوپال میں منشی منصب علی کے یہاں قیام کرتے تھے۔ جسٹس عباس طیب جی، بدرالدین طیب جی کے داماد تھے۔ پروفیسر سید نواب علی یہاں بھی شریک بزم ہوتے تھے۔ (۱۳)

۱۹۰۷ء میں پروفیسر سید نواب علی نے سیرت پر ایک کتاب سیرۃ المصطفٰے لکھی، علامہ شبلی نے اس کا تذکرہ الندوہ کے شذرات میں کیا اور لکھا کہ:

ہمارے دوست مولوی نواب علی صاحب ایم اے پروفیسر بڑودہ کالج نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اردو زبان میں سوانح عمری لکھی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ جس جوش عقیدت سے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے اس سے ایک پرانے مولوی کی شان نظر آتی ہے۔ ہم اس کے نہایت معترف

ہیں، لیکن ایک ایم اے سے ہم اس بات کے متوقع تھے کہ یورپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت جو بے شمار کتابیں لکھی ہیں ان پر بھی نظر ہوتی اوران سے بحث کی جاتی۔ بہرحال ہم اپنے دوست کے پھر بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے ہم عصروں سے بڑھ کر کام کیا ہے۔''(۱۴)

اس تبصرے کا یہ اثر ہوا کہ پروفیسر سید نواب علی نے ایک اور کتاب قلم بند کی، وہ خود لکھتے ہیں:

''تذکرۃ المصطفیٰ سنہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوگئی تو مولانا (شبلی) کا یہ ناقدانہ فقرہ کہ ''کتاب پرانے رنگ میں اچھی ہے، مگر ایک نئے تعلیم پائے ہوئے سے کچھ اور ہی امید ہے''۔تازیانہ کا کام کر گیا اور میں نے فلسفہ اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، خصوصاً، اسپنسر، ڈارون، ہکسلے، ہیگل، الیور لاج، ویلس، ہافڈنگ اور برگس کی تصانیف پر غور کرتا رہا، پھر معارج الدین کا حصہ اول شائع کیا، مگر افسوس مولانا اسی سال، رحلت فرما چکے تھے۔''(۱۵)

پروفیسر نواب علی بڑودہ کالج میں ۲۶ سال پروفیسر رہے، اس دوران علامہ شبلی کئی بار وہاں تشریف لے گئے، ان سے خط وکتابت بھی رہی۔ان کے نام مکاتیب شبلی میں علامہ شبلی کے پانچ خطوط شامل ہیں۔

ان کے انتقال سے ایک سال پہلے ڈاکٹر ابن فرید[۱۹۲۵-۲۰۰۳ء] نے ماہنامہ ادیب علی گڑھ کا شبلی نمبر شائع کیا تو اس میں ایک مضمون ''شبلی کی رومانی زندگی'' کے عنوان سے لکھ کر امین زبیری اور مولوی عبدالحق کا جواب دیا اور اس بات پر تاسف کیا ہے کہ:

''علامہ شبلی مرحوم کے دینی، قومی اور ادبی کارنامے کس قدر قابل قدر اور سبق آموز ہیں، لیکن پچھلے چند سال سے ان کی رومانی زندگی کا راگ الاپا جا رہا ہے۔''(۱۶)

[۹]

مولانا عبدالسلام ندوی[۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] یگانہ روزگار شخص تھے۔ایک بلند مرتبہ مصنف ،ادیب وانشاپرداز کی حیثیت سے ان کا نام مسلم ہے۔وہ علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنی مطالعاتی زندگی کے ذکر میں علامہ شبلی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ میرے ہم وطن تھے اور میں ان کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا شبلی کو میں نے سب سے پہلے کان پور میں دیکھا اور ان کی مختصر تقریر سنی،لیکن اب تک ان کی کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ (۱۷)اسی زمانہ میں الفاروق شائع ہوئی اور ان کے بہنوئی مولوی محبوب الرحمٰن کلیم کے پاس ریویو کے لئے آئی تو انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ:

''یہ پہلا دن تھا کہ دور جدید کی تصنیفات میں ہندوستان کے سب سے بڑے مورخ اور ادیب کی ایک ممتاز تصنیف میری نظر سے گذری۔اسی زمانہ میں رسائل شبلی کا مجموعہ بھی شائع ہوا اور میں نے اس کو بھی بہ شوق پڑھا۔''(۱۸)

مولانا عبدالسلام ندوی ندوہ کے ممتاز فرزند تھے۔علامہ شبلی ہی کی کشش سے ندوہ آئے اور ۱۹۱۰ء میں فراغت پائی۔(۱۹)

انہوں نے اپنے مضمون میں اپنے معاصر مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔خاص طور پر فلسفہ اجتماع اور فلسفہ جذبات،تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ کو انہوں نے باعتبار مضامین اور باعتبار طرز تحریر پسند کیا ہے اور اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ:

''یہ کتابیں مادہ اور صورت دونوں کے لحاظ سے مولانا شبلی کی تصنیفات کا عکس ہیں۔اس لئے ہم اور وہ دونوں ایک ہی چراغ کے پروانے ہیں۔''(۲۰)

مولانا عبدالسلام ندوی نے پوری زندگی دارالمصنّفین میں گذاری اور مدۃ العمر فکر شبلی کے شارح وترجمان بنے رہے۔انہوں نے علامہ کی زندگی ہی میں شعرالعجم پر مفصل تنقید لکھی تھی جسے علامہ نے الندوہ میں شائع کیا۔ایک مبسوط مضمون ان کے اسلوب نگارش پر لکھا ہے جو

ادیب کے شبلی نمبر میں شامل ہے۔حیات شبلی کا آغاز انہیں کے قلم سے ہوا تھا مگر پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے جسے بالآخر جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے قلم بند کیا۔

[۱۰]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [۱۹۱۳ - ۱۹۹۹ء] کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، وہ عالم اسلام کے مایہ ناز اہل قلم اور مصنف تھے۔انہوں نے بھی الفاروقؓ سے کسی قدر متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ:

''انہیں دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق آ گئی۔مطبع نامی کان پور کی چھپی ہوئی۔سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں، بویب، حسیر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے۔شاید اس سے زیادہ اثر فردوسی، شاہنامہ میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا۔الفاروق کے جان دار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر و سناں کا کام کرتے ہیں۔مولانا نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثیر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔''(۲۱)

ان چند ناموران علم وادب کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی، ان کی تصنیفات اور خیالات کا دائرہ کس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے۔

حوالے

(۱) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص۴

(۲) ایضاً ص۱۰

(۳) ایضاً ص۱۱

(۴) ایضاً ص۱۲

(۵) ایضاً ص۱۴-۱۵

(۶) ایضاً ص۱۷

(۷) ایضاً ص۵۳

(۸) ایضاً ص۵۶-۵۷

(۹) ایضاً ص۶۷

(۱۰) ایضاً ص۷۱

(۱۱) ایضاً ص۷۲

(۱۲) ایضاً ص۷۹

(۱۳) ادیب شبلی نمبر ص۴۰۵

(۱۴) الندوہ جون ۱۹۰۸ء، بحوالہ شذرات شبلی ص۱۰۲-۱۰۳

(۱۵) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص۹۷

(۱۶) ادیب شبلی نمبر ص۴۰۴

(۱۷) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص۱۱۷

(۱۸) ایضاً ص۱۱۷

(۱۹) ایضاً

(۲۰) ایضاً ص۱۲۰

(۲۱) ایضاً ص۱۶۱

کتابیات

کتابیات

*** کتب**

۱۔ آپ بیتی، خواجہ حسن نظامی، دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۲۲ء، طبع دوم

۲۔ آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۸۹ء

۳۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء

۴۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۵۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء

۶۔ آشفتہ بیانی میری، رشید احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، طبع سوم ۱۹۷۷ء

۷۔ ابوالکلام، شورش کاشمیری، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

۸۔ اتالیق خطوط نویسی، خواجہ حسن نظامی، درویش پریس دہلی، ۱۹۱۶ء

۹۔ اختر اقبال، سلطان جہاں بیگم، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۴ء

۱۰۔ اردو خودنوشت فن و تجزیہ، وہاج الدین علوی، دہلی، ۱۹۸۹ء

۱۱۔ اردو میں خواتین کی خودنوشت سوانح عمریاں، ڈاکٹر شبانہ سلیم، باب العلم پبلی کیشنز بھوپال، ۲۰۱۵ء

۱۲۔ اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

۱۳۔ اسفار مجیب، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۱۴۔ اسوۂ حسنہ، مولانا مجیب اللہ ندوی، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، ۲۰۰۰ء

۱۵۔ اعمال نامہ، سر رضا علی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۲ء
۱۶۔ افکار مجیب، مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۱۷۔ البرامکہ، عبدالرزاق کانپوری، نامی پریس کان پور، ۱۸۹۷ء
۱۸۔ انشائے ماجدی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کلکتہ، ۱۹۹۱ء
۱۹۔ بزم اشرف کے چراغ، پروفیسر احمد سعید، دارالکتاب دیوبند، ۱۹۹۷ء
۲۰۔ بیاد شبلی، ڈاکٹر علاء الدین خاں، آبجیکٹو اسٹڈیز دہلی، ۲۰۱۷ء
۲۱۔ پرانے چراغ حصہ دوم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس لکھنؤ، ۱۹۸۰ء
۲۲۔ پیام کیف، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء
۲۳۔ تاثرات، ملا واحدی، مرتبہ حکیم محمد سعید، ہمدرد اکیڈمی کراچی، ۱۹۷۰ء
۲۴۔ تاریخ ندوۃ العلما، حصہ اول، مولانا اسحاق جلیس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
۲۵۔ تاریخ ندوۃ العلما، حصہ دوم، شمس تبریز خاں، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
۲۶۔ تذکرہ، مولانا ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکیڈمی دہلی، ۲۰۱۲ء
۲۷۔ تذکرہ ماہ وسال، مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۱ء
۲۸۔ چند رجال اہل حدیث، مولانا ابوعلی اثری، ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ، ۱۹۸۶ء
۲۹۔ حکایت ہستی، مولانا اعجاز احمد اعظمی، مکتبہ ضیاء الکتب اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
۳۰۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
۳۱۔ خاطرات، ظفر حسن ایبک، سنگ میل پبلی کیشن لاہور، ۱۹۹۰ء
۳۲۔ خرمن گل، نواب سید علی حسن خاں، مطبع قومی لکھنؤ
۳۳۔ خطبات شبلی، مولانا عبدالسلام ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء
۳۴۔ خطوط شبلی بنام آزاد، محمد حسنین، بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، ۱۹۸۸ء
۳۵۔ خطوط محمد علی، محمد سرور، برقی پریس، دہلی، ۱۹۴۰ء

۳۶۔ خطوط مشاہیر، مولانا عبدالماجد دریابادی، نسیم بکڈ پو، لکھنؤ
۳۷۔ دھوپ چھاؤں، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء
۳۸۔ سخنوران کاکوری، حکیم نثار احمد علوی، میخانہ ادب کراچی، ۱۹۷۸ء
۳۹۔ سرسید اوران کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۴ء
۴۰۔ سرگذشت ایام، حافظ نذر احمد، مسلم اکادمی لاہور، ۲۰۱۵ء
۴۱۔ شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۴۲۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۴۳۔ شبلی شکنی کی روایت، ڈاکٹر خالد ندیم، نشریات لاہور، ۲۰۱۷ء
۴۴۔ شبلی شناسی کے سوسال، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۴۵۔ شبلی کی آپ بیتی، ڈاکٹر خالد ندیم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۴۶۔ شخصیات، سید محمود الحسینی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال، ۱۹۸۲ء
۴۷۔ شذرات سلیمانی حصہ اول، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء
۴۸۔ شذرات سلیمانی حصہ دوم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۷ء
۴۹۔ شذرات سلیمانی حصہ سوم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۸ء
۵۰۔ شذرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۵۱۔ عظمت رفتہ، ضیاءالدین احمد برنی، ادارہ علم وفن کراچی، ۲۰۰۰ء
۵۲۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
۵۳۔ علامہ محمد فاروق چریاکوٹی اوران کے تین عظیم بیٹے، مولانا افروز قادری، چریاکوٹ مئو، ۲۰۱۶ء
۵۴۔ کاروان زندگی (اول تا ہفتم) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام لکھنؤ
۵۵۔ کتاب نامہ شبلی، اختر راہی، مسلم اکادمی لاہور، ۱۹۸۱ء
۵۶۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
۵۷۔ کتابیات مجیب، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۵۸۔ گوہرِ اقبال، حصہ اول، سلطان جہاں بیگم، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۳ء

۵۹۔ مآثر صدیقی، نواب سید علی حسن خاں، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۲۴ء

۶۰۔ متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

۶۱۔ مجالس حسنہ، مرتبہ مولانا محمد فیصل بھٹکلی ندوی، ادارہ احیائے علم ودعوت لکھنؤ، ۲۰۱۱ء

۶۲۔ مذہب اور سائنس، مولانا عبدالباری ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۹۱ء طبع سوم

۶۳۔ مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۱۶ء

۶۴۔ مشاہدات وتاثرات، شیخ محمد عبداللہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۱۵ء

۶۵۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا محمد عمران خان ندوی، لکھنؤ، ۱۹۴۶ء

۶۶۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مولانا عمران خاں ندوی، ترتیب جدید مولانا فیصل احمد ندوی، ادارہ احیائے علم ودعوت لکھنؤ، ۲۰۱۳ء

۶۷۔ مشاہیر کے خطوط بنام سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء

۶۸۔ مضامین الندوہ، مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، یورپ اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

۶۹۔ مضامین رشید، رشید احمد صدیقی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۷ء

۷۰۔ مطالعات شبلی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

۷۱۔ معارف سلیمان نمبر، شاہ معین الدین احمد ندوی، مئی ۱۹۵۵ء

۷۲۔ معارف شبلی نمبر، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، نومبر دسمبر ۲۰۱۴ء

۷۳۔ معاصرین، مولانا عبدالماجد دریابادی، ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ، ۱۹۷۹ء طبع اول

۷۴۔ مقالات احسان، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء

۷۵۔ مقالات شبلی جلد ہشتم، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۰ء

۷۶۔ مقالات شروانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، شروانی پریس علی گڑھ، ۱۹۴۶ء

۷۷۔ مکاتیب شبلی اول، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۷۸۔ مکاتیب شبلی دوم، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۷۹۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۸۰۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت پر مولانا شبلی کے اثرات، پروفیسر محسن عثمانی، حیدرآباد، ۲۰۱۳ء

۸۱۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی احوال وآثار، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء

۸۲۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۵ء

۸۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادی خدمات وآثار، مولانا عطاالرحمٰن قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۶ء

۸۴۔ مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے، محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۱۹۶۲ء

۸۵۔ میرا افسانہ، ملا واحدی، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ۲۰۱۵ء

۸۶۔ میری کہانی میری زبانی، سید ہمایوں مرزا، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء

۸۷۔ میں اور میری ادبی صلاحیت، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء

۸۸۔ نالہ دل، نواب سید علی حسن خاں، مطبع قومی لکھنؤ

۸۹۔ نقوش زندگی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۹۰۔ نواب سلطان جہاں بیگم، ڈاکٹر رضیہ حامد، بھوپال، طبع دوم ۲۰۱۱ء

۹۱۔ نوادرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

۹۲۔ نیا دور لکھنؤ، محمد علی جوہر نمبر، فروری تا اپریل ۲۰۰۵ء

۹۳۔ وفیات معارف، ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، جون ۲۰۱۳ء

۹۴۔ یادایام،مولانا ضیاءالحسن علوی،ادارہ انیس اردوالہ آباد،۱۹۵۹ء
۹۵۔ یادایام،عبدالرزاق کانپوری،آتش فشاں پبلی کیشن لاہور،۱۹۹۳ء
۹۶۔ یادرفتگاں،مولانا سید سلیمان ندوی،دارالمصنّفین،اعظم گڑھ،۱۹۹۳ء

*** رسائل**

۹۷۔ آج کل،دہلی،مارچ ۱۹۷۱
۹۸۔ الجمیعۃ،دہلی،جنوری تا جولائی،۱۹۶۸ء
۹۹۔ الندوہ اپریل،۱۹۱۰ء
۱۰۰۔ ادیب،علی گڑھ،شبلی نمبر،۱۹۶۰ء
۱۰۱۔ تحریر دہلی،مالک رام،علمی مجلس دلی،جولائی تاستمبر ۱۹۷۸ء
۱۰۲۔ خضر راہ،لکھنؤ،شبلی نمبر،۱۹۳۰ء
۱۰۳۔ لسان الصدق،اپریل مئی ۱۹۰۵ء
۱۰۴۔ مجلّہ دستاویز دوحہ دہلی،مدیر اعلی عزیز نبیل،۲۰۱۶ء
۱۰۵۔ ماہنامہ معارف: جولائی ۱۹۴۵ء،جنوری ۱۹۳۷ء،فروری ۱۹۳۷ء،مارچ ۱۹۳۷ء، اپریل ۱۹۳۷ء،مئی ۱۹۳۷ء،جون ۱۹۳۷ء،اکتوبر ۱۹۵۷ء،جولائی ۱۹۶۵ء،جولائی ۱۹۸۵ء

مصنف کی دیگر مطبوعات

شبلی شناسی

۱۔ متعلقات شبلی

۲۔ کتابیات شبلی

۳۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں

۴۔ مکتوبات شبلی

۵۔ آثار شبلی

۶۔ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط

۷۔ شبلی شناسی کے سو سال

۸۔ شذرات شبلی

۹۔ اقبال اور دبستان شبلی

۱۰۔ شبلی اور جہان شبلی

۱۱۔ مراسلات شبلی

۱۲۔ نوادرات شبلی

۱۳۔ شبلی خود نوشتوں میں

تحقیق و تنقید

۱۴۔ اسہل التجوید

۱۵۔ تذکرۃ القراء

۱۶۔ علم الترتیل

۱۷۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ

۱۸۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات

۱۹۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ

۲۰۔ عظمت کے نشاں

۲۱۔ ساحلوں کے شہر میں

۲۲۔ شاہ معین الدین احمد ندوی

۲۳۔ مطالعات و مشاہدات

۲۴۔ کتابیں حصہ اول۔ حصہ دوم

۲۵۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی

۲۶۔ عکس واثر

۲۷۔ کتابیات مجیب

۲۸۔ قرائے عظام اور ان کی علمی و دینی خدمات

۲۹۔ محبت نامے

ترجمہ

۳۰۔ رحمت عالم (اردو سے ہندی)

تحقیق و تدوین

۳۱۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

۳۲۔ موازنہ انیس و دبیر

۳۳۔ کاروان رفتگاں

۳۴۔ تاریخ اعظم گڑھ

۳۵۔ اسفار مجیب

۳۶۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات

SHIBLI KHUDNAWISHTON MEIN

BY: DR. MOHAMMAD ILYAS AZMI
email : azami408@gmail.com
Mob.: 9838573645

محمد الیاس الاعظمی اور علامہ شبلی

حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی۔ ان کا زمانہ تصنیف و تالیف و تدریس بھی نسبۃً بہت مختصر تھا۔ لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ صرف تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعے کی وسعت، تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو مل سکتا ہے، لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا، ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔

شبلی پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن سوانح کے نقطۂ نظر سے اور علمی مباحث کے نقطۂ نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گذار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب شبلی اور الیاس الاعظمی لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ الیاس الاعظمی نے اب تک شبلی پر بارہ کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں، اور ہر ایک میں شبلی کی علمی یا سوانحی زندگی کو کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ ان میں 'شبلی شناسی کے سو سال'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'نوادرات شبلی' اور 'متعلقات شبلی' کو خاص دلچسپی سے دیکھا گیا ہے۔

اب الیاس الاعظمی نے ایک بالکل نیا موضوع دریافت کیا ہے: شبلی کا ذکر خودنوشتوں میں۔ یہ موضوع کچھ ایسا غیر متعین سا ہے کہ اس کا نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انجام۔ پھر بھی، الیاس الاعظمی نے کم و بیش چوبیس ایسی خودنوشتیں تلاش کی ہیں جن میں شبلی کا ذکر کسی اہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ تعداد کم نہیں، بلکہ بڑی حد تک استعجاب انگیز ہے۔ اتنے بہت سے اہم لوگوں نے شبلی کا ذکر اپنی خودنوشت میں کیا، یہ امر بجائے خود شبلی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔

محمد الیاس الاعظمی نے حسب معمول دقت نظر سے کام لیا ہے اور شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مزید ترقی دے۔ شبلی کو الیاس الاعظمی جیسا جاں نثار زیب بھی دیتا ہے۔ اللھم زد فزد۔

شمس الرحمن فاروقی

ISBN 819388210-8
9788193882108

₹ 400/-